قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2024 قیمت ₹25

ماہنامہ

# اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

# ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

## قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
# بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی
میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

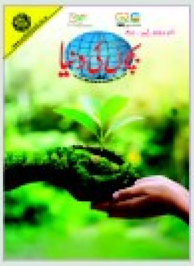

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے    سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 :A/C، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
# اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:26،شمارہ:12،دسمبر2024

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی،شاداب شمیم

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
سالاسار امیجنگ سسٹمس
A-97، سیکٹر 58، نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

# مشمولات

**اداریہ**
- ہماری بات 4

**خطوط**
- ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5

**ادبی مباحث**
- فارسی تذکروں کے تنقیدی اثرات اردو تذکروں پر — عمران احمد 7
- دیوان اکبر قدیم (نسخۂ بنارس) کا تعارف — محمد عامر 11
- وہاب اشرفی کے افسانے — فہیم اشرف 14

- جیون داس کی مثنوی پر ایک نظر — محمد فرحت حسین 18
- اودھ کے ایک مشہور فارسی شاعر شاہ تراب علی قلندر — سید انوار صفی 20

**شخصیات**
- اردو کے تین جگر — مختار ٹونکی 24
- کثیر الجہات شخصیت: قیوم خضر — سید احمد قادری 27
- انجم مانپوری: ایک منفرد طنز نگار — شبیر عالم 31
- دہلی کی تہذیبی روایت کا امین: بشیر الدین احمد دہلوی — نصرت پروین 34
- ہندوستانی تہذیب کا عکاس نظیر اکبرآبادی — حنا کوثر 38

**تراجم**
- کیا ناول نگار کشادہ ذہن ہوتا ہے — ہاروکی موراکامی، ترجمہ: نایاب حسن 41

**زبان و تعلیم**
- فاصلاتی تعلیم آج کی ضرورت — محمد فیروز عالم 45

**نگر نگر اردو**
- وور بھ کا لسانی، علمی، ادبی و تہذیبی منظر نامہ — شکیل احمد خان 48

**حیاتیات**
- بہتا ہوا پانی — ارتقا میں ایک بڑا محرک — ایم آر ساہنی، مترجم: احسان اللہ خاں 52

**یاد رفتگاں**
- سادگی میں گہرائی: فہمی بدایونی کی شاعری — شہپر شریف 55
- جمال گیاوی: شخص و شاعر — آفتاب عالم 58

**تہذیب و تمدن**
- ہمارا تمدن — نارائنی گپتا، مترجمہ: ایس کے سنگھ 61

**خصوصی گفتگو**
- نئی نسل اپنی تخلیق کو تخلیقیت کے دم پر زندہ رکھنا چاہتی ہے: ڈاکٹر معصوم شرقی — ظہیر فیصل 63

**خواتین**
- بھیل عورتیں — شیام سنگھ ششی، مترجم: محبوب الرحمٰن فاروقی 66

**صحت**
- آنکھ — قیصر سرمست 68

**کتابوں کی دنیا**
تعارف و تبصرہ — ادارہ 70

**خبرنامہ**
- اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 80

# ہماری بات

ہر زبان کو مزید اسپیس کی ضرورت ہوتی ہے چاہے وہ کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو۔ اردو بھی ایک بڑی زبان ہے جس کا دائرہ کئی ملکوں تک پھیلا ہوا ہے۔ کئی ایشیائی اور دیگر ممالک ہیں جہاں اردو کو ترسیل کا بہتر ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ دورِ حاضر میں زبان کو بھی کچھ اور وسعت اور Space چاہیے۔ ویسے اردو کی کچھ نئی بستیاں آباد ہو ہو چکی ہیں اور کچھ ہو بھی رہی ہیں، جہاں اردو سے جذباتی لگاؤ رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ ہر جگہ اس زبان کی داخلی قوت نے اسے زندہ رکھا ہے کہ یہ نہ صرف ایک سخت جاں زبان ہے بلکہ اردو کا دوسرا نام خوشبو اور روشنی بھی ہے۔ کسی نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ تنگ و تاریک کمرے میں بھی اردو کے دو لفظ گونجتے ہیں تو ہر طرف روشنی سی ہونے لگتی ہے۔ مگر عصر حاضر میں اس زبان کے ساتھ کچھ چیلنجز بھی ہیں جن کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں مربوط لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا، مستقبل کے لیے ایک روڈ میپ تیار کرنا پڑے گا۔ کثیر لسانی دور میں مختلف زبانوں سے فکری اور لسانی سطح پر مضبوط رابطہ قائم کرنا ہوگا۔ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے علوم و فنون سے رشتہ جوڑ کر اسے اپنی زبان کا بھی حصہ بنانا اور معاصر دنیا کو یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اردو صرف شاعری نہیں بلکہ سائنس اور تکنالوجی کی بھی زبان ہے اور بہت سارا سائنسی اور سماجی مواد اردو میں بھی ہے۔

یہ ڈیجیٹل ایج ہے، سائنسی و تکنیکی ترقیات کا عہد ہے۔ اس عہد کی ترجیحات تیزی سے بدل رہی ہیں، بزم جہاں کا انداز بدل رہا ہے، اس لیے ہمیں بھی اپنا انداز فکر اور طرز احساس بدلنا ہوگا۔ زبان و ادب کو بہت سے کلیشوں سے آزاد کرنا ہوگا کہ جو زبانیں کلیشوں میں قید ہو کر رہ جاتی ہیں ان زبانوں کے ادب کو ترقی کی منزلیں نصیب نہیں ہوتیں۔ وہ صرف تفریح و تفنن کا ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے، تبدیلی کا وسیلہ نہیں بن پاتا۔ معاصر عہد کے موضوعات و مسائل جب تک اس کا حصہ نہیں بنتے، وہ غیر افادی کہلاتا ہے۔

معاصر ادبی منظرنامے پر غور و فکر کرنے کے بعد میرے ذہن میں سوالات کے کچھ نئے سلسلوں نے جنم لیا ہے۔ کیا ہمارا ادب ایک ہی سوئی کی نوک پر ٹھہرا ہوا ہے؟ کیا چند ہی نکات و نظریات میں ہمارا ادب محصور ہے؟ کیا ہمارا ادب حال اور مستقبل سے ہمیں جوڑنے میں ناکام ہے؟ یہ ہمارے معاشرے کے لیے چراغ راہ، مینارِ نور، شِکھا دیپ بننے کے بجائے بجھتا ہوا چراغ تو نہیں۔ کیا یہ امکانات کی نئی دنیا تلاش کرنے میں ناکام ہے۔ کیا اس ادب میں تازہ لہر اور تحرک کی کمی ہے ؟ کیا یہ معاشرتی فریضہ ادا کرنے میں کامیاب ہے؟ کیا ملک و معاشرے کی تعمیر میں اس کا کوئی اہم کنٹری بیوشن نہیں ہے؟ سماجی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی سطح پر جن تغیرات کی ضرورت ہے؟ اس میں ہمارے ادب کا کیا رول ہے؟ بہت سے سوالات ہیں جن کے جوابات اب ہمیں تلاش کرنے ہوں گے۔ ہمیں اپنے ادب کو ملک اور معاشرے سے بھی جوڑ کر دیکھنا ہوگا۔ ملک کی تعمیر و تشکیل میں ماضی کی طرح حال اور مستقبل میں بھی مثبت اور متحرک کردار ادا کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ بھی سوچنا ہوگا کہ عزت مآب وزیر اعظم کے وکست بھارت 2047@ میں کس طرح کا کنٹری بیوشن اور ایک عظیم عالمی طاقت اور وشو گرو بنانے پر کس طرح کردار ادا کرنا ہے۔

ہمیں اپنے ملک اور مٹی کا قرض اپنے قلم سے اتارنا ہوگا کہ اس زبان کے خمیر میں محبت بھی ہے، ایثار بھی، قربانی بھی اس لیے ہمیں اپنے ملک کا پرچم ہر محاذ پر بلند کرنا ہوگا۔ اسی اردو زبان کے ایک شاعر لال چند فلک نے کہا تھا

دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی الفت     میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی

ہمیں اپنی مٹی کی خوشبو بہت عزیز ہے۔ ہماری اردو زبان نے ہمیشہ ملک اور معاشرے کو محبت اور اخوت، اتحاد و یک جہتی کا ہی پیغام دیا ہے۔

شمس اقبال

# ربط و التفات

**ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔**

**قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)**

اردو دنیا نومبر 2024 کا شمارہ موصول ہوا۔ اس شمارے کا جاذب نظر سرورق دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ اردو دنیا میگزین روز بہ روز ترقی کی طرف گامزن ہے۔ آج کی زندگی کے نئے موضوعات و مسائل اس میگزین میں شائع ہو رہے ہیں۔ اداریے میں جس قدر تازگی اور موجودہ زندگی کے مسائل پر گفتگو ہوتی ہے، رسالہ اسی قدر تازہ کار معلوم ہوتا ہے۔ لکھنے والے قلم کار بھی ان تازہ موضوعات و مسائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اردو دنیا کا یہ قدم بھی بہت خوش آئند ہے کہ اس میں اردو دنیا کے مختلف پروگراموں کی خبریں ہوتی ہیں۔ یعنی اردو دنیا میں کہیں اگر ورکشاپ ہو رہی ہے یا کوئی سمینار ہو رہا ہے یا کوئی مباحثہ/مذاکرہ اور خطبہ ہو رہا ہے تو اس میگزین میں اس کی خبر شائع ہوتی ہے۔ اس شمارے میں جناب خواجہ اکرام الدین صاحب نے پنک لٹریچر کے عنوان سے ایک بے حد قیمتی مضمون لکھا ہے۔ سائبر پنک لٹریچر آج کی زندگی کا ایک حوالہ بن گیا ہے۔ جناب خواجہ اکرام الدین صاحب نے بہت خوبی کے ساتھ اس کے دائرہ کار کو گرفت میں لیا ہے۔ ریاض توحیدی نے تخلیقی تنقید اور سریندر پرکاش کی سحر انگیز افسانہ نگاری کے نام سے بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے سریندر پرکاش کی کہانیوں کے متنوع موضوعات و مسائل پر بہت مفصل بات کی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ سریندر پرکاش کی کہانیاں پڑھ کر قاری کو معاشرے کی سماجی، انسانی، سیاسی اور نفسیاتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے جس طرح سریندر پرکاش کی افسانہ نگاری کے فن اور موضوع پر روشنی ڈالی ہے وہ بہت اہم اور قابل توجہ ہے۔ نظام الحسن نے رامپور میں تذکرہ نگاری کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ اس سیاق میں انھوں نے رامپور میں لکھے گئے مختلف تذکروں پر بات کی ہے۔ ڈاکٹر آفاق ندیم نے قومی درسیات کا خاکہ برائے اسکولی تعلیم 2023 کے رہنما خطوط کے نام سے ایک بہت ہی اہم اور جامع مضمون تحریر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ زبان کی تعلیم کا مقصد کیا ہے اور کس طرح بچوں کو اس جانب راغب کیا جا سکتا ہے۔ اس سیاق میں انھوں نے مرحلہ وار خطوط قائم کیے ہیں۔ ان کا یہ مضمون قومی درسیات کے خاکے سے متعلق بہت بنیادی بھی ہے اور کارآمد بھی۔ شخصیات کے زمرے میں اشتیاق سعید صاحب کا مضمون ظفر گورکھپوری کی شخصیت اور شاعری میں مٹی کی مہک قابل توجہ ہے۔ انھوں نے بہت خوبصورتی اور سلیقے کے ساتھ ظفر گورکھپوری کے ادب کا جائزہ لیا ہے اور ان کے ادبی و سوانحی نئے، انوکھے پہلوؤں کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ خاص طور سے انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ظفر گورکھپوری کی تخلیقات کے ساتھ ان کے وجود سے بھی ہندوستانی کلچر اور مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ عزیز احمد خان نے خواجہ حسن ثانی نظامی کا اسلوب کے عنوان سے بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک کا مضمون رسا جاودانی پر ہے۔

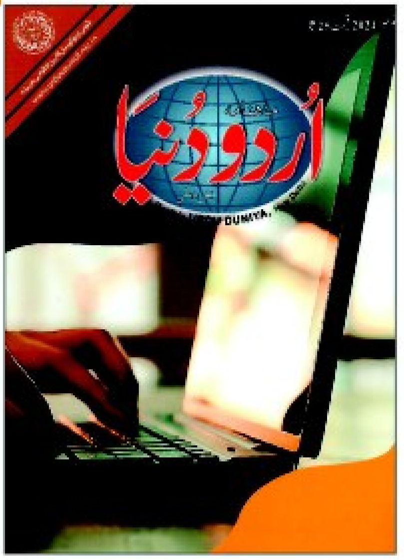

اس مضمون میں انھوں نے رسا جاودانی کے شعری مجموعوں کے حوالے سے ان کے موضوعات و فن پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ شریف الحسن نقوی کا مضمون انسان بحیثیت سماجی حیوان بہت نیا اور خوبصورت مضمون ہے۔ انھوں نے انسان کی سماجی زندگی اور اس کی ابتدا اور ارتقا کو موضوع بنایا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ سماج میں انسان کی آج کیا حیثیت ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر محمد سہیل نے اردو صحافت پر جدید ٹیکنالوجی کے اثرات کے نام سے قابل قدر مضمون لکھا ہے۔ ان کے مضمون کی زبان بہت اچھی ہے اور نئے زاویے سے انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ الغرض مجھے اردو دنیا کے نومبر کا شمارہ بے حد پسند آیا اور اس کے لیے میں این سی پی یو ایل ڈائرکٹر اور تمام اراکین کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی یہ میگزین اسی طرح کے معیاری اور قابل قدر مضامین کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے گی۔

**جاوید رئیس**، دہرادون، اتراکھنڈ

’اردو دُنیا‘ اکتوبر 2024 کا شمارہ اس وقت پیشِ نظر ہے۔ لاجواب، بے مثال۔ یوں تو پورا رسالہ قابلِ مطالعہ ہے۔ بطورِ خاص نو روزہ ’چنار کتاب میلہ‘ کی سات صفحوں پر مشتمل روداد دلکش ہے۔ تحریریں بول رہی ہیں، تصویریں مسکرا رہی ہیں۔ پڑھتے وقت قاری خود کو میلے میں محسوس کرتا ہے۔ ہمارے یہاں بھیونڈی میں ’قومی اردو کونسل کی جانب سے 2016 میں ’کتاب میلہ‘ منعقد ہوا تھا۔ چنار کتاب میلہ نے اس کی یاد تازہ کردی۔ کتاب میلہ کیا ہے؟

یہ ہے حقیقت میں جشنِ اردو/ جہاں جہاں بھی ہوا ہے اب تک
یہ جشن برپا/ وہاں کا موسم ہرا بھرا ہے
وہاں ہواؤں میں تازگی ہے/ وہاں کی مٹی مہک رہی ہے
یہ نیارا اردو کتاب میلہ/ نئی سحر ہے، نئی ڈگر ہے
جو اس میں شامل ہیں، /وہ غنی ہیں،
جو اس میں آئے ہیں محترم ہیں...

یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی (بقول مدیر) کہ ’اس میلے میں بڑی تعداد میں زبان و ادب سے محبت کرنے والوں نے شرکت کی خاص طور پر وہاں کے بچوں اور نوجوانوں کا جوش لائقِ دید تھا‘۔ یہ بڑی اچھی علامت ہے جس کے لیے میلے کے بانیان مبارکباد کے مستحق ہیں۔‘

’زبان اور زمینی صورتِ حال‘ کے تحت شمیم طارق صاحب کے انقلابی خیالات پڑھ کر خوشی کے ساتھ ساتھ عبرت بھی حاصل ہوئی۔ اس سوال پر کہ زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟۔ اس کے جواب میں جنابِ شمیم کا ارشاد دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ ’’اردو کے مستقبل کا انحصار اردو بولنے والوں کے مستقبل اور غیرت پر ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بے حسی اور بے غیرتی یا تمام الزامات دوسروں کے سر منڈھ کر خود کو بے قصور ثابت کرنے کی روش نے بھی اردو کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔‘‘

دیگر مشمولات میں ’عبدالرحیم خانِ خاناں کی تعمیری اور ادبی خدمات‘ پر عارف انصاری کی تحریر متاثر کرتی ہے۔ خانِ خاناں کے بیان میں ’دارالسرور برہانپور‘ کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ برہان پور کی تاریخی اہمیت اور تہذیبی قدر و قیمت کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ عارف انصاری کی اس بات میں صداقت ہے کہ ’خانخاناں نے خاندیش کے دارالسلطنت برہانپور میں اپنی سکونت کے دور میں نہ صرف متعدد علاقوں کو فتح کیا اور عمارات بنوائیں بلکہ غریبوں کے آنسو پوچھنے کے ساتھ ادبی دنیا کو محبتوں بھری ایسی تخلیقات سے نوازا، جس کی ادبی دنیا میں دوسری مثال نہیں ملتی۔‘

معاشیات کے تحت مقبول احمد مقبول کا مضمون ’قدیم بھارت کا عظیم سیاست داں اور ماہرِ معاشیات، کوٹلیہ‘ بھی پڑھنے لائق ہے۔ مضمون پڑھ کر دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ خیال ہوا کہ جن سیاست دانوں کے خمیر میں کوٹلیہ پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، انھیں کوٹلیہ جی‘ کے انجام سے بھی سبق حاصل کرنا چاہیے۔ والسلام، خیر اندیش

**محمد رفیع انصاری**: المدنی 734، بھوسار محلّہ، بھیونڈی، ضلع تھانے، مہاراشٹر

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ اکتوبر کے اداریے میں ڈاکٹر شمس اقبال صاحب بڑی دانشورانہ بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کتابیں ذہنی اور فکری و اخلاقی تربیت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کتابوں کے مطالعے سے جن کا تعلق رہتا ہے ان کی زندگی ہزاروں تجربات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ایسے افراد مختلف تہذیبوں/ ثقافتوں اور جہانوں کی سیر کرتے ہیں اور اپنے مشاہدات، محسوسات کی بنیاد پر اپنی اور متعلقین کی زندگیوں کو خوب سے خوب بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے علم، ہنر اور تربیت ضروری ہے اور ان تین چیزوں کے حصول میں کتابیں اہم کردار نبھاتی ہیں۔ قومی اردو کونسل علوم و فنون ادبیات و لسانیات، تاریخ، سائنس و ٹیکنالوجی و دیگر اہم عنوانات پر تجارتی مفادات سے اوپر اٹھ کر عمدہ اور معیاری کتابوں کی اشاعت کرتی ہے۔ کتاب کلچر کو فروغ دینے کی غرض لے کر ملک کے بڑے بڑے شہروں کے مرکزی مقامات پر سال میں کم از کم ایک بار اردو کتاب میلے کا انعقاد کرتی آ رہی ہے۔ ان کتب میلوں میں دوسرے مشہور پبلشرز اور کتب فروش بھی حصہ لیتے ہیں۔ لگا تار 10-9 دس دن چلنے والے ان میلوں میں ثقافتی پروگراموں کے ساتھ علمی و ادبی مباحثوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ سالِ رواں میں جنوری ممبئی میں اور اگست سری نگر میں یہ کتب میلے منعقد ہوئے جس میں بڑی تعداد میں محبانِ اردو زبان و ادب نے حصہ لیا۔

**ٹی جے افضل بیگ**: بنگلورو، کرناٹک

ماہنامہ اکتوبر 2024 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ماہنامہ ’اردو دنیا‘ کے مشمولات لائق مطالعہ اور باعث اضافہ فی العلم ہوتے ہیں۔ مختلف شعبۂ حیات کے متنوع مضامین کے مطالعے سے طبیعت سیر و شاد ہو جاتی ہے۔ آپ کے حسنِ ادارت کو دیکھ کر دل سے بے ساختہ مبارکبادی کے الفاظ نکلتے ہیں۔ کتابوں سے رشتہ رکھنے کی اہمیت و افادیت پر آپ نے انتہائی جامع اور بہترین اداریہ تحریر کیا ہے۔ یقیناً ایسے اداریوں سے اردو کے موجودہ منظر نامے میں تبدیلی کے امکانات روشن ہوں گے۔ نویں صدی کے عربی ادیب ابن قتیبہ پر محمد شہباز عالم کا مضمون دیکھ کر خوشی ہوئی۔ قتیبہ کے تصور ادب کے حوالے سے ایک جیسی باتیں اور ایک جیسے الفاظ کی تکرار قاری کے ذہن پر گراں گزرتی ہے۔ ’کوٹلیہ‘ (چانکیہ) کی سیرت و شخصیت پر مقبول احمد مقبول کا مضمون بہت عمدہ اور معلوماتی ہے۔ قومی کونسل نے اتنی اہم کتاب کو اردو میں شائع کیا ہے اس کے لیے وہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ علی زاہد ملک کا ’اردو زبان و ادب پر فارسی کے اثرات‘ بھی بہت شاندار مضمون ہے جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ عرفان امین کا ’سماجی شعور‘ بھی بہت عمدہ مضمون ہے تعارف کرانے اور اہمیت بتانے میں کامیاب رہے ہیں۔ سہیل ارشد کے مضمون ’چریہ پد بدھ سادھوؤں کی شعری روایت‘ میں بھسکو پاد اور شبر پاد کے چریہ پدوں کا اردو ترجمہ نظر سے گزرا دونوں بہت خوب ہیں بالکل الگ ذائقے کی شاعری ہے۔ مضمون نگاری پر سیدہ جعفر کا مضمون ’مضمون اور اس کا فن‘ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے ہر نثار کو یہ مضمون ضرور پڑھنا چاہیے۔ ورجینیا وولف کی اس بات سے ہر شخص اتفاق کرے گا" (اسے) (مضمون) میں جو اصول کارفرما دکھائی دیتا ہے یہ ہے کہ وہ مسرت میں اضافہ کرے (اسے) کو اسی مقصد کی تکمیل کرنی چاہیے۔ (اسے) اپنے پہلے لفظ سے ہی ہم پر ایسا جادو کرے جو اس کے آخری لفظ پر ہی ٹوٹے۔‘‘

**امتیاز دانش ندوی**، جھریا، جھارکھنڈ

# فارسی تذکروں کے تنقیدی اثرات اردو تذکروں پر

عمران احمد

**تذکرہ** عام طور پر ایسی کتاب کو کہتے ہیں جس میں شاعروں کے احوال و آثار کو تفصیلی یا مختصر طور پر بیان کیا گیا ہو شاعروں کی سوانح اور کلام کے علاوہ تذکرے کا اطلاق ایسی کتابوں پر بھی کیا جاتا رہا ہے جن میں مشہور و معروف صوفیا، عرفا، اولیا، اطبا، علما اور فضلا وغیرہ کی زندگی کے احوال اور ان کے کارناموں و کرامات وغیرہ کو تحریر کیا گیا ہو، پوری دنیا میں فارسی زبان کے دستیاب شدہ تذکروں میں سدید الدین محمد عوفی کے 'لباب الالباب' کو فارسی کا پہلا تذکرہ ہونے کا افتخار حاصل ہے۔ بارہ ابواب پر مشتمل یہ تذکرہ 617 اور 618 عیسوی کے درمیان پایہ تکمیل کو پہنچا۔ 'لباب الالباب' کی تالیف کے تقریباً پونے تین سو سال تک کی فارسی زبان کی تاریخ میں کسی ایسے تذکرے کا پتہ نہیں ہے جو فارسی شاعروں کے کلام کے متعلق تحریر کیا گیا ہے، ساتویں صدی ہجری کے بعد دسویں صدی ہجری سے فارسی میں تذکرہ نویسی کا رجحان عام ہونا شروع ہوا اور عصر حاضر تک اس کا سلسلہ جاری و ساری ہے ایران اور ہندوستان میں فارسی شاعروں کے تذکرے بڑی تعداد میں تحریر کیے گئے اور آج بھی تذکرے مرتب کیے جا رہے ہیں لیکن ان تمام تذکروں میں زیادہ تر تذکرے 'لباب الالباب' کو پیش نظر رکھ کر ہی ترتیب دیے گئے اور آج بھی تھوڑے بہت تغیر و تبدیلی کے ساتھ بیشتر تذکرے اسی طرز پر لکھے جا رہے ہیں جو طرز ساتویں صدی عیسوی میں فن تذکرہ نویسی کے موجد و بانی سدید الدین محمد عوفی نے اختیار کیا تھا۔

ہندوستان میں فارسی زبان کی دیگر شعری و نثری اصناف کی طرح تذکرہ نویسی کی صنف کو بھی خوب عروج و بلندی حاصل ہوئی بلکہ فن تذکرہ نویسی پر باقاعدہ کام ہندوستان کے فارسی داں مصنفین ہی کے قلم سے انجام پایا ہے، ابتدا سے لے کر اب تک ہندوستان میں فارسی شاعروں سے متعلق سیکڑوں تذکرے تالیف کیے جا چکے ہیں جو فارسی ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں اور جن سے استفادہ اہل ہند ہی نہیں، خود اہل زبان بھی کرتے رہے ہیں۔

تذکروں کی اہمیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تذکرے تاریخ کو جاننے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اگر یہ تذکرے تالیف نہ کیے گئے ہوتے تو آج ہم بہت سے ایسے شاعروں کے احوال و افکار سے محروم ہو جاتے جن کے متعلق تاریخ کی کتابوں یا دوسری کتابوں میں کوئی ذکر نہیں ملتا مثلاً اگر محمد عوفی نے 'لباب الالباب' تالیف نہ ہوتی تو چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے بے شمار شاعروں کے احوال و آثار کے متعلق ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہوتیں کیونکہ اس دور کے زیادہ تر شعرا کا کلام حوادث زمانہ کی نذر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان تذکروں کی اہمیت و افادیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ الگ الگ ادوار میں تالیف کیے گئے ان تذکروں میں بعض تذکرہ نویسوں نے معاصر شاعروں کے بارے میں ایسی بیش قیمت اور نافع معلومات فراہم کی ہیں جو دوسری کتابوں میں نظر نہیں آتیں اور اگر ہیں بھی تو بہت ہی مختصر اور نامکمل ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ تذکرے ان شاعروں کے احوال و آثار، افکار و خیالات، سیرت و شخصیت اور اخلاق و کردار وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا بہترین اور مستند ماخذ تصور کیے جاتے ہیں، اس کے علاوہ تذکرہ لکھنے والے حضرات عام طور پر شاعر ہوا کرتے تھے اور انھوں نے دوسرے شاعروں کے کلام کے بارے میں جو اپنی انتقادی آرا پیش کی ہیں ان کی مدد سے خود ان کے اور دیگر شاعروں کے کلام کے متعلق درست مقام و مرتبہ تعین کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں خود اپنے حالات کو بھی تفصیلی انداز میں قلم بند کر دیا ہے جو دیگر کتب میں موجود نہیں ہیں اور کبھی کبھی ان تذکرہ نویسوں نے دوسرے شاعروں کے ضمن میں اپنی زندگی اور شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف بھی اشارے کر دیے ہیں جن کی مدد سے ان کے اخلاق و کردار اور حیات و کلام کے متعلق قیمتی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں، جو دیگر ذرائع سے دستیاب نہیں ہوتیں یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں ان کی اہمیت کا اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔

تذکروں کی اہمیت و افادیت کا ایک اور اہم سبب

یہ بھی ہے کہ بعض ہوش مند اور ذی فہم تذکرہ نویسوں نے شاعروں کے احوال وآثار کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حالات اور اہم ادبی وتاریخی واقعات کو بھی قلم بند کردیا ہے جس کے سبب یہ تذکرے تاریخی نقطہ نظر سے بھی قابل مطالعہ قرار پاتے ہیں مثلاً 'خزانۂ عامرہ' اور 'ریاض الشعراء' وغیرہ میں اپنے عہد کے بعض قابل ذکر اور اہم سیاسی حالات اور تاریخی واقعات کو بھی احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے، جن کی مدد سے اس عہد کے آداب ورسوم روایات ورواج اور تہذیب وتمدن سے کماحقہ واقفیت حاصل ہوتی ہے اور اس دور کے سماج ومعاشرے کی بہت سی نامعلوم اور غیر مفہوم جہات واضح اور روشن ہوکر اذہان وقلوب کو جلا بخشتی ہیں، اس کے علاوہ ان ادبی تذکروں کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ وقت اور امراوشرفا وغیرہ کے یہاں کس شاعر کے کلام کو کس حد تک اہمیت ووقعت حاصل تھی اور ان سلاطین وقت کا شعری ذوق اور انتقادی ادراک کس درجے کا ہوتا تھا اور شاعروں کو شاہی درباروں میں کون کون سی شاہی مراعات حاصل ہوتی تھیں، ان کے متعلق بھی دلچسپ اور سودمند جانکاری انھیں تذکروں کے وسیلے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ جانکاری عموماً دیگر کتابوں میں نظر نہیں آتی، یہی سبب ہے کہ صنف تذکرہ کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔

جب اردو زبان وادب میں تذکرہ نویسی کی شروعات ہوئی تو تذکرہ نگاروں کے سامنے فارسی زبان کے تذکروں کا بیش بہا خزانہ موجود تھا اور ان کو جب بھی اظہار بیان میں کوئی ضرورت پڑی تو فارسی کی بروقت امداد نے ان کے زبان وبیان کو سہارا دے کران کو تقویت عطا کی اور یہی وجہ تھی کہ ابتدائی دور کے اردو تذکرہ نویسوں نے فارسی زبان سے استفادہ کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا، جب ہندوستان میں اردو زبان رائج ہونے لگی تو فارسی تذکروں کی طرح اردو زبان میں بھی تذکرے لکھے جانے کی طرف توجہ دی جانے لگی اور اردو شاعروں کے متعدد تذکرے مرتب ہوکر منظر عام پر آئے، جن کی قدر وقیمت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ فارسی تذکروں کے ذریعے ہی اردو ناقدین ادب کو جلا حاصل ہوئی ہے، کیونکہ ابتدائی عہد میں جتنے بھی اردو زبان کے تذکرے لکھے گئے، وہ فارسی تذکروں کی تقلید میں لکھے گئے چونکہ فارسی زبان اپنے لفظی ذخیروں، اشتقاقی اور ترکیبی خصوصیات کے سبب دنیا کی ثروت مند زبانوں میں شمار کی جاتی رہی ہے لہٰذا جب بھی اردو زبان کے ادیبوں کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں کسی دقت کا سامنا ہوا تو وہ فارسی زبان وادب کے سرچشمے سے سیرابی حاصل کرتے رہے اور اس طرح فارسی زبان نے اردو زبان کی صورت گری میں کلیدی کردار ادا کیا اور تذکرہ نویسی کے معاملے میں تو اس کا کردار بڑا

**ہندوستان میں فارسی زبان کی دیگر شعری ونثری اصناف کی طرح تذکرہ نویسی کی صنف کو بھی خوب عروج وبلندی حاصل ہوئی بلکہ فن تذکرہ نویسی پر باقاعدہ کام ہندوستان کے فارسی داں مصنفین ہی کے قلم سے انجام پایا ہے، ابتدا سے لے کراب تک ہندوستان میں فارسی شاعروں سے متعلق سیکڑوں تذکرے تالیف کیے جا چکے ہیں جو فارسی ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں اور جن سے استفادہ اہل ہند ہی نہیں، خود اہل زبان بھی کرتے رہے ہیں۔**

ہی اساسی اور اہم رہا ہے۔

فارسی تذکرے کے زیر اثر تالیف کیے جانے والے اردو تذکروں کو صدفی صد تنقید کے زمرے میں تو نہیں رکھا جاسکتا لیکن یہ تذکرے اور ان میں موجود تنقیدی نکات ورجحانات ہمارے ادب کا وہ گرانقدر، بیش بہا اور ذی قیمت سرمایہ ہیں، جن کی اہمیت کو ہر دور اور ہر طبقے کے ذریعے تسلیم کیا جاتا رہا ہے اور اردو ادب میں باقاعدہ فن نقد کی ابتدا انھیں تذکروں سے ہوتی ہے، نورالحسن نقوی کے مطابق:

''شعرائے اردو کے تذکرے ہمارا قدیم اور بیش قیمت ادبی سرمایہ مکمل اور ہماری زبان میں تنقید کی بنیاد انھی کے ذریعے پڑی، اِن تذکروں میں تنقید کے جو نمونے ملتے ہیں انھیں باقاعدہ تنقید کہنا تو مشکل ہے، البتہ انھیں اُردو تنقید کا پہلا نقش ضرور کہا جاسکتا ہے۔''[1]

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ اردو زبان وادب میں تذکروں ہی کے ذریعے تحریری ادبی نقد کی باقاعدہ شروعات ہوئی حالانکہ ان تذکروں میں تنقید کے جو نمونے ملتے ہیں وہ بڑے مبہم، غیر واضح اور مختصر ہیں جن کی بنا پر انھیں فن نقد کے اعلیٰ نمونے قرار نہیں دیے جا سکتے بایں ہمہ فارسی کے زیر اثر تالیف کیے جانے والے ان تذکروں کے ذریعے ہی اردو ادبی تنقید کی بنیادیں استوار ہوئی ہیں جن پر آگے چل فن نقد کی بلند وبالا عمارت کی تعمیر ممکن ہوسکی۔

یہاں اس طرف اشارہ کر دوں کہ بیشتر فارسی تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں کی بنیاد معاصرانہ چشمک، شخصی پسند وناپسند اور گروہ بندی پر رکھی تھی۔ ان کے یہاں ادبی ایمانداری اور علمی دیانتداری کو بروئے کارلانے کی شعوری کوشش نہیں کی گئی ہے، حالانکہ دیانت، صداقت اور غیر جانبداری فن تنقید کے بنیادی اور لازمی جز ہیں جن کے بغیر کسی بھی زبان کی ادبی تنقید کو اعتبار اور احترام حاصل نہیں ہوسکتا، فارسی تذکروں میں ان لازمی اجزا کے نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ فارسی تذکرہ نویسوں کے پیش نظر ادبی نقد کے نہ تو مخصوص اصول وضوابط موجود تھے اور نہ ہی ان کا مقصد قوانین نقد کو مرتب کرنا تھا بلکہ انھوں نے کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا ہوگا کہ شاعروں کے کلام پر ان کی یہ سرسری فن نقد کی بنیاد ثابت ہوگی، اردو تذکرہ نگاری چونکہ فارسی کی تقلید میں شروع ہوئی تھی لہٰذا فارسی تذکرہ نویسوں کا یہ عام رجحان یا انداز، ان کے یہاں بھی بے چون وچرا اختیار کرلیا گیا حالانکہ انھوں نے اپنے تذکروں میں فارسی تذکرہ نویسوں کی طرح بہت زیادہ انتہا پسندی، شدت اور انتقام کے رویے سے اغماض برتنے کی شعوری کوشش تو کی لیکن شعرا کے کلام کے انتخاب میں وہ پوری طرح غیر جانبدار اور دیانت دار رہنے میں کامیاب نہیں ہو سکے، جس کی وجہ سے صحت مند تنقید کا وقار مجروح ہوا۔

عام طور پر اردو تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں میں جس انداز واسلوب کو استعمال کیا ہے وہ فارسی

تذکروں کا مرہون منت کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا، فارسی تذکرہ نویس عموماً زبان وبیان اور محاورہ وعروض کے پیش نظر شاعروں کے کلام پر اظہار خیال کرتے تھے اوراس اظہار خیال میں کوئی خاص گہرائی وگیرائی نہیں پائی جاتی تھی، پہلی نظر میں جو کچھ بھی انھیں محسوس ہوتا تھا یا ان کا وجدان وذوق ان کی جس طرف راہ نمائی کردیتا تھا وہ اسی کو سپرد قرطاس کردیتے تھے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس ابتدائی عہد کے ناقدین ادب بھی اس ادبی صنف کی ماہیت، مقصداور درست اسلوب سے کماحقہ واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اردو میں تذکرے لکھنے کی شروعات ہوئی تو اردو مصنفوں نے بھی فارسی کے زیر اثر اسی طرز اور روش کو اختیار کرلیا لہٰذا نکات الشعرا، مخزن نکات اور چمنستان شعرا اسی قسم کے تذکرے ہیں جن میں تنقیدی شعور کا احساس تو ملتا ہے لیکن ان میں بہت زیادہ گہرائی نہیں پائی جاتی، عام طور پر تذکرہ نویسوں نے بہت ہی سرسری سے انداز میں شاعروں کے کلام پر اظہار خیال کیا، جو کم وبیش فارسی تذکرہ نویسوں سے ہی مستعار ہے۔

اردو تذکروں میں بروئے کار لائے جانے والے تنقیدی رجحانات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان تذکرہ نویسوں کے پیش نظر بھی، شاعروں کے کلام کو جانچنے وپرکھنے کے سلسلے میں کوئی مخصوص قواعد نہیں تھے اور نہ ہی فن نقد کے اصول وضوابط کو متعین کرنے کی طرف کماحقہ توجہ صرف کی گئی تھی۔ ان کے طرز نقد کا تمام تر دارومدار ذوقی اور وجدانی تھا اوراس عہد میں ادبی تنقیدی شعوراور روایات نہ ہونے کے برابر تھیں، یہی وجہ ہے کہ بعض دانشوران ادب نے فن نقد کی تاریخ میں ان کو بہت منفعت بخش تصور نہیں کیا ہے کیونکہ ان کے یہاں ادبی شہ پاروں پر تنقید کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ اس فن کے اصول وضوابط سے یکسر مختلف ہے، مثلاً تنقید کا پہلا اصول غیر جانبداری اور دیانت داری ہے، جو ابتدائی دور میں لکھے جانے والے تذکروں میں شاذ ونادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے کیونکہ اس زمانے میں دوران تنقید شخصی پسند وناپسند کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی اس لیے ان میں وہی انداز پایا جاتا ہے جو اس دور میں رائج تھا، ابو الکلام قاسمی اپنی مشہور ومعروف کتاب 'مشرقی شعریات' میں لکھتے ہیں:

''تذکروں میں اکثر طرف داری سے کام لیا گیا

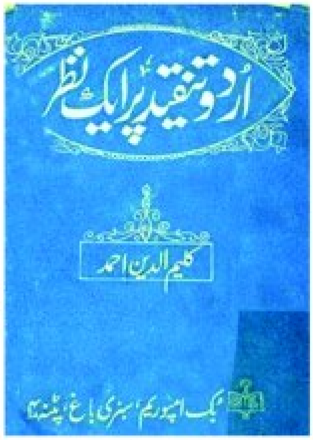


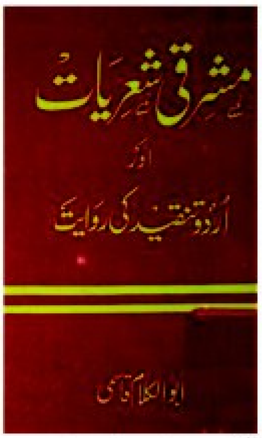


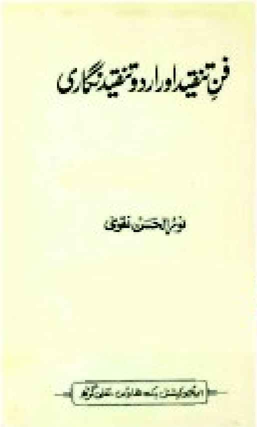


ہے...... شعر کے محاسن میں زیادہ تر صنائع لفظی ومعنوی کو اہمیت دی گئی ہے، اکثر شعرا کے اسلوب وسلیقہ شعر کے لیے مبہم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے شاعری کی حیثیت واضح نہیں ہوتی ہے۔''2

اگر فارسی زبان میں ترتیب دیے جانے والے تذکروں پر نظر ڈالیں تو ان میں مندرجہ ذیل خصوصیات نظر آتیں ہیں:

1 فارسی تذکروں میں عام طور پر شعرا کے حالات کو مختصر طور پر بیان کیا جاتا تھا جب کہ کلام کے انتخاب میں طوالت سے کام لیا جاتا تھا یعنی احوال کے مقابلے انتخاب کلام اکثر طویل ہوتا تھا۔

2 شاعروں کے حالات وغیرہ بیان کرنے میں ان کی تاریخ پیدائش ووفات اور زمان وعہد کو متعین کرنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی جاتی تھی۔

3 اکثر ان تذکروں میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ تذکرہ نویسوں کے ذریعے ایک شاعر کے کلام کو کسی دوسرے شاعر سے منسوب کردیا گیا اور پھر بعد میں تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کلام اس شاعر کا ہے ہی نہیں جس سے منسوب کردیا گیا ہے۔

4 عام طور پر تذکرہ نویس ایک دوسرے کی تقلید وپیروی پر ہی اکتفا کرلینا بہتر تصور کرتے تھے اور اپنی تحریروں میں جدت وندرت کی طرف بہت ہی کم متوجہ ہو پاتے تھے۔

5 فارسی تذکرہ نویس دوران تحریر اکثر وبیشتر بہت مشدد ہوجاتے تھے اور کسی بھی شاعر کے کلام کے محاسن ومعائب کا اظہار ذاتی تعلقات اور شخصی پسند وناپسند کے مطابق کرتے تھے بعض تذکرہ نویسوں نے تو اخلاقی اور تہذیبی نقطہ نظر سے شرمسار کردینے والا انداز بیان بھی اختیار کیا ہے، جس کے سبب صنف نقد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

6 فارسی تذکرہ نویسوں کی تمام تر توجہ کلام کے ظاہری حسن وخوبصورتی کو بیان کرنے پر صرف ہوتی تھی اور معانی جو شعر کی اصل روح تصور کیے جاتے ہیں ان کی طرف تذکرہ نگاروں کی توجہ بہت کم ہوتی تھی۔

7 شاعروں کے کلام کی خصوصیات اور محاسن ومعائب کو بیان کرنے کے لیے یہ تذکرہ نویس بڑا ہی مبہم اور غیر واضح پیرایہ بیان اختیار کرتے تھے جس سے حسن کلام واضح اور قابل فہم ہونے کے بجائے مشکل محسوس ہونے لگتا تھا، اکثر تو ان شاعروں کے کلام کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم کرپانا بھی مشکل ہوجاتا تھا۔

8 فارسی تذکروں میں اخلاقی اقدار کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور رشک ورقابت، چشمک وتنازعات اور شاعرانہ تعلی وعلاقائی تعصبات کے باوجود بھی یہ تذکرہ نویس شاعروں کی حرمت ومرتبے کا خاص خیال رکھتے تھے اور انھیں اچھے القاب وآداب سے یاد کرتے تھے۔

یہی وہ عام خصوصیات تھیں جو فارسی تذکروں میں پائی جاتی تھیں اور جب اردو زبان وادب میں تذکرہ نویسی کا باقاعدہ آغاز ہوا تو ان تذکرہ نویسوں نے فارسی تذکروں کی انھیں خصوصیات کو اپنے پیش نظر رکھنے کی شعوری کوشش کی، یہاں تک کہ تذکرہ نگاروں نے اردو شاعروں کے احوال وآثار کو قلم بند کرنے کے لیے اردو کے بجائے فارسی زبان ہی کا سہارا لیا اور ابتدا میں انھوں نے اردو شاعروں کے تذکرے فارسی زبان میں ہی تحریر کیے اردو تذکروں کے فارسی زبان میں تالیف کیے جانے کی کئی اہم وجوہات تھیں، بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ اردو زبان نے ابتدا ہی سے فارسی زبان وادب کے ہمہ گیر اور دیرپا اثرات کو قبول کیا تھا، اور اردو شاعری تو مکمل طور پر فارسی ہی کی خوشہ چیں معلوم ہوتی تھی

اوراس کا مزاج فارسی زبان کے مزاج سے گہری مطابقت رکھتا تھا اس کے علاوہ اس عہد کے پڑھے لکھے لوگ اب بھی فارسی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان کو قابل توجہ تصور نہیں کرتے تھے بھلے ہی اردوزبان کو روزمرہ کی گفتگو میں قبول عام حاصل ہوگیا تھا لیکن دانشوران ادب کے نزدیک یہ زبان ابھی بھی مقبول نہیں ہوسکی تھی اوروہ اس زبان میں اپنی ادبی تخلیقات کو پیش کرنا پسندیدہ یا بہتر تصور نہیں کرتے تھے۔ مزید برآں وہ الفاظ واصطلاحات جو فارسی زبان میں صدیوں سے بروئے کارلائی جارہی تھیں اوراسی زبان کی تقلید وپیروی کے سبب اردو میں زبان وادب میں بھی راہ پاگئیں تھیں لہٰذا ان کو یک لخت الگ کردینا بھی ممکن نہیں تھا، لہٰذا وہ بندھے ٹکے الفاظ واصطلاحات اوراصول وضوابط جو زمانہ طویل سے فارسی تذکروں میں بکثرت استعمال ہوتے چلے آرہے تھے۔ اردوزبان میں وہ ابھی بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ اردو ابھی ایک نوزائیدہ اورنوخیز زبان تھی اوراس کا ذخیرہ الفاظ بھی فارسی کے مقابلے میں بہت محدود ومختصر تھا اسی لیے شروعات میں اردوزبان کے جتنے بھی تذکرے لکھے گئے ان پر فارسی کا گہرا اثر تھا، ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق:

''اردوتذکرہ نویسی اپنی ابتدائی منزلوں میں فارسی تذکرہ نویسی سے ہی نقل ہے یہی وجہ ہے کہ جب اردو شاعروں کے تذکرے مرتب ہونا شروع ہوئے توان میں نہ صرف عام اصول تصنیف کے لحاظ سے فارسی تذکروں کی تقلید کی گئی بلکہ ان تذکروں کی زبان بھی فارسی رہی۔''3

کم وبیش یہی رائے زیادہ ترمحققین اورناقدین ادب نے پیش کی ہے کہ اردوتذکروں کا تمام سرمایہ فارسی زبان ہی کا مرہون منت ہے اگر اس شیریں زبان کے اعلیٰ نمونے اردوتذکرہ نگاروں کے پیش نظر نہیں رہے ہوتے تو یقیناً وہ اس میدان میں اتنی تیزی سے ترقی نہیں کر پاتے چونکہ یہ اردو مصنفین اور شعرا فارسی زبان ہی کے پروردہ تھے اورنہ صرف پروردہ بلکہ دلدادہ بھی تھے جس کے سبب اس زبان کواختیار کرنا ان کے لیے کسی اجنبیت یا عار کا سبب نہیں تھا اسی وجہ سے طویل عرصے تک یہ تذکرے فارسی زبان ہی میں تالیف کیے جاتے رہے، اس سلسلے میں سید محمد کریم اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کی چھٹی دہائیوں تک اردوشعرا کے تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے اور ہر پہلو سے فارسی شعراکے تذکروں کی پیروی کوملحوظ رکھا گیا۔''4

یہ درست ہے کہ جس وقت اردوتذکروں میں نقد نویسی کی داغ بیل پڑ رہی تھی اس وقت لوگوں کے درمیان فارسی زبان کوقدرے اعتبار واقتدار حاصل تھا لہٰذا اردوتذکرہ نویسوں نے بھی وہی انداز واسلوب اختیار کیا تاکہ ان کی ادبی تخلیقات کوقبول عام حاصل ہوسکے اور اردوناقدین ادب کی تمام ترتوجہ زبان

اردوتذکرہ نویسی اپنی ابتدائی منزلوں میں فارسی تذکرہ نویسی سے ہی نقل ہے یہی وجہ ہے کہ جب اردوشاعروں کے تذکرے مرتب ہونا شروع ہوئے توان میں نہ صرف عام اصول تصنیف کے لحاظ سے فارسی تذکروں کی تقلید کی گئی بلکہ ان تذکروں کی زبان بھی فارسی رہی۔

وبیان، عروض وقافیہ اورتاریخ وتنقیص کی ہی طرف زیادہ مبذول رہی، خود فارسی زبان وادب میں اس وقت تک فن نقد بہت ستھرایانکھراہوانہیں تھا، اس زبان کی تنقیدی روایات بھی بہت کمزور، غیرواضح، مبہم اورغیر متعین تھیں جن کواہل اردو نے بغیرکسی کم وکاست کے اپنی تحریروں میں استعمال کرنا شروع کردیا تھا، سید محمد کریم اردو کے ابتدائی تذکروں کی تشکیل وتالیف کے متعلق اظہارخیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''تذکرہ اورطبقات چونکہ شاخیں فن تاریخ کی ہیں خصوصاً زبان عربی وفارسی میں اس قسم کی بہت سی تصنیف ہوئیں ہیں ان کی دیکھادیکھی اردو میں بھی اسی طریق تصنیف کا استعمال کیا ہے۔''5

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ تذکرے چاہے کسی بھی زبان میں تحریر کیے گئے ہوں، ادب کا گرانقدراوربیش قیمت سرمایہ ہیں اورخاص کر اردوادب میں توان سے سرسری طور پر ہرگزنہیں گزرا جاسکتا ہے، کیونکہ ان کے مطالعے کے بغیرنہ تواردوشاعری کی اصل ماہیت وکیفیت سے آگاہی حاصل کرسکتے ہیں اورنہ ہی نقد وانتقاد کی ابتدائی تاریخ ہی مرتب کی جاسکتی ہے کیونکہ قدیم شعرا اوران کے کلام کوسمجھنے کے لیے ہمیں ان تذکروں کا مطالعہ کرنا ہی پڑتا ہے اوراس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ جدید ناقدین ادب کی ناقدانہ بصیرت بھی انھیں تذکروں کی مدد سے پروان چڑھی ہے فارسی تذکروں کے زیراثر جو بھی اردو تذکرے مرتب کیے گئے وہ پوری طرح انھی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور تذکرہ نویسوں نے وہی میلانات، رجحانات اور معیار ومیزان پیش کرنے کی کوشش کی جو عرصہ دراز سے فارسی کے لیے مخصوص رہے تھے اور خاص طور پر اٹھارویں صدی تک تواردوادب کے مصنفین جدید تنقیدی رجحانات سے مکمل طور پر انجان وبے خبر تھے اوریہ تو وہ وقت تھا کہ خود اردو کا نثری سرمایہ تقریباً ناکے برابر تھا۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردوفن نقد کا جوعظیم الشان قصرنظر آتا ہے اس کی اساس یا بنیاد کہیں نہ کہیں فارسی ہی کی مرہون منت ہے، اسی زبان کے ذریعے اردوتنقید کو وقار اور بلند مقام عطا ہوا، لہٰذا اردوشرع وادب اورادبی نقد کی تاریخ جب بھی مرتب کی جائے گی، اس میں فارسی زبان کی اہمیت کونظرانداز نہیں کیا جاسکے گا۔

### ماخذ ومنابع


1 نورالحسن نقوی، فن تنقیداوراُردوتنقیدنگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1990، ص89

2 ابوالکلام قاسمی، مشرقی شعریات اوراُردوتنقید کی روایت، مغربی پاکستان اُردواکیڈمی، لاہور، 2000، ص175

3 سیدعبداللہ، شعرائے اردو کے تذکرے اورتذکرہ نگاری کا فن، جدید اردوٹائپ پریس چیمبرلین روڈ، لاہور، 1968، ص1

4 کلیم الدین احمد، اردوتنقید پر ایک نظر، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ص20,26

5 سیدمحمدنواب کریم، بحوالہ اردوتنقید حالی سے کلیم تک، بلس آفسیٹ پرنٹنگ ورکس، نئی دہلی، 1993، ص45


■


**Imran Ahmad**
Research Scholar, Dept of Arabic and Persian
University of Allahabad
Prayagraj-211002 (UP)
Mob.:8004629927
imranmalikznt800@gmail.com

محمد عامر

# دیوانِ اکبر قدیم

## نسخۂ بنارس کا تعارف

**بنارس** ہندو یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے میں اردو، فارسی و عربی کے قلمی نسخوں کا ایک اہم ذخیرہ موجود ہے۔ ان ذخائر میں اردو شعرا کے دواوین کے ساتھ ساتھ ادبا کی تالیفات بھی موجود ہیں جن میں اکثر کتب تعارف اور محققین کی توجہ کی محتاج ہیں۔ ماضی قریب میں راقم سطور کی نظر اسی ذخیرے کے ایک نادر مخطوطے بعنوان 'دیوان اکبر بھچّو' پر پڑی اور تحقیق و تفتیش کے بعد اس کی تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اکبر بھچو کا شمار اٹھارہویں صدی عیسوی کے غیر معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ تذکروں میں ان کے احوال مختصر ہی ملتے ہیں۔

### مرزا بھچّو اکبر: احوال و آثار

مرزا بھچو نام اور اکبر تخلص ہے۔ امروہہ کے رہنے والے تھے لیکن دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ مصحفی کی شاگردی اختیار کی لیکن کچھ ہی دن بعد شاہ حاتم سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ ان کے حالات زندگی کے بارے میں معلومات محدود ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت یا تاریخ وفات کا ذکر کسی تذکرے میں مذکور نہیں ہے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی اور شاہ ظہور الدین حاتم کے شاگرد تھے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کا زمانہ 1699 کے بعد کا زمانہ ہے۔ تذکروں و تواریخ میں ان کے بارے میں جو تفصیلات درج ہیں وہ اس طرح ہیں۔

**مجموعۂ نغز:** شخصے از عوام 'بھچو' نام وے در سلک نقیبان حضور پُر نور منسلک بود۔ شاگرد استاد اکثرے از سخن سنجان عالم شیخ حاتم است۔ شوخی طبعش بدرجہ ایست کہ در خواندن اشعار اساتذہ مشہورہ بنام خود ہیچ مبالات ندارد از چاشنی کلامش احوالش ہویدا است۔ گویند کہ ایں دہ شعر از وے است۔

''ان کا نام بھچو ہے اور دربار معلی سے منسلک ہیں۔ معروف سخن سنج استاد شیخ حاتم کے شاگرد ہیں۔ شوخ طبیعت کے مالک ہیں اور استاد شعرا کے کلام کو اپنی طرف منسوب کرنے سے بالکل دریغ نہیں کرتے۔ ان کے کلام کی چاشنی ان کے احوال سے ہویدا ہے۔ مندرجہ ذیل دس شعر ان کی طرف منسوب ہیں۔''

دل میں جو آج درد ہے اکبر کے دوستاں
کس کی نگہ کے تیر کا پیکان رہ گیا
ہے بر میں میرے یار کے کیا جامہ چھبن کا
جو پاٹ ہے جامے کا سو تختہ ہے چمن کا
جوں پردۂ فانوس میں ہو شمع درخشاں
یوں جھمکے ہے جامے میں ترے رنگ بدن کا
ہمارے دل میں خنجر ناز کے کیا کیا نہ گڑتے ہیں
یہ کافر خوبرو جس وقت تن تن کر اکڑتے ہیں
یہ جتنے خوبرو سرکش ہیں ان کو خوب دیکھا میں
گئے پر حسن کے ایک ایک کے یہ پاؤں پڑتے ہیں
خدا چاہے سو ہووے اب ہمارے حق میں اے اکبر
صنم سے اپنے پھر ہم آج اک بوسے پہ اڑتے ہیں
چھیڑا جو ٹک اُسے تو بگڑ کر کہا کہ واہ
تم کون ہو جو ہاتھ لگاتے ہو ہات کو
نقد جاں پر کیجیے بوسے کا سودا اس گھڑی
آپ کا اے مہرباں چاہے اگر سو بار جی
سینے میں دل کہاں ہے تو اس کو مت ٹٹول
پیارے بجائے دل ہیں یہاں سیکڑوں پھپھولے

**تذکرۂ سرور:** اکبر تخلص، بھچو جا نام، مردِ شوخ طبع ولطیفہ گو و بذلہ سنج، ملازم سرکار والا، در فرد نقیباں شرف امتیاز داشت۔ شاگرد شاہ حاتم۔ مشاعرہ در خانۂ خود وقت بودنِ شاہجہان آبادی کرد۔ در کلامش شوخیِ طبع مفہوم می گردد۔ از وست۔

''اکبر تخلص، بھچو نام، شوخ طبیعت، لطیفہ گو، بذلہ سنج آدمی تھے اور سرکار والا کے ملازم بھی اور نقیبوں میں ممتاز بھی تھے۔ شاہجہان آباد میں قیام کے دوران اپنے گھر میں مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ ان کی شوخ طبیعت ان کے کلام سے مترشح ہے۔ مندرجہ ذیل شعر۔

جس پر تیرے کرم کی ہووے نگاہ یارب
دونوں جہاں میں اس کو ہو عز و جاہ یارب

**تذکرۂ ہندی:** اکبر۔ عرف بھچو جوانیست شوخ طبع و طرار و لطیفہ گو۔ ہمیشہ نوکری خانۂ بادشاہ باامتیاز در بوایان کردہ۔ در آں ایام کہ فقیر در شاہجہاں آباد طرح مشاعرہ انداختہ اول برائے اصلاح شعر رجوع بفقیر آوردہ بود۔ بعد چندے بخدمت شاہ حاتم رفتہ، استفادۂ کلی از ذات بابرکات ایشان برداشتہ۔ حالا صاحب دیوان است و بر رویۂ استاد قدم در راہ ایہام گوئی بیشتر می گذارد و در آں معنی ہائے تازہ می بندد۔ اما فقیر اشعار ایہام را دوست نمی دارد۔

''اکبر عرف 'بچھو' شوخ طبیعت اور لطیفہ گو ہیں۔ ہمیشہ بادشاہ کی ملازمت سے سرفراز رہے۔ شاہجہان آباد کے قیام کے دوران جب راقم سطور نے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا تھا، اصلاح شعر کی غرض سے وہ اس فقیر کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد شاہ حاتم سے مشورۂ سخن کرنے لگے اور ان کی بابرکت ذات سے کسب فیض کیا۔ ابھی وہ صاحب دیوان ہو چکے ہیں اور اپنے استاد کے نقش قدم پر ایہام گوئی میں زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں اور نئے معانی پیدا کرتے ہیں۔''

**یادگارِ شعرا:** اکبر۔ شاہ بچھو یا میاں؛ شاگرد حاتم۔ جب تک دہلی میں رہے، مشاعرہ کرتے رہے (تذکرۂ سرور)۔ جب تک مصحفی دہلی میں تھے وہ اکبر کی نظمیں صحیح کرتے تھے۔ انہوں نے ایک دیوان لکھا ہے۔ اس کا طرز پرانا ہے اور ذومعنی الفاظ سے خراب ہو گیا ہے (تذکرۂ مصحفی)۔

**تذکرہ تلامذہ شاہ حاتم دھلوی:** از عبدالرشید عصیم میں اکبر کا ترجمہ وہی دیا گیا ہے جو مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں درج کیا ہے۔ البتہ اس میں اکبر کا نام اکبر علی اور اکبر امروہوی ضرور ملتا ہے جو کسی اور تذکرے میں نہیں ملتا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ عصیم نے شاعر کا نام کہاں سے اخذ کیا ہے۔ مذکورہ تذکرے میں جو ترجمہ درج ہے وہ یہ ہے:

**اکبر:** نام اکبر علی اکبر امروہوی۔ تذکرہ ہندی گویاں 1209/1794-95ھ میں ہے کہ ''عرف بچھو شوخ طبع و طرار و لطیفہ گو۔ ہمیشہ نوکر خانۂ بادشاہ باامتیاز در بوایاں کردہ۔ درآں ایام کہ فقیر در شاہجہاں آباد طرح مشاعرہ انداختہ اول برائے اصلاح شعر رجوع بہ فقیر آورد بود۔ در ایہام گوئی بیشتر می گذارد۔ بعد چندے بخدمت شاہ حاتم رفتہ استفادہ کرد۔'' صاحب دیوان تھے۔

''اکبر علی اکبر امروہوی، عرف 'بچھو' شوخ طبیعت اور لطیفہ گو ہیں۔ ہمیشہ بادشاہ کی ملازمت سے سرفراز ہے۔ شاہجہان آباد کے قیام کے دوران جب راقم سطور نے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا تھا، اصلاح شعر کی غرض سے وہ اس فقیر کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد شاہ حاتم سے مشورۂ سخن کرنے لگے اور ان کی بابرکت ذات سے کسب فیض کیا۔ ابھی وہ صاحب دیوان ہیں۔''

## طبقات الشعرائے ہند

اکبر تخلص ایک شخص کا عوام سے (کذا) حاجی شاہ اکبر جو کہ مشہور ہے بچھو نام سے ہے (کذا) مصحفی کہتا ہے یہ شخص دہلوی خوش طبع رنگیلا اور پسندیدہ آدمی تھا۔ نقیبوں میں حضور پُر نور یعنی محمد شاہ کے نوکروں میں منسلک تھا۔ شاگرد شیخ ظہورالدین حاتم مشہور مصنف اشعارات (کذا) صوفیایہ (صوفیانہ) کی صحبت سے اس نے بڑا فائدہ دینداری اور اصلاح شعر کا اُٹھایا تھا۔ شاہ حاتم کے یہ اچھے شاگردوں میں سے ہے جبکہ مصحفی نے مشاعرہ شاہجہاں آباد میں مقرر کیا تھا۔ اکبر نے اول اپنے شعر پیش کیے تھے۔ شوخ طبع اس درجہ کا ہے کہ اشعار اساتذہ مشہور کے اپنے نام سے پڑھنے میں کچھ پرواہ نہیں کرتا چنانچہ چاشنی کلام اس کی سے حال اس کا ظاہر ہے۔ یہ اشعار کہتے ہیں کہ اس کے ہیں۔ صاحب دیوان ہے جو کہ قدما کے طور پر لکھا گیا ہے۔ کنایہ اور مشکل تشبیہ سے اس طور پر ہے کہ مصحفی جس کے تذکرے سے لکھا گیا ہے اس کو پسند نہ آئے۔

یہ حال معلوم ہوا کہ وہ خود بیان کرتا ہے کہ میرے پسند نہیں آئے۔

**جامع التذکرہ:** شاہ بچھو یا میاں، شاگرد حاتم، جب دہلی میں رہے مشاعرہ کرتے تھے۔ وہاں مصحفی سے اصلاح لیتے رہے۔ طرز پرانا، الفاظ ذومعنین استعمال کرتے رہے۔ ان کا ایک دیوان ہے۔ (اسپرنگر، بحوالہ سرور، مصحفی)

**تذکرہ خوش معرکہ زیبا:** خوش سخنور، شیخ بچھو اکبر، شاگرد شاہ حاتم۔

**مخطوطہ:** دیوان اکبر قدیم کا ایک اہم قلمی نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے کے ذخیرۂ لالہ سری رام میں موجود ہے۔ یہ نسخہ ناقص الطرفین ہے۔ اس نسخے کا مسلسل نمبر 17، بخط نستعلیق صاف اور قابل قرأت ہے۔ اس نسخے میں زرد رنگ کے کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اگر چہ اس کے چند صفحات کرم خوردہ ہیں لیکن متن محفوظ ہے جس کو بہ آسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ کاتب کا نام نسخے میں کہیں رقم نہیں ہے۔ سنہ کتابت بھی غیر معلوم ہے۔ اوراق کی تعداد 69 اور ہر صفحے پر 13 سطریں لکھی گئی ہیں۔ سائز ساڑھے آٹھ گنا ساڑھے پانچ سینٹی میٹر ہے۔

**محتویات:** دیوان اکبر قدیم کا یہ نسخہ 1495 اشعار پر

**دیوان اکبر قدیم کا ایک اہم قلمی نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے کے ذخیرۂ لالہ سری رام میں موجود ہے۔ یہ نسخہ ناقص الطرفین ہے۔ اس نسخے کا مسلسل نمبر 17، بخط نستعلیق صاف اور قابل قرأت ہے۔**

مشتمل ہے۔ موجودہ پہلے ورق پر غزل کے مقطع کا ایک مصرع موجود ہے جس سے اس نسخے کا آغاز ہوتا ہے ع

مثال آئینہ دل ہے امانت دار حیرت کا

اس مصرع کے بعد دیوان کی پہلی غزل رقم ہے۔ اس صفحے پر دو غزلیں ہیں۔ پہلی غزل ملاحظہ فرمائیں۔

جب وہ رشک بہار آوے گا
تب ہی دل کو قرار آوے گا
شب فرقت کا حال کیا کہیں
اُسے کب اعتبار آوے گا
مر گئے پھر بھی تیرے کوچے تک
اُڑ کر مشت غبار آوے گا
چہرہ قاصد کا دیکھ کر بشاش
یہی جانا کہ یار آوے گا
دور سے دیکھتے ہی پوچھا میں
کب تغافل شعار آوے گا
کر رہا ہے جوگھر کی آرایش
شاید اکبر کا یار آوے گا

اس غزل پر کاتب کے ذریعے 2 نمبر تحریر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نسخے سے شروع کی صرف ایک غزل ندارد ہے جو پہلے صفحے پر مرقوم تھی جس کے مقطع کا ایک مصرع باقی رہ گیا ہے۔ چونکہ مخطوطے میں ترقیمہ بھی موجود نہیں ہے اس لیے راقم نے اس کو ناقص الطرفین مانا ہے۔ اس مخطوطے کا اختتام مندرجہ ذیل شعر پر ہوتا ہے۔

اکبر محبؔ خاص وہی ہے کہ جس کے میں
الفت ہے جان و دل سے حسنؓ و حسینؓ کی

دیوان کے متن میں 264 غزلیں اور حاشیے میں 17 غزلیں درج ہیں۔ اشعار کی تعداد 1495 ہے۔ اس کے علاوہ مختلف صفحات کے حواشی میں بھی ایک ایک شعر درج ہیں جن کی مکمل تعداد پانچ ہے۔

**صنائع لفظی و معنوی:** مرزا اکبر بچھو ایک ماہر شاعر تھے۔ لفظی ومعنوی صنائع کا استعمال انھوں نے اپنے دیوان میں بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ دیوان اکبر میں بہت سی صنعتوں کا استعمال ہوا ہے لیکن صنعت تلمیح پر ان کو خاص دسترس ہے۔

**صنعت تلمیح۔**

جلوہ ذرا جو دیکھے صنم تیرے بدن کا
طالب کبھی کلیم نہ ہو کوہِ طور کا
حسن کے مصر میں دل دار کوئی ہے ایسا
جس کا یوسف ہو خریدار کوئی ہے ایسا

دیوان میں ایک حمد یہ غزل بھی ہے۔ یہ حمد دیوان کے ورق 15 ب پر رقم ہے۔ ملاحظہ ہو۔

**حمد:**

جس پر تیرے کرم کی ہووے نگاہ یا رب
دونوں جہاں میں اس کو ہو عزوجاہ یا رب
محتاج اس جہاں میں کچھ نہ کسی کا
میری یہی دعا ہے شام و پگاہ یارب
دنیا کی الفتوں سے دل کو مرے چھڑا کر
صدقہ نبیؐ کا اپنے دے اپنی چاہ یا رب
مقبول ہو جو تیری درگاہِ صمدیت کا
پھر کس طرح ہو اس سے صادر گناہ یارب
اکبر کی عرض بھی ہے صدقہ رسولؐ کا تو
دکھلائیو نہ مجھ کو روزِ سیاہ یارب

اکبر کی تاریخ ولادت، تاریخ وفات یا جائے مقام کے بارے میں اس دیوان سے کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ مختلف تذکروں میں ان کے بارے میں جو تفاصیل ملتی ہیں ان سے صرف اتنا ہی علم ہوتا ہے کہ امروہہ میں پیدا ہوئے اور دہلی میں سکونت اختیار کرلی۔ مشاعرے کروانے کا شوق تھا۔ غزل کہنے سے دلچسپی رکھتے تھے۔ پہلے مصحفی کی شاگردی اختیار کی، پھر شاہ حاتم کی شاگردی میں چلے گئے۔ شاہی دربار سے بھی ان کا تعلق تھا لیکن اس بارے میں ہمیں کوئی جانکاری تذکروں سے یا دیوان سے نہیں ملتی ہے۔

ان تذکروں کے علاوہ مرزا بچھو اکبر کے بارے میں کسی طرح کی معلومات نہیں ملتی ہے۔ ان تذکروں سے جو باتیں عیاں ہوتی ہیں ان کا لب لباب یہ ہے کہ اکبر نے پہلے مصحفی کی شاگردی اختیار کی لیکن کچھ دنوں کے بعد شاہ حاتم کی شاگردی اختیار کی۔ ایسا اس لیے ہوا کہ شاہ حاتم ایہام گوئی کو پسند کرتے تھے جبکہ مصحفی کو ایہام گوئی ناپسند تھی۔ اور اکبر کا دیوان ایہام کے لوازمات سے پُر ہے۔ جا بجا انھوں نے ایہام کے اشعار کہے ہیں۔

دیوان اکبر قدیم کی غزلوں میں منقبت کے بہت سارے اشعار موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ورق 20 ب پر موجود ایک غزل کا یہ شعر جو مولا علی کی شان میں مناجاتی انداز میں کہا گیا ہے۔

بحرِ غم سے یا علیؓ اکبر کا کھیوا پار کر
بے طرح آکر ہوئی ہے اس کے دامن گیر موج

اسی طرح امام حسنؓ و امام حسینؓ کی شان اقدس میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک شعر کہا ہے، جو کہ اس دیوان کا اختتامی شعر ہے جو کہ مقطع کا بھی شعر ہے۔

اکبر محبّ خاص وہی ہے کہ جس کے میں
الفت ہے جان و دل سے حسنؓ و حسینؓ کی

ان اشعار کے علاوہ اکبر نے کئی مقامات پر استاد حاتم کا ذکر فخر یہ انداز میں کیا ہے۔ اور ان کی تعریف کے نغمے گائے ہیں۔ اور ان کی شاگردی پر خوشی کا بھی اظہار کیا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو۔

اکبر یہ بات سچ ہے کہ حاتم جہان میں
صاحبقران ہے ریختہ گوئی کے بیچ
(ورق 21 الف)

اس قدر فیض ہے حاتم کا مجھ اوپر اکبر
ہائے اشعار میرے منھ سے جھڑتے ہیں
(ورق 42 ب)

عالم سے ریختہ کے تھی اکبر کو کیا خبر
پایا ہے فیض حضرت حاتم کی ذات سے
(ورق 57 الف، ب)

ایک شعر میں حضرت سودا کا ذکر کیا ہے۔

اکبر بقول حضرت سودا ہم اس جگہ
کیا کر چلے اور آئے تھے کس کام کے لیے
(ورق 62 ب)

**نتیجہ گیری:** مرزا اکبر بچھو اپنے زمانے کی ایک معروف شخصیت تھے کیونکہ دہلی کے اکثر مشاعرے انھیں کی کوششوں سے منعقد ہوتے تھے لیکن آج ان کی شخصیت گمنامی کا شکار ہے۔ ان کے دیوان کا ایک مخطوطہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے میں محفوظ ہے جس کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد ان کی ادبی اور تاریخی شخصیت کی بازیابی ممکن ہے اور اس لحاظ سے یہ مخطوطہ کافی اہم ہے۔

**منتخب اشعار**

کر رہا ہے جو گھر کی آسائش
شاید اکبر کا یار آوے گا
دل بچا اوسکا ہوئے گا اکبر
گھر میں اپنے جو چھپ رہا ہوگا
یار اگر اکبر تیرا دو چار دن روٹھا رہا
پھر جہاں میں تجھ کو جینا سخت مشکل ہو جائے گا
پوری ہے کشش اپنی اگر دل کی تو اکبر
ایک روز تیرے پاس وہ پھر آن رہے گا
منت میں ہووے گی رسوائی و خفت حاصل
قتل اکبر کو میری جان اگر کیجیے گا
نہ رکھ خوف محشر کا دل میں تو اکبر
کہ بخشندہ خالق ہے تیرے گناہ کا
غزل لکھنا ہے اکبر روز ہے اپنی طبیعت کا
وگرنہ قافیہ تھا اس زمین کا سخت بے ڈھنگا
ہمارا دیدہ ہے ہجر میں اس شوخ کے اکبر
بھرا رہتا ہے جیسے رات دن تالاب پانی کا

**کتابیات**


1 مجموعۂ نغز، میر قدرت اللہ قاسم، مرتبہ محمود شیرانی، نیشنل اکادمی، 1973
2 تذکرۂ سرور، میر محمد خاں، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ادبی پرنٹنگ پریس، ممبئی، 1961
3 تذکرۂ ہندی، غلام ہمدانی مصحفی، مرتبہ مولوی عبدالحق، جامع برقی پریس دہلی، 1933
4 یادگار شعرا، اسپرنگر، مترجم طفیل احمد خاں، ہندوستانی اکیڈمی، صوبہ متحدہ، الہ آباد، 1943
5 تذکرہ تلامذہ شاہ حاتم دہلوی، تلخیص و ترتیب، عبدالرشید عصیم، محکم آرٹ پریس ملتان، 1994
6 طبقات الشعرائے ہند، ایف فلن و مولوی کریم الدین (طبقۂ سوم)، مرتبہ سید شاہ عطاؤالرحمٰن عطا کاکوی، رئیس ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، 1967
7 جامع التذکرہ 3/61 تالیف محمد انصار اللہ، شائع کردہ: قومی کونسل دہلی 2007
8 تذکرہ خوش معرکہ زیبا، سعادت خان ناصر، مرتبہ مشفق خواجہ، مجلس ادب لاہور 1980


■


**Mohammad Amir**
Research Scholar, Dept of Urdu
Banaras Hindu University (BHU)
Varanasi- 221005 (UP)
Cell.:9208147549
mohammadamir47549@gmail.com

# وہاب اشرفی کے افسانے

فہیم اشرف

**پروفیسر** وہاب اشرفی نے اردو زبان وادب کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اپنا ادبی سفر انھوں نے افسانہ نگاری سے شروع کیا مگر صنفِ افسانہ ان کے ادبی سفر کے لیے منزلِ عیش ونشاط نہیں بن سکی۔ اس لیے بہت جلد انھوں نے تحقیق وتنقید میں اپنی راہ نکال لی۔ حق کی نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو افسانہ نویسی کا معیار بھی ان کا بلند تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خود کو بطورِ افسانہ نویس متعارف کر کے ٹھہر نہیں گئے بلکہ انھوں نے اس سے آگے کی راہ نکالی اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ البتہ ہم ان کے مجموعی مطالعہ کے مرحلے میں اس نتیجے کا ان دیکھا نہیں کر سکتے کہ بہ حیثیت افسانہ نویس وہ بہت معیاری ہیں۔ گرچہ اس سے بھی پہلے انھوں نے شاعری کی طرف توجہ کی تھی مگر بہت جلد وہ افسانہ نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ اس کا اعتراف انھوں نے اس طرح کیا ہے:

’’میں ابتدا میں افسانے لکھتا تھا۔ اتنے افسانے ہو چکے تھے کہ ایک مجموعہ مرتب کیا جاتا لیکن ایک صاحب کو افسانوں کے تراشے دیے اور وہ مشرقی پاکستان تراشوں کے ساتھ ہجرت کر گئے... ایک عرصہ تک افسانے نہیں لکھے۔ آخری افسانہ اس وقت لکھا جب جدیدیت کی تحریک جڑ پکڑ چکی تھی اور اشاعت کے لیے ’شب خون‘ میں بھیج دیا۔‘‘

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ وہاب اشرفی کی ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ وہ 1958 سے 1965 تک ایک سرگرم افسانہ نگار رہے۔ کم وبیش انھوں نے بیالیس افسانے لکھے۔ ان کا پہلا افسانہ ’اپنی راہ‘ 1958 میں ’بیسویں صدی‘ دہلی میں شائع ہوا۔ حالانکہ وہ اس سے پہلے سے ہی افسانے لکھ رہے تھے۔ اس بات کا خود وہاب صاحب نے ڈاکٹر ہمایوں اشرف کو انٹرویو دیتے ہوئے اعتراف کیا ہے:

پروفیسر وہاب اشرفی کے ابتدائی افسانوں میں رومانی لب ولہجہ غالب ہے۔ اسی لیے ان کے افسانوں کی اشاعت کا آغاز اس رسالے سے ہوا جو اپنے زمانے میں رومانی افسانوں کی اشاعت کے لیے مشہور ہے۔

’’خاموشی سے کہانیاں تو لکھتا تھا لیکن چھپوانے کی نوبت 1958 میں آئی۔ میرا پہلا افسانہ ’اپنی اپنی راہ‘ بیسویں صدی میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے بعد میں مسلسل افسانے لکھتا رہا۔

پروفیسر وہاب اشرفی کے ابتدائی افسانوں میں رومانی لب ولہجہ غالب ہے۔ اسی لیے ان کے افسانوں کی اشاعت کا آغاز اس رسالے سے ہوا جو اپنے زمانے میں رومانی افسانوں کی اشاعت کے لیے مشہور ہے۔ مگر ان کے بعد افسانوں کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے بعد کے افسانوں میں سماجی ومعاشی حالات کو اپنے افسانوں میں بطورِ خاص جگہ دی ہے۔ بقول احمد حسین آزاد:

’’وہاب اشرفی نئے نقادوں میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں لیکن یہ کسی وقت افسانہ نگار بھی رہے ہیں۔ اس میدان میں بھی ان کی لو بہت تیز رہی ہے اور اس وقت بھی وہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں رہے ہیں۔ رومانی آہنگ کے باوجود سماجی احوال وکوائف پر ان کی نظر تھی۔ ان کے بعض افسانوں میں طنز کا شدید احساس ہوتا ہے۔‘‘ (نقدِ آزاد، ص:85)

ابتدا میں اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ وہاب اشرفی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک تخلیق کار کی حیثیت سے کیا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے غزلیں کہیں، پھر نظمیں لکھیں۔ اس کے بعد افسانہ نگاری کی طرف آئے۔ اس صنف میں انھوں نے اپنی مہارت کا ثبوت پیش کیا جس کی وجہ سے ان کے زمانے میں انھیں پذیرائی نصیب ہوئی اور وہ کامیاب افسانہ نگار کی صف میں شامل ہو گئے۔ اس کے باوجود وہ اس میدان سے نکل گئے۔ یہ ان کا سوچا سمجھا فیصلہ تھا اور اس فیصلے کی بنیاد یہ تھی کہ ان کا افسانہ اپنا کوئی شناختی مزاج پیدا نہیں کر سکا اور نہ ہی اسلوب میں کوئی جدت وندرت نے جگہ پائی۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ان میں کہیں ش مظفر پوری کا رنگ نظر آتا ہے تو کہیں بیدی، کرشن چندر کا اور کہیں منٹو کا انداز وہ اختیار کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسین آزاد نے وہاب اشرفی کے کل اٹھارہ افسانوں کو ترتیب دے کر 1986 میں ’ڈاکٹر وہاب

اشرفی کے افسانے' کے عنوان سے شائع کردیا۔ احمد حسین آزاد کی اس سعی کی پذیرائی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ ہوئی۔ احمد حسین آزاد نے اپنی تحقیق کی بنیاد پر 'ہاتھی کے دانت' کو وہاب صاحب کا پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔ موصوف نے 'وہاب اشرفی کے افسانے' کو صرف ترتیب ہی نہیں دیا تھا بلکہ اس کا مفصل پیشِ لفظ بھی لکھا۔ انھوں نے اپنے پیشِ لفظ میں وہاب صاحب کا پہلا افسانہ 'ہاتھی کے دانت' پر اپنی رائے اس طرح دی ہے:

''جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ ان کا پہلا افسانہ 'ہاتھی کے دانت' ہے۔ اس افسانے میں ایک رومانی قصہ افسانہ بنا ہے۔ لیکن بے رحمی سے زندگی کی تلخی کو اس میں سمیٹ لینے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ قابلِ دید ہے۔ دراصل وہاب اشرفی کا یہ پہلا افسانہ ہی اس بات کا احساس دلا دیتا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کو رومان کے شیریں کیپسول میں چھپانا چاہتے ہیں اور یہ صورت ان کے یہاں شدید سے شدید تر ہوجاتی ہے۔''

(وہاب اشرفی کے افسانے: احمد حسین آزاد)

جب ہم ان کے افسانوں کی ورق گردانی کرتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ ان کا آخری افسانہ 'کھویا ہوا چہرہ' ہے جو 1988 میں ماہنامہ 'شب خون' الٰہ آباد میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کا کوئی افسانہ شائع نہیں ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے تحقیق وتنقید کی راہ اپنائی۔

موصوف کی افسانہ نویسی کا دور 1958 سے شروع ہوکر 1965 میں ختم ہوتا ہے۔ آٹھ برس تک وہاب صاحب کے افسانے شائع ہوتے رہے۔ ظاہر ہے یہی آٹھ برس ان کی افسانوی زندگی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں انھوں نے تقریباً 42 افسانے قلم بند کیے۔ یہ وہ افسانے ہیں جن کی وجہ سے ان کی پہچان افسانہ نگار کے طور پر مستحکم ہونے لگی تھی۔ مگر انہوں نے افسانہ نگاری ترک کردی۔ بقول مناظر حسن:

''اس وقت تک (یعنی 65 تک) جدیدیت ایک فیشن کے طور پر اختیار کی جانے لگی تھی اور افسانہ لکھنے والوں سے گویا یہ مطالبہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک خاص فارمولے کے تحت افسانہ لکھیں، وہاب اشرفی کے اس آخری افسانہ 'کھویا ہوا چہرہ' پر جدیدیت کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے افسانہ نگاری ترک کردی۔ کیونکہ وہ فیشن کے تحت کوئی افسانہ لکھنے کے حق میں نہیں تھے اور جدیدیت کو سمجھے بغیر اس سے رشتہ جوڑنا مناسب نہیں تصور کرتے تھے۔''

(وہاب اشرفی کی افسانہ نگاری: مناظر حسن)

سچ تو یہ ہے کہ وہاب اشرفی نے بہت کم افسانے ادب کو دیے مگر جس قدر اور جس نہج کے افسانے اردو ادب کو انھوں نے عنایت کیے اس نے ہی انھیں افسانوی ادب میں زندہ، تابندہ اور سرخرو کردیا ہے۔ ان کے نمائندہ افسانوں میں 'کافر بھی ہوئے سجدہ بھی کیا'، آئینہ سے شکوہ مت کیجیے، چھوٹی بہو، چھی چھی توبہ توبہ، مٹی کا مادھو، آخری لاش، کوئی غمگسار ہوتا، گردش میں ہے آسماں، مسیحا کہیں جسے، کھویا ہوا چہرہ اور 'چراغ پرانا شمع نئی' اہم ہیں۔ یہ وہاب اشرفی کے وہ افسانے ہیں

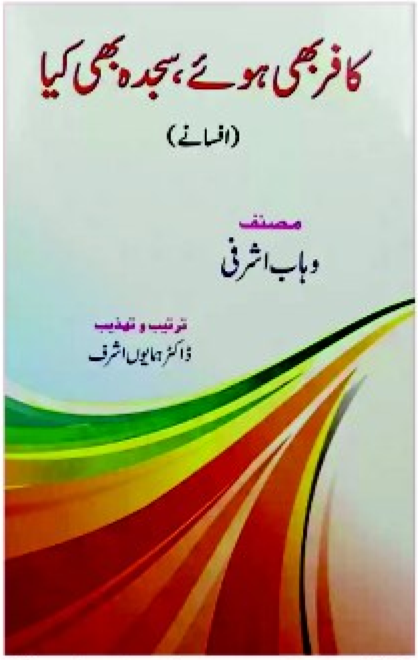


جس کی بنا پر ادبی دنیا میں بہ حیثیت افسانہ نگار ان کی اپنی ایک الگ شناخت قائم ہوگئی ہے۔ ان افسانوں کے مطالعے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں ان کی شخصیت کا ہر جگہ جلوہ نمایاں ہے۔ ان کے افسانوں میں ایک خاص مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔ انھوں نے افسانے محض اپنے دل کو بہلانے یا تفریح کے لیے نہیں لکھے ہیں۔ ان کے چند مشہور افسانوں کے چند بنیادی نکات پیش کر رہا ہوں جس سے وہاب اشرفی کی افسانہ نگاری کے ضمن میں ان کے رجحانِ طبع کا اندازہ لگایا جا سکے گا۔

ان کا افسانہ 'کافر بھی ہوئے سجدہ بھی کیا' سے گفتگو شروع کی جاتی ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے دو مختلف طبقات کی ذہنی کیفیت، ان کے حالات اور تغیراتِ زمانہ کو فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے جو سچ مچ قابلِ ستائش ہے اور جسے کسی بھی طور پر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس افسانے میں ذات پات کے تغیرات کو افسانہ نگار نے جس فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ موصوف اپنے اس افسانے کے ذریعے قاری کو یہ درس دیتے ہیں کہ کوئی بھی شخص ہمیشہ کے لیے برا نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کا مقدر ہمیشہ اسے چھوٹا رکھتا ہے۔ انسان کو یہ بات ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ حقائق سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اس افسانے میں بڑی مہارت کے ساتھ افسانہ نگار نے غرور کو خاکساری کی منزل تک پہنچا دیا ہے۔ وہاب صاحب نے تعلیم کی اہمیت پر بھی خاصا زور صرف کیا ہے۔ وہ اپنے کرداروں گنیشوا اور پریگوا کو تعلیم کی بدولت گنیش بابو اور پریاگ چودھری بنا کر پیش کردیتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ افسانہ اپنے مزاج اور منہاج کے اعتبار سے سب الٹرن موضوع پر ہے۔ عہد زمینداری اور جاگیردارانہ نظام کے رویے سے ہم بھی بخوبی واقف ہیں۔ اس عہد میں طبقۂ اشرافیہ کی جو حالت تھی اس کا بھی بخوبی اندازہ ہمیں ہے۔ رنگ ونسل، ذات پات کی کیفیات اور درجات کے فرق نے اس عہد میں انسانی زندگی میں جس طرح کا اختلاف پیدا کردیا تھا وہ کسی سے چھپا نہیں۔ طبقۂ اشرافیہ کا یہ عام مزاج رہا ہے کہ وہ دوسرے طبقے کے افراد کو ایک خاص انداز سے دیکھا کرتا تھا۔ یہ حالت آزادی سے قبل کے ہندوستان میں شدت پکڑے ہوئی تھی۔ آزادی کے بعد ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے معاشرے کے جسم پر بھی بھید بھاؤ کی ضرب پڑنے لگی اور شعر وادب میں ایسے احساس در آنے لگے جو نہ پہلے کبھی موضوع بنے تھے اور نہ بنائے جاتے تھے۔ 'کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا' ایسے ہی زمیندار کا قصہ ہے جس کی زمینداری تو ختم ہو چکی ہے مگر اس کا تحکمانہ انداز جوں کا توں باقی ہے۔

اسی طرح ان کا دوسرا افسانہ 'آئینہ سے شکوہ مت کیجیے' ہے جو ہمیں زندگی کے سنگین رخوں سے متعارف کراتا ہے۔ اس افسانہ کو موصوف نے آئینے کی تمثیل سے ہمارے سامنے پیش کیا۔ ظلِ رسول جو اس افسانے کا اہم کردار ہے کی روح جب اس دارِ فانی میں آکر اپنوں کا مشاہدہ کرتی ہے تب اسے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ اس کے اپنے کوئی نہیں تھے، کوئی ان کا

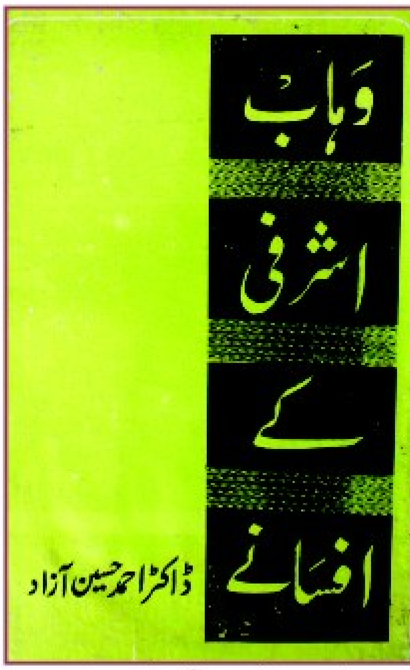


چاہنے والا نہیں تھا، کوئی اس کا غمگسار نہیں تھا بلکہ سارے رشتے دار واحباب صرف اور صرف اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے اس سے قریب تھے۔ اس طرح افسانہ نگار نے زندگی کی انتہائی تلخ حقیقت کو منظرِ عام پر لانے کی سعی کی۔

وہاب اشرفی کا افسانہ 'چھوٹی بہو' خودغرضی اور احسان فراموشی کی مثال ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے چھوٹی بہو کے عادات واطوار اور اس کے اخلاق کو پیش کیا ہے کہ اس کی زندگی میں سبھی لوگ کتنے خوش تھے۔ وہ ہر کسی کو خوش رکھنے کے لیے اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیتی تھی۔ بس! اس میں ایک کمی تھی وہ یہ کہ تمام خوبیوں کے باوجود وہ بانجھ تھی۔

چھوٹی بہو کے مرنے کے بعد اس کے گھر کے تمام افراد غمزدہ ہو جاتے ہیں۔ ساس جو کہ اس کی زندگی میں اس پر اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار رہتی تھی اس کے مرنے کے بعد روتے روتے اس کا برا حال ہو جاتا ہے لیکن جب اسے یہ کہا جاتا ہے کہ تھی تو وہ بانجھ۔ تب وہ رونا بند کر دیتی ہے۔ یعنی چھوٹی بہو کے وہ تمام ایثار وقربانی اور خدمات آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح یہ افسانہ گھریلو زندگی کی ایک تلخ حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے۔

جب ہم وہاب اشرفی کے افسانے 'چھی چھی توبہ توبہ' کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں طبقاتی کشمکش کی حقیقی منظرکشی ملتی ہے۔ موصوف کا یہ افسانہ دومختلف طبقے کی خواتین پر مرکوز ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے ذات پات کو موضوع بنایا ہے۔ یہاں انھوں نے اپنی فنی چابکدستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ خرابیاں اور پستیاں کسی ایک خاص طبقہ ہی میں نہیں ہوتیں بلکہ ایک طرف جہاں 'کم ذات' لوگ کھلے طور پر بدعملی کے مرتکب ہوتے ہیں، وہیں دوسری طرف 'شریف زادی' استانی جی بھی پردے کے پیچھے غلاظت میں لت پت ہوتی ہیں۔ اس طرح موصوف نے صرف ایک طبقے کی برائی کو اپنا موضوع نہیں بنایا ہے بلکہ ادنیٰ اور اعلیٰ دونوں طبقے کی برائیوں کو منظرِ عام پر لا کر سچائی کو واشگاف کر دیا ہے۔

جناب وہاب اشرفی کی جھولی میں کئی ایسے افسانے بھی ہیں جو اپنے انداز اور Concept کے اعتبار سے ہمیشہ یاد رکھنے والے ہیں۔ ایسے افسانوں میں 'گردش میں ہے آسماں' اور 'کھویا ہوا چہرہ' بہت اہم ہیں۔ اپنے مزاج ومنہاج کے اعتبار سے یہ دونوں افسانے اپنی مثال آپ ہیں۔

'گردش میں ہے آسماں' میں آج کی دوڑتی بھاگتی زندگی پر فنی نقطۂ نظر سے تنقید ہے۔ اس افسانے میں آج کے حالات کو ایک دوسری دنیا میں ہزاروں برس بعد دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔

اس افسانے کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہاب صاحب نے اس کے مواد کو اپنے ذہن میں یکجا کرنے میں کتنے خطرے مول لیے ہوں گے۔ کیونکہ یہ اردو میں موضوعی اعتبار سے ایک ایسی تنہا کہانی ہے جو سائنس کی نئی ایجادات پر قدغن لگاتے ہوئے مستقبل میں ان سے جو صورت واقعہ پیدا ہونے والی ہے اس کی پیشن گوئی کرتی ہے۔

'کھویا ہوا چہرہ' وہاب صاحب کا آخری طبع زاد افسانہ ہے۔ یہ افسانہ بھی اپنی نوعیت کی ایک الگ تخلیق ہے۔ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار اپنی ذات کو Asses کرتے ہوئے خود کو پروفروک (ٹی ایس ایلیٹ کی ایک نظم کا کردار) سے بھی کمتر تصور کرتا ہے۔ اسے اپنی اہمیت چائے کی چمچی کے برابر ہونے سے بھی انکار ہے۔

اس طرح یہ کہانی ٹی ایس ایلیٹ کی عقبی زمین میں کھڑی ہے جو افسانہ نگار کی فکری وفنی سطح کو واضح کر رہی ہے۔

'ایک ذرہ ایک پہاڑ' وہاب اشرفی کا ایک ایسا افسانہ ہے جو موضوع کے اعتبار سے انسانی دل سوزی، ایثار وقربانی (خواہ وہ ایثار کسی فرد کے لیے ہو یا ملک کے لیے) وغیرہ کی بہترین مثال ہے۔ اس کہانی کے مطالعے سے ہمیں جو درس ملتا ہے وہ زندگی گذارنے کے لیے نئی تعبیرات پیش کرتا ہے۔ اس کہانی میں فکر وفن دونوں ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ یہ منظر واقعی دیدنی بھی ہے اور وہاب اشرفی کی فنی گرفت پر دال بھی۔

'آبگینۂ تندیِ صہبا' میں وہاب اشرفی نے ایک خاتون کی ذہنی نزاکت ونفاست کو موضوع افسانہ بنایا ہے۔ بظاہر تو یہ رومانی کہانی معلوم ہوتی ہے مگر بعد مطالعہ اس کہانی سے مرد وعورت کے مزاج ومیلان کے بہت سے جذبات واحساسات منظرِ عام پر آ جاتے ہیں۔ خصوصاً جس طرح اس کہانی میں ذی ہوش اور قوی حسیات رکھنے والی عورت کا انجام جیسا نظر آتا ہے ویسا ہی ہونا بھی چاہیے۔ بقول ڈاکٹر ہمایوں اشرف:

"'آبگینۂ تندیِ صبا' تو بظاہر رومانی کہانی ہے لیکن اس میں ایک خاتون کی ذہنی نزاکت اور نفاست کو افسانہ بنایا گیا ہے.. مرد وزن کے مزاج اور میلان کی

"
'گردش میں ہے آسماں' میں آج کی دوڑتی بھاگتی زندگی پر فنی نقطۂ نظر سے تنقید ہے۔ اس افسانے میں آج کے حالات کو ایک دوسری دنیا میں ہزاروں برس بعد دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔
"

خبر دینے والی یہ کہانی بہت سے احساس جگاتی ہے۔ خصوصاً کسی ذی ہوش قوی حسیات رکھنے والی عورت کا انجام بس وہی ہوتا ہے جو اس کہانی میں ہوا ہے۔ کہانی کا قوام ایسا ہے کہ آخری سطریں نیا عالمِ خیال روشن کر دیتی ہیں اور حساس قاری کو دل گرفتہ بنا سکتی ہیں۔"

(فکشن کی بازیافت، ص 193)

ادبی مباحث

'ایک جوٹ، ایک موت' وہاب اشرفی کی ایک الگ نوعیت کی کہانی ہے جس میں موصوف نے ایک دفتر کے افسر جس کا نام ٹوم ہے اس کے غرور اور تیور کو اس طرح دکھایا ہے کہ اس کے آفس کا ایک کلرک تنگ آکر استعفیٰ دے دیتا ہے اور دوسرے کام میں لگ جاتا ہے۔ جہاں سے وہ کچھ پیسہ کما لیتا ہے تب وہ کلرک اپنے سابقہ افسر کو اپنے گھر پر دعوت دے کر بلاتا ہے۔ کلرک اپنے افسر کی خوب خاطر مدارت کرتا ہے یہاں تک کہ اس کی افسری کے قصیدے بھی پڑھتا ہے۔ افسانے کے اختتام پر افسانہ نگار نے دکھایا ہے کہ افسر کو رخصت ہوتے وقت جب کلرک اپنے کتے سے ملاتا ہے اور اس کا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے اس کا نام 'ٹوم' رکھا ہے تو وہ لمحہ اس افسر کے لیے موت سے کم نہیں ہوتا ہے۔ یہ اس کہانی کا زبردست کلائمکس ہے۔

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسانہ بھی در حقیقت ایک الگ نوعیت کا افسانہ ہے۔ اس افسانے کا انداز بھی اور اختتام بھی بہت خوب ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

'کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے' یہ پوری کہانی ایک ایسے کردار کے گرد گھومتی ہے جس کا نام 'افتخار نانا' ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جسے جھوٹ بولنے میں مہارت حاصل ہے۔ وہ سو فی صد جھوٹ بولتا ہے پھر بھی موصوف نے اس کہانی کا عنوان 'کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے' رکھا ہے۔ آخر کیوں؟ اس کہانی کا دوسرا عنوان کیوں نہیں؟ اس سوال کا جواب ڈاکٹر احمد حسین آزاد سے سنیے:

''دراصل یہ عنوان Ironical ہے۔ جس شخص کی تعمیر کی گئی ہے، وہ جھوٹ بولنے میں ایسا طاق ہے کہ اس کی مثال ملنی محال ہے... چنانچہ ایسی صورتحال پیدا ہوتی ہے کہ اس شخص سے اس کی اس علت کے باعث نفرت نہیں ہوتی بلکہ اس سے ہمدردی کا جذبہ بیدار ہونے لگتا ہے۔ دراصل مرکزی کردار نفسیاتی مریض ہے اور جھوٹ بول کر کسی کو ضرر پہنچانا نہیں چاہتا بلکہ یہ شدید احساس کمتری کی کتھارسس کرتا ہے۔''

(وہاب اشرفی کے افسانے، مرتبہ ڈاکٹر احمد حسین آزاد، ص 18)

'مسیحا کہیں جسے' وہاب اشرفی کا ایک دلچسپ افسانہ ہے جو جنس پسندی کے رجحان پر مبنی ہے۔ یہ کہانی مارکسی نظریے، امریکی نظریے اور مذہبی نظریے کے تصادم سے آگے بڑھتی ہے۔ افسانہ نگار نے اس کہانی میں دکھایا ہے کہ تینوں نظریوں کا علمبردار اپنے اپنے نظریے کی صداقت کے اظہار میں اتنے پرجوش ہو جاتے ہیں کہ معاملہ قتل و غارت گری کی حد تک پہنچنے والا ہو جاتا ہے کہ ہوٹل میں مارتھا نام کی ایک رقاصہ کا داخلہ ہو جاتا ہے۔ جس سے تینوں اپنے تمام فلسفے بالائے طاق رکھ کر اپنا موضوع گفتگو مارتھا کے حسن و جمال کو بنا لیتے ہیں۔

'آخری لاش' وہاب اشرفی کی رقم کردہ ایک المناک کہانی ہے۔ یہ ایک ایسے غریب گورکن کی کہانی ہے جو بیٹی کی شادی کے لیے جہیز جمع کرنے میں منہمک ہے۔ اتفاق سے علاقے میں ہیضہ پھیل جاتا ہے اور گورکن کی آمدنی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب صرف اس کے پاس اتنی ہی رقم کم ہوتی ہے جتنی ایک قبر کی کھدائی سے ملتی ہے۔ وہ انتظار کرتا ہے اور خوش بھی ہوتا ہے کہ اب اس کی بیٹی کی ڈولی اٹھ جائے گی مگر مرضیِ مولا کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ آخری لاش جو آتی ہے وہ اس کے ہونے والے داماد کی تھی۔ ایسا کربناک انجام اس کہانی کا کلائمکس کہ جسے پڑھ کر افسانہ نگار کی فنکاری کی داد دینی پڑتی ہے اور دل کو غموں کے سمندر کے حوالے بھی کر دینا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہاب صاحب کی یہ کہانی المناک تو ہے مگر اصلاحی بھی ہے۔ افسانہ نگار نے بین السطور میں جہیز کی لعنت اور انسان کی خود غرضی کو ہدفِ ملامت بناتے ہوئے افسانے میں کمالِ فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے جس سے قاری کو کہیں بوریت نہیں ہوتی۔

ان کے علاوہ وہاب اشرفی کی کہانی 'چراغ پرانا، شمع نئی' خالص اصلاحی نوعیت کی کہانیاں ہیں اور 'اپنی اپنی راہ' خود غرضی کی ایسی کہانی ہے کہ جس کے بین السطور میں فلمی صحافت پر جا بجا طنز کے نشتر چبھوتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح 'پچیسویں قلوپطرہ' ایک مرد کی رزالت کی کہانی ہے اور 'علاجِ غم' نفسیاتی کہانی۔ 'تبسم کی لکیر' میں افسانہ نگار نے مشرق و مغرب کے تضاد کو موضوع بنایا ہے اور 'کوئی غمگسار ہوتا' موصوف کی ایک مفلس، بے بس اور بے کس ماں کی کہانی ہے۔ 'ستی ساوتری' الٹرا ماڈرن عورتوں کو مکدر کر دینے والی کہانی ہے۔ 'ایک سایہ' میں رومانس کے ساتھ ساتھ مزاح کا رنگ بھی غالب ہے۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ہر اعلیٰ ادب کے اندر فنکار کا مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ فنکار کا مقصد اس کے فن میں اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ اسے علیٰحدہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہاب اشرفی بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے مقصد کی پیشکش میں انھوں نے عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ان کی کہانیوں میں ہر جگہ کہانی پن موجود ہے۔ ان کے افسانوں میں جذبات اور سنجیدگی کا متوازن اظہار ہے۔ انھوں نے فقروں اور جملوں کو چست و درست بنانے کی غرض سے بعض جگہ تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس طرح پلاٹ سازی، کردار نگاری، ماجرا سازی اور مکالمہ نگاری کے لحاظ سے بھی وہ اردو کے ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ ان کے یہاں سماجی احوال و کوائف پر بھی نظر خاص ہے۔ ساتھ ہی جمالیات کے تقاضوں پر بھی۔ لہٰذا ان کے افسانوں کو اردو کے بڑے افسانوں کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہاب اشرفی نے اپنے 7-8 سالہ افسانوی سفر میں متعدد خوبصورت افسانے اردو ادب کو عطا کیے۔ لہٰذا! موصوف کی افسانوی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

■

''
'آخری لاش' وہاب اشرفی کی رقم کردہ ایک المناک کہانی ہے۔ یہ ایک ایسے غریب گورکن کی کہانی ہے جو بیٹی کی شادی کے لیے جہیز جمع کرنے میں منہمک ہے۔ اتفاق سے علاقے میں ہیضہ پھیل جاتا ہے اور گورکن کی آمدنی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔
''

**Dr. Faheem Ashraf**
Maulana Azad National Urdu University
Model School
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.:9785265771
f.ashraf777@gmail.com

محمد فرحت حسین

# جیون داس کی مثنوی پر ایک نظر

جگ جیون داس ولد رتی رام مردم خیز صوبہ بہار کے رہنے والے تھے، یعنی یہ بہار کے ان ہندو شعرا میں سے ایک تھے جنھوں نے اردو کو اپنے وطن کی خوبصورت اور شیریں زبان سمجھ کر اپنایا اور اس کی عظیم خدمات انجام دے کر اس کی حفاظت کا سامان کیا۔

'خوشحال صبیان' ان کی بہت وقیع مثنوی ہے، جو انھوں نے مبتدیوں کے لیے لکھی تھی، کیونکہ اس کے نام کا جزء ثانی 'صبیان' اس بات پر دال ہے کہ یہ تالیف انیق نو آموز طلبا کے لیے مرتب کی گئی تھی جس میں مترادفات و متضادات کو خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

پھر مولف نے سیکڑوں الفاظ اور ان کے معانی بڑی سادگی سے بیان کیے ہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف لفظ کا معنی مختلف زبانوں میں ان کے تضاد کے ساتھ پیش کیا ہے جو کہ درست بھی ہے۔ لیکن غور وفکر سے کام لیں تو معلوم ہوگا کہ صرف معنی ہی بیان نہیں کیا ہے بلکہ الفاظ کی صحیح نشست و برخاست، حسن ترتیب اور فنی چابکدستی و ہنرمندی سے ایک اہم معنی اور عقیدے سے جڑا ایک اہم معاملہ رمز و کنایے کے لبادے میں بیان کیا ہے۔

مثلاً حقیقت میں خدا ایک ہے لیکن بت خانے میں مٹی یا پتھر کی رکھی ہوئی مختلف مورتیاں اس کے اوتار ہیں جس کی پرستش بندے کرتے ہیں۔ اسی طرح منڈپ کی آگ کو لوگ طاقتور مان کر پوجا کرتے ہیں اور اس کو گواہ بنا کر ساتھ جینے مرنے کی قسمیں بھی کھاتے ہیں۔ جیسے

واحد ایک ثانی دوجا　　　بت خانہ منڈف پرست پوجا

اس مذکورہ بالا شعر میں بظاہر لفظوں کے معانی بیان کیے ہیں لیکن لفظوں کی نشست و برخاست اور حسن ترتیب نے ایک دوسرے معنی کا احتمال پیدا کیا جو کہ قرین قیاس ہے، ملتے جلتے الفاظ کے درست استعمال سے ایک نیا پہلو سامنے آیا جو کہ دور از قیاس نہیں۔

محولہ بالا شعر میں عربی کے الفاظ 'واحد، ثانی' فارسی کے 'بت خانہ، پرست ہندی کے پوجا، سنسکرت کے 'دوجا، منڈف' ہیں جو کہ شعر کے حسن کو دوبالا اور چاشنی میں اضافہ کرتے ہیں۔ شاعر نے اس شعر میں چار مختلف زبانوں کے الفاظ بحسن وخوبی استعمال کر کے جہاں اپنے زور بیان کا ثبوت دیا ہے، وہیں اپنی علمی و ادبی صلاحیت کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔

ذیل میں چند مزید اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوگا کہ کس خوبصورتی سے مختلف زبان کے الفاظ کو ایک ہی شعر میں موصوف نے یکجا کیا ہے اور اپنی فنی پختگی کا ثبوت دیا ہے؛ ملاحظہ ہو

لجام لگام ہے کردار　　　صارم تیغ دو ہے تلوار
مجن ڈھال ہے قوس کمان　　　سہم تیر جو کھانڈ بکھان
درع زرہ ہندوی سلاہ　　　معاذ بلجا سرن پناہ
راس سر جو کہیے ماتھا　　　جارحہ دست ہندوی ہاتھا
دراج بٹیر سلفات کچھوا　　　حوت گیر کو کہیے مچھوا
ظبی آہو ہندوی ہرن　　　تراب قدم و سور ہے چرن
حوض پوکھر چاہ کنواں　　　سرمہ کاجل دود ہے دھواں
خون لہو الماس ہیرا　　　بیت خانہ کو کہیے ڈیرا
نعلین کھڑاون چوبدست لاٹھی　　　چارپائی کھاٹ خرابات بھاٹی

صنائع لفظی و معنوی کا صرف انھیں علم ہی نہ تھا بلکہ ان کے صحیح استعمال سے بھی بخوبی واقف اور باخبر تھے۔ ایک اہم بات بتادوں کہ شاعری کا اصل مقصد صنائع بدائع کا استعمال نہیں ہے، لیکن یہ شاعری کے زیور کا کام کرتے ہیں ان کے استعمال سے شعر کی تاثیر اور خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً

ترش کھٹا شیریں میٹھا　　　شور کھارا بے مزہ ہے سیٹھا

اس شعر میں ایک خوبصورت صنعت 'صنعت تضاد' کا استعمال شاعر نے بحسن وخوبی کیا ہے جو حسن شعر کے ساتھ اثر انگریزی کا باعث ہے۔ دوسری صنعت، مراعاۃ النظیر ہے، یہ بھی شعر کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث ہے اور یہی شعر کا حسن ہے۔

خوشحال صبیان سے مزید اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن میں اس صنعت تضاد کا استعمال کیا گیا ہے اور موزوں طریقے سے اس کو برتا گیا ہے۔

کہتر چھوٹا فربہ موٹا　　　لاغر دبلا استیارہ بھروتا
برنا جوان ترنا جان　　　پیر ضعیف بوڑھا پہچان
عروس کنواری خام ہے کاچا　　　پختہ پا کا رقص ہے ناچا
کسوف خسوف ہندوی گہنا　　　ویران اجاڑ آباد بسنا
پوشیدہ ڈھانکا برہنہ ننگا　　　معذوری زحمت صحت ہے چنگا
فلک آسمان ارض ہے دھرتی　　　مزروعہ حاصل افتادہ پرتی
قریہ گاؤں زمستاں ہے جاڑا　　　بلدہ شہر دفن ہے گاڑا

مثنوی نگار نے اس صنعت کا بڑی ہنرمندی سے اشعار میں استعمال کیا ہے اور حسن

ولطف کا جہان آباد کیا ہے جس کے سبب شعر کی نزاکت، لطافت ومتانت اپنے کمال پر ہے اور ایسا کر کے مثنوی نگار نے ذوق جمال کی تسکین کا سامان فراہم کیا ہے۔ یہی خوبی انھیں دوسروں سے الگ اور ممتاز کرتی ہے۔

خلد بہشت جنت جان    سقر جہنم دوزخ مان

محولہ بالا شعر میں صنعت مقابلہ سے جو خوبی اس میں پیدا ہوئی ہے وہ ظاہر ہے، بتانے کی حاجت نہیں۔

تجنیس بھی ایک ایسی صنعت ہے جس میں الفاظ شکل وصورت اور تلفظ میں ایک جیسے ہوتے ہیں، لیکن وہ معنی کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس صنعت کا شعر میں برتنا گویا شعر میں ایک بڑی خوبی کا پیدا کرنا ہے کیوں کہ تکرار صورت سے شعر میں حسن پیدا ہوتا ہے اور کانوں پر نہ گراں گزرتا ہے اور نہ بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے، بلکہ اس سے ذوق جمال کی تسکین ہوتی ہے۔

مثنوی نگار جگ جیون داس نے اس صنعت کا استعمال بڑی حوبی اور عمدگی سے کیا ہے۔

زنجبیل ادرک زرد چوب ہلدی    گو گرد گندھک ٹھنڈک سردی
ضیافت مہمانی کہیے    خلعت سراپا عنایت کہیے
کنیز باندی جو کہیے دائی    تارک چاندی کوشش سائی
بحرو دریا کو کہیے سموند    نوشیدن پینا قطرہ بوند

صنعت مراعاۃ النظیر جسے تناسب، توفیق، تلفیق بھی کہتے ہیں اور معمولی بول چال میں یہی صنعت ضلع جگت کے نام سے مشہور ہے؛ اس کو بھی انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے برتا ہے اور اس کے باعث کلام کا رنگ نہایت ہی خوشنما، دلچسپ وپُرفریب ہو گیا ہے۔ مثال سے واضح ہوگا ملاحظہ کریں۔

عسکر، سپاہ لشکر جان    ظفر نصرت فتح کو مان
شمس آفتاب سورج بھان    اختر ستارہ تارہ جان
حلبہ میتھی سونف بادیان    اجمودہ اجوائن کشنیزہ دھنیا
جولان بیڑی اسیر بند جان    فیل ہاتھی مہاوت فیلبان
وجہ روے جو کہیے مونھ    سلبت مونچھ ابرو بھونھ
زبدہ سکہ جو کہیے ماکھن    شیر دودھ چشیدن چاکھن
خسر سسر خس پورہ سالہ    خوشدامن ساس گوپ گوالا
بحرو دریا کو کہئے سموند    نوشیدن پینا قطرہ بوند

ایہام وتوریہ، ایسی صنعت ہے جسے ایک قادرالکلام پُرمغز شاعر، بہترین سخنور اور خوش بیاں نکتہ سنج بڑی عمدگی سے کلام میں استعمال کر کے شعر کی زینت بنا سکتا ہے جس کے باعث صحیح معنوں میں شعر کا حسن اور کلام کا جمال اور نکھر کر سامنے آئے گا اور اس کی سحرانگیزی بڑھ جائے گی۔ مثنوی نگار نے اس صنعت کا بھی بڑی ہنرمندی سے استعمال کیا ہے۔

عقد گرہ جو کہیے نکاح    شادی خوشی ہندوی بیاہ

لفظ شادی کا ایک معنی نکاح اور بیاہ ہے جو کہ قریب ہے اور یہ معنی قاری یا سامع کی سمجھ میں جلد آئے گا وہیں اس کا دوسرا معنی 'فرحت وانبساط' ہے یعنی اندرونی خوشی جس کا اثر باہر نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے؛ اور یہی معنی شاعر کا مقصود ہے۔

مختصر یہ کہ 'گنجینۂ معانی' پر مشتمل خالص علمی مثنوی 'خوشحال صبیان' میں اس فن کی روایت ودرایت کی پابندی بحسن وخوبی کی گئی ہے۔ الفاظ کی صحیح نشست وبرخاست، عمدہ تراکیب اور ان کی خوبصورت ترتیب سے جو لطف شاعر نے پیدا کیا ہے وہ کمال ہے۔

لیکن ساتھ ہی مثنوی نگار نے کہیں کہیں وزن شعر کو برقرار رکھنے کے لیے کسی حرف کا اضافہ کیا ہے جس سے پھوہڑپن بھی پیدا ہو گیا ہے جو کہ عیب ہے، کیوں کہ وہاں شعر کا حسن اور اس کا اثر دونوں مفقود ہے۔ مثلاً

کنیز باندی جو کہیے دائی    تارک چاندی کوشش سائی

سائی اصل میں سعی ہے، یہاں پر صرف وزن کو برقرار رکھنے کے لیے الف کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح بعض مقام پر کسی لفظ کو قافیہ اور وزن سے ہم آہنگ کرنے کے لیے، غلط املا میں لکھا گیا ہے۔ یہ کلام میں غلطی قاعدے کی خلاف ورزی اور بعض دفعہ عجز بیان کی طرف اشارہ کرتا ہے، مثال سے واضح ہوگا۔

جرس گھنٹہ خلخال چوڑا    حسن خوب بھلا بدبورا
عروس کنواری خام ہے کاچا    پختہ پا کا رقص ہے ناچا
کسوف خسوف ہندوی گہنا    ویران اجاڑ آباد بسنا
خلاف جھوٹ یقین ہے سہی    زوال بڑنج چوڑا جغرات دہی
مغرب پچھم مشرق پوروب    شمال اتر دکھن جنوب

پہلے شعر میں برا کی جگہ بورا، واو کے ساتھ ہے جو کہ صرف وزن کے لیے ہے ورنہ بد کا معنی بُرا با کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ شعر دوم میں کچا کی جگہ کاچا، گہن کی جگہ گہنا، چہارم میں صحیح کی جگہ سین سے سہی، پنجم میں پورب کی جگہ پوروب را کے بعد واو کے اضافہ کے ساتھ یہ سب وزن کو برقرار رکھنے، قافیہ سے ہم آہنگ کرنے کے لیے حروف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ خوبی کے بجائے خامی، کمال کے بجائے نقص اور حسن کے بجائے عیب ہے۔ ان بعض خامیوں کے باوجود یہ مثنوی بے مثال، ممتاز اور منفرد ہے جس میں زبان صاف، شستہ اور فصیح ہے، زور بیان عمدہ ہے، لطافت وشیرینی ہے، علاوہ ان سب کے اس میں جدت ہے۔ الفاظ کے معنی کو مختلف زبانوں میں نظم کی ہیئت اور خوبصورت پیکر میں بیان کرنا یقیناً قابل تعریف ہے۔ ان کی اس منفرد تالیف نے اردو۔ فارسی زبان وادب کی ترویج وارتقا میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور ان کی جداگانہ محنت اور عظیم خدمت انہیں بہار کے ان ہندو شعرا کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جن کا نام زبان وادب کے حوالے سے بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

**حوالہ جات**


1 خوشحال صبیاں، مصنف جگ جیون داس، ناشر: ناز بک ڈپو، کلکتہ 3

2 مقدمہ شعروشاعری، از الطاف حسین حالی، مطبع مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ص 202


■


**Mohd Farhat Husain**
Research Scholar, Dept of Urdu
B R A, Bihar University
Muzaffarpur- 842001 (Bihar)

ادبی مباحث

سید انوار صفی

# اودھ کے ایک مشہور فارسی شاعر
# شاہ تراب علی قلندر

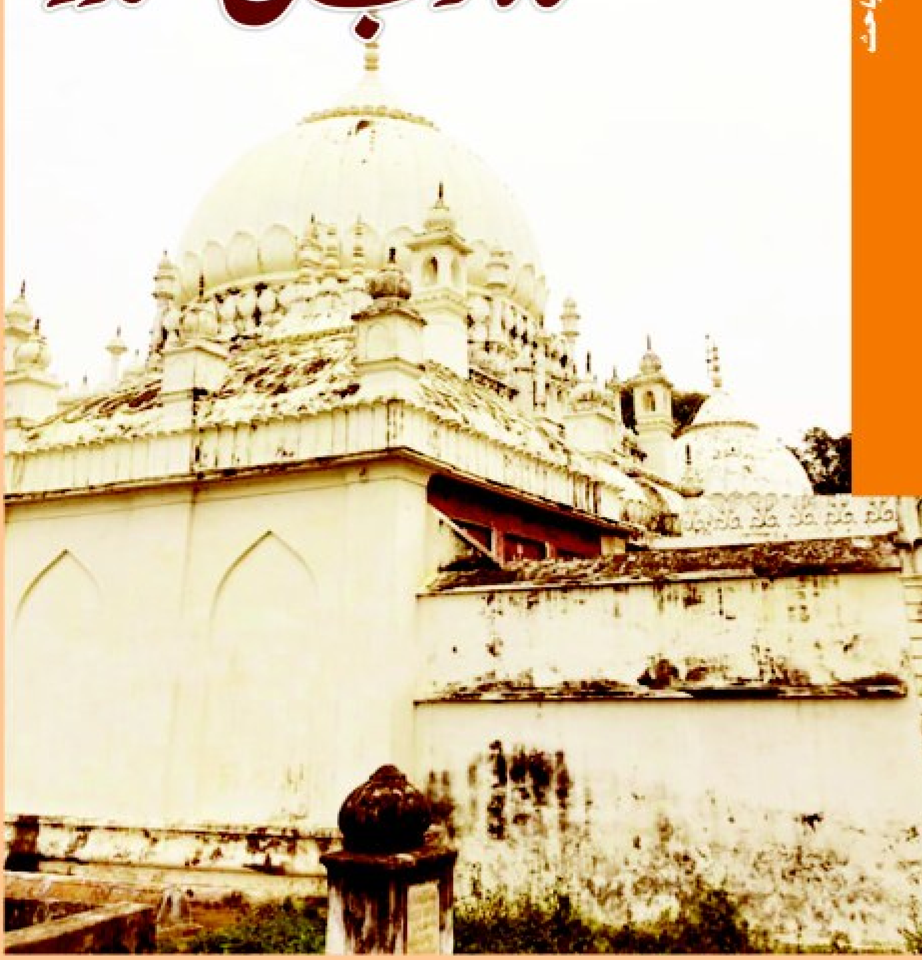

**ہندوستان** ایک کثیر لسانی ملک ہے، جہاں ذیلی علاقائی زبانوں کے علاوہ ایک درجن سے زائد ایسی زبانیں بولی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں اور ہر زبان اپنے آپ میں مستقل تاریخ اور روایت کی آئینہ دار ہے۔ موجودہ ہندوستان کے جغرافیائی علاقوں میں بطور خاص ہندی، اردو، پنجابی، گجراتی، مراٹھی، تیلگو، ملیالم، کنڑ، اڑیہ اور بنگلہ زبانیں رائج ہیں، غرضیکہ ہر ریاست تقریباً اپنی جداگانہ زبان اور تہذیب وثقافت رکھتی ہے اور تجارتی نیز دیگر کچھ امور کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ایک بڑے طبقے کے درمیان انگریزی زبان کا چلن ہے۔

انگریزی بلاشبہ غیر ملکی زبان ہے تاہم باشندگان ہند کا بڑا پڑھا لکھا اور ترقی یافتہ طبقہ بڑے شوق اور فخر سے اسے بولتا اور لکھتا ہے۔ اس طرح فارسی زبان ہے، جسے صدیوں تک اس ملک کے طول وعرض میں بلا تفریق رنگ ونسل اور بلا امتیاز مذہب وملت عام چلن پانے کا اعزاز حاصل رہا ہے، بلکہ مغل دور حکومت میں اسے باضابطہ سرکاری زبان ہونے کا درجہ بھی حاصل تھا اور آج بھی ڈیڑھ صدی گزرنے کے بعد اس کی بہت سی اصطلاحات اور محاورے جوں کا توں مستعمل ہیں اور ملک کی دانش گاہوں اور تعلیمی اداروں میں ایک فن کی حیثیت سے فارسی زبان وادب کی تعلیم جاری ہے۔

الغرض سرزمین ہند سے فارسی زبان وادب کے عروج وارتقا کی ایک سنہری تاریخ وابستہ ہے۔ یہاں فارسی کے ایسے ایسے نامور علما، شعرا اور ادبا گزرے ہیں جن پر اہل ایران کو بھی رشک آتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف خطوں، صوبوں، شہروں اور مردم خیز قصبات میں بہ کثرت علما اور صوفیا باقاعدہ صاحب دیوان شاعر اور ادیب تھے، ان مردم خیز قصبات میں ایک قصبہ کاکوری بھی ہے جو دارالسلطنت لکھنؤ سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر مغرب جانب واقع ہے۔ کاکوری شریف اولیاء اللہ کی سرزمین ہے، اور یہاں خانقاہ کاظمیہ قلندریہ موجود ہے۔ کاکوری اردو اور فارسی کا مرکز رہا ہے، یہاں نامور شعرا ہوئے ہیں، مشہور نعت گو شاعر محسن کاکوروی، نوراللغات کے مصنف نورالحسن نیر اور صحافی شمس الرحمٰن علوی کا تعلق یہیں سے ہے۔ موجودہ جغرافیائی نقشے کے اعتبار سے یہ لکھنؤ کے قریب ایک قصبہ ہے۔ وکی پیڈیا لکھتا ہے: یہ صوبہ اتر پردیش کے اودھ علاقے کا اہم قصبہ ہے، کاکوری ہندوستان کی جنگ آزادی کے لیے بھی جانا جاتا ہے، یہیں بسمل اور اشفاق اللہ خان نے انگریزی خزانہ لے جانے والی ٹرین پر حملہ کیا تھا اور بعد میں ان کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔ اسی قصبے سے تعلق رکھنے والی ایک مشہور ومعروف ذات شاہ تراب علی قلندر کی ہے۔

آپ کی پیدائش 1181ھ مطابق 1768 میں قصبہ کاکوری میں ہوئی۔ آپ نسبی اعتبار سے علوی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔

> سرزمین ہند سے فارسی زبان وادب کے عروج وارتقا کی ایک سنہری تاریخ وابستہ ہے۔ یہاں فارسی کے ایسے ایسے نامور علما، شعرا اور ادبا گزرے ہیں جن پر اہل ایران کو بھی رشک آتا ہے۔

آپ کا نسب نامہ اس طرح سے ہے:

''شاہ تراب علی بن شاہ محمد کاظم قلندر بن حضرت شاہ محمد کاشف چشتی بن حضرت شیخ حافظ خلیل الرحمٰن شہید بن شیخ عبد الرحمٰن بن حضرت شیخ غلام محمد بن حضرت شیخ سیف الدین بن حضرت شیخ ضیاء اللہ بن حضرت شیخ ملا عبد الکریم قدس سرہ بن حضرت حافظ شہاب الدین عرف سوندھن بن حضرت مخدوم نظام الدین قاری قادری معروف بہ شاہ بھیکا کاکوری بن حضرت قاری امیر سیف الدین بن حضرت ابوالقاسم محمد الحنفیۃ بن سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ۔

والدہ ماجدہ کی طرف سے شاہ تراب قلندر کا نسبی تعلق ہندوستان کے مایہ ناز عالم ربانی حضرت ملا احمد جیونؒ سے ہے، جن کا سلسلۂ نسب خلیفۂ اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔

آپ نے ایسے گھرانے میں آنکھیں کھولیں جو علم وفضل کا گہوارہ اور زہد وتقویٰ کا مخزن تھا، جیسا کہ آپ کے شجرۂ نسب میں درج بزرگوں کے اسما سے ظاہر ہے۔ آپ کی ذات ان منتخب اشخاص میں تھی جو کمالات اور اوصاف کا ایک زندہ معجزہ اور روشن نشانی تھے، آپ کے ظاہری باطنی کمالات نے آپ کو اپنے ہم عصروں میں ایک امتیازی درجہ دے رکھا تھا، جس کو مورخین اور سوانح نگاروں نے اپنی اپنی تصنیفات میں قلم بند کیا ہے۔

صاحب اذکار الابرار آپ کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''بچپن سے تحصیل علم وفضل میں منہمک اور صلاح وتقویٰ سے آراستہ تھے اور بسبب حسن ادب واستعداد کے حضرت عارف باللہ (والد محترم شاہ محمد کاظم قلندرؒ) کے محبوب ومقبول تھے۔ سات برس کی عمر سے تعلیم شروع کردی۔ ذکر سہ پایہ ونماز تہجد جبھی تعلیم فرمائی جب بارہ برس کے ہوئے اور تکیہ پر رہنے لگے تو آپ کے ذہن واستعداد کی رسائی ملاحظہ فرما کر اسی وقت سے حضرت عارف باللہ نے تصوف کی تعلیم شروع کردی اور آپ کو تیسیر الاحکام مصنفہ شہاب الدین ملک العلما اور زاد الآخر اور منہاج العابدین وکیمیاے سعادت وتصانیف حضرت شاہ ولی اللہ محدث پڑھائیں اور برابر اخلاق وتصوف خصوصاً مسائل معرفت وتوحید کی زبانی وعملی تعلیم بھی فرماتے رہے اور امتحاناً کبھی کبھی توحید کے متعلق سوالات بھی کرتے اور حسب دل خواہ جواب سن کر بہت خوش ہوتے تھے، ایک بار آپ نے عرض کیا کہ حقیقت ومعرفت توحید کا مجھ کو ایسا یقین ہو گیا ہے جو کسی اعتراض سے جا نہیں سکتا، آپ کا یہ طریقہ تھا کہ حضرت عارف باللہ جب کسی کو کوئی نماز یا دعا بتاتے تھے تو آپ سن کر یاد کر لیتے تھے۔''[1]

قدرت نے بے شمار خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ شعر و شاعری کا ملکہ بھی آپ کی ذات میں ودیعت کر رکھا تھا، یہ جوہر بھی دیگر جواہر کی طرح خوب نکھر کر سامنے آیا اور سخن وری کی دنیا میں آپ کا نام آفتاب نصف النہار کی طرح آشکار کر گیا۔ آپ نے فارسی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں میں طبع آزمائی فرمائی، اور تینوں زبانوں میں صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔

آپ کی تعلیم وتربیت میں سب سے اہم کردار آپ کے والد ماجد کا ہے، اس اعتبار سے وہی آپ کے اول اور اعظم استاذ ومربی ہیں، ان کے علاوہ جن حضرات علما سے آپ نے اکتساب علم وفن کیا ان کا تذکرہ پروفیسر عمر کمال الدین صاحب نے اس طرح کیا ہے:

''ابتدائی تعلیم ملا قدرت اللہ بلگرامی خلیفہ خاص حضرت عارف باللہ اور مولوی معین الدین بنگالی سے حاصل کی، بقیہ درسیات ملا حمید الدین محدث کاکوروی سے پڑھے، فن عروض قاضی القضاۃ نجم الدین علی خان بہادر ثاقب کاکوروی سے اور فقہ مولوی فضل اللہ ساکن نیوتنی سے پڑھی۔''[2]

آپ کے اولین شیخ آپ کے والد ماجد ہی ہیں والد محترم شاہ محمد کاظم قلندر نے بچپن ہی میں اجازت وخلافت سے سرفراز کر دیا تھا۔ تقریباً پندرہ سال کی عمر میں ہی آپ تحصیل علوم وفنون اور مراحل ریاضت ومجاہدے کی تکمیل سے فارغ ہو گئے تھے اور اسی وقت سے خدمت خلق اور بندگان خدا کی اصلاح وارشاد میں لگ گئے تھے۔ آپ کے تذکرے میں موجود ہے کہ والد محترم کے زمانے سے ہی آپ عائلی اور خانقاہی امور کے ذمے دار بنا دیے گئے تھے۔ صاحب تذکرہ گلشن کرم لکھتے ہیں:

''پندرہ سال کی قلیل عمر میں تمام مراتب ارشاد وتلقین سے فارغ ہو گئے، غرض کہ استعداد خداوندی، خوش نصیبی اور توفیق الٰہی میں مخلوط ہو کر وہ شان پیدا کر لی کہ کم سنی میں ہی ان تمام دشوار گزار مراحل سے گزر گئے جو ہر سالک کے لیے ناگزیر ہیں، والد بزرگوار نے فرزند رشید کی عبادات واشغال میں محویت ملاحظہ فرمائی تو کاروبار خانقاہی وخانہ داری سپرد فرما دیے، حتیٰ کہ شجرہ نویسی کی اہم خدمت بھی۔''[3]

باضابطہ مسند نشینی والد ماجد کے وصال کے بعد ہوئی، اس وقت آپ کی عمر چالیس سال تھی، پھر مسلسل 54 سال تک مسند ارشاد پر متمکن رہے۔

آپ نے علمی، خانقاہی اور دیگر ضروری مشاغل کے ساتھ عبادت وریاضت میں انتہائی انہماک کے باوجود اپنے اشہب قلم سے علوم وفنون کی دنیا کو بیش قیمت سرمایے عطا کیے ہیں۔ آپ کی جملہ کتابیں اہم اور مفید ہیں، جن کی افادیت واہمیت رہتی دنیا تک کم نہیں ہوگی۔ اس مقالے میں آپ کی تمام تصنیفات سے تعرض مقصود نہیں ہے، صرف آپ کی فارسی شاعری کا قدرے تفصیلی تذکرہ پیش کیا جاتا ہے۔

قدرت نے بے شمار خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ شعر وشاعری کا ملکہ بھی آپ کی ذات میں ودیعت کر رکھا تھا، یہ جوہر بھی دیگر جواہر کی طرح خوب نکھر کر سامنے آیا اور سخن وری کی دنیا میں آپ کا نام آفتاب نصف النہار کی طرح آشکار کر گیا۔ آپ نے فارسی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں میں طبع آزمائی فرمائی، اور تینوں زبانوں میں صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔

آپ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے گلشن کرم کے مصنف لکھتے ہیں:

''آپ نے شاعری کو نہ نام ونمود کا ذریعہ بنایا اور نہ کبھی اہل نظر سے داد کے متمنی ہوئے، محض اپنی تسکین خاطر کے لیے اپنی معنوی صلاحیتوں سے راستے کی آمد

ورفت میں الہامی اور ماورائی طرز فکر کو اپنایا۔''[4]

پروفیسر عمر کمال الدین صاحب لکھتے ہیں:

''واہب العطایا نے آپ کو شعر وسخن کا کافی ذوق دیا تھا۔ آپ کا کلام فارسی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں میں ہے۔ آپ قصبہ کے واحد خوش نصیب شاعر ہیں جس کے اردو، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں دیوان شائع ہوئے۔''[5]

آپ نے شاعری کب شروع کی اس بارے میں ڈاکٹر شبیب انور علوی لکھتے ہیں:

''از احوال شعر سرودن ایشاں در کتابہا ایں نکتہ معلوم نمی شود کہ از کدام عمر آغاز کردا الا ایں کہ از عبارت پسر خرد شاں شاہ تقی علی قلندر اشارت می شود کہ در دورہ اے تحصیلات مقدمات تصور شعر گفتن آغاز کرد۔''[6]

(آپ کی شعر گوئی کی ابتدا کب سے ہوئی اس کے بارے میں کتابوں سے کچھ پتہ نہیں چلتا لیکن آپ کے چھوٹے صاحبزادے کی ایک عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے زمانے سے ہی شعر گوئی شروع کر دی تھی۔)

آپ کی شاعری کے تعلق سے ایک پرلطف روایت یہ ملتی ہے کہ آپ نے اپنی شاعری پر کسی سے اصلاح نہیں لی اور شعر اپنے ہاتھ سے لکھتے بھی نہیں تھے اور یہ کہ تکیہ شریف پر کوئی شعر نہیں لکھتے تھے، فقط آتے جاتے کہہ لیا کرتے تھے۔

چنانچہ صاحب اذکار الابرار لکھتے ہیں:

''آپ نے نہ کبھی کسی کو اپنا کلام دکھایا نہ اصلاح لی اور نہ کبھی کوئی شعر تکیہ شریف پر نظم کیا بلکہ جب بستی میں تشریف لے جاتے تھے تو آنے جانے میں دو غزلیں کہہ لیا کرتے تھے اور تکیہ شریف پر آکر مولوی عبدالباسط خلف حضرت شاہ رحیم باسط کو سنا دیتے تھے وہ لکھ لیتے تھے۔''

لیکن بمطابق صاحب تذکرہ گلشن کرم ''اپنے ہاتھ سے نہ لکھنے کا معاملہ فارسی شاعری کے ساتھ نہ تھا بلکہ فارسی کلام وہ اپنے ہاتھ سے خود لکھا کرتے تھے۔''[7]

اذکار الابرار کے مولف لکھتے ہیں:

''قسام ازل نے شعر وسخن میں بھی آپ کو کافی حصہ دیا تھا، ابتدا میں شہید تخلص تھا پھر تراب ہو گیا۔''

شروع میں آپ نے شعری تخلص کے لیے 'شہید' کا انتخاب کیا، مگر بعد میں جب بزم و رزم میں قابلیتوں اور موشگافیوں کے جوہر کھلے تو 'تراب' سے مشہور ہو

گئے۔ چنانچہ منشی رحمن علی اور شیخ عبدالحی لکھنوی وغیرہ تذکرہ نگاروں نے آپ کا نام تراب علی ہی لکھا ہے۔[8]

آپ کی شاعری محض زبانی جمع خرچ نہیں بلکہ نظری کے ساتھ عملی بھی ہے، آپ کا کلام تفکر و تعقل کے ان نتائج کا مجموعہ ہے جس میں گوناگوں بیانات کے دوش بدوش عالم ملکوت و لاہوت کے وہ مخفی امور اور دنیائے روحانیت کی بدیہی باتیں نظم کی گئی ہیں جو ضمیر کو آلائشوں سے پاک کرتی ہیں، معاصر شعرا اگر جگ بیتی بیان کرتے ہیں تو آپ نے آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں بیان کی ہے۔ آپ کی شاعری کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے، جو نہ کسی کی اصلاح سے پروان چڑھی اور نہ نقد و نظر و تبصرے سے، یہ صرف اس سحر حلال کا کرشمہ تھا جس نے 'نگارمن کہ بمکتب نہ رفت و خط نوشت' کو 'بہ غمزۂ مسئلہ آموز صد مدرس شد' کا جامۂ رنگین زیب تن کر دیا تھا، اس لیے آپ کی شاعری میں تعلیمات، حقائق و معارف، حسن اخلاق اور طرز معاشرت کا حسین مرقع نظر آتا ہے۔

شاہ تراب کی شاعری میں سلاست، بلاغت اور روانی پائی جاتی ہے، ان کے اشعار میں زیادہ تر اہل معرفت بزرگ شعرا جیسے مولانا رومی، حافظ شیرازی، شیخ سعدی، امیر خسرو، عراقی اور جامی کی عرفانی شاعری کی جھلک ملتی ہے، ان اشعار میں مذکورہ شعرا کی باطنی و عرفانی کیفیات، عشق حقیقی کے جذبات اور حال و مقام کی جلوہ گری نظر آتی ہے، چونکہ اس مختصر سی تحریر میں زیادہ نقد و تجزیے کی گنجائش نہیں اس لیے چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شاہ تراب کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اشعار تین بنیادی موضوعات میں منقسم ہیں:

1 اخلاق وحکمت والے اشعار

2 عرفانی اشعار

3 عشق و عاشقی والے اشعار

شاہ تراب کی شاعری میں بہت سارے اشعار اخلاق اور حکمت والے ہیں، جو رومی اور سعدی کے اشعار میں تتبع کرنے سے نظر آتے ہیں، چونکہ معرفت، تصوف، اخلاق اور ادب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اسی لیے آپ کے اشعار میں بہت سارے اشعار اخلاق سے متعلق ہیں اور یہ اخلاق اور حکمت والے اشعار آپ کے مخمس کریما اور غزل کے دیوان سے ظاہر ہیں۔

آپ کے کلام پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ اخلاق وحکمت والے اشعار بھی دو طرح کے ہیں:

1 وہ اشعار کہ جن میں تہذیب اخلاق، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، شریعت وسنت، زہد و ورع محمود اور تقوی و پرہیزگاری کی پابندی پائی جاتی ہے۔

2 وہ اشعار جو ریا، تکبر، حسد، خود بینی، خود نمائی اور غرور کی مذمت کے بیان میں ہیں اور بدزبانی طعن و تشنیع کے ترک کرنے کے بیان میں ہیں اور دوسرے مضامین بھی اس میں شامل ہیں۔

اور یہ وصف آپ کے کلام میں اس طرح سے ملحوظ ہے کہ اگر آپ کی غزل کا ایک شعر پڑھا جائے تو یہ وصف مقطع میں بھی نظر آتا ہے اور پورا کا پورا کلام اخلاق اور حکمت والا دکھائی دیتا ہے۔

جاں بلب آمدم ز درد کردم از و دوا طلب
گفت اگر تو عاشقی صبر کن و رضا طلب
یار دم کہ بر سرت تیغ رندتو دم مزن
سر بہ فدائے یار کن ہیچ نہ خوں بہا طلب[9]

(عشق میں میری جان لبوں پر آگئی تو میں نے اپنے معشوق سے دوا مانگی اس نے کہا اگر تم سچے عاشق ہو تو صبر کرو اور میری خوشی میں خوش رہو، جب محبوب اپنی تلوار سے تم کو قتل کرنا چاہے تو دم نہ مارو اور خوں بہا مت مانگو بلکہ اپنے سر کو یار کے قدموں میں نثار کردو)

آپ کے اشعار سے پتا چلتا ہے کہ آپ کا عقیدہ

یہ ہے کہ معرفت شریعت سے تجاوز کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ معرفت کا حصول شریعت کی پابندی سے ہوتا ہے۔فرماتے ہیں۔

تراب حد شریعت نشان معرفت است
قدم در از نہ باید مگر بقدر گلیم 10

(تراب شریعت کی پابندی ہی معرفت کی نشانی ہے اپنی چادر سے باہر پیر نہ پھیلانا چاہیے)

شاہ تراب اپنے اشعار کے آئینے میں کبھی کبھی ایک دردمند ناصح نظر آتے ہیں جو نفس پرست اور خود بینی کرنے والے گمراہوں کو راہ راست اور درستگی کی طرف لاتے ہیں، انھیں تزکیہ کا راستہ دکھاتے ہیں، انھیں نصیحت کرتے ہیں اور کبھی کبھی ڈینگیں ہانکنے والے زاہدان خشک اور غیر متقی مدعیان تقوی کا مذاق اڑاتے ہیں اور اپنی ہنرمندی اور قلندری کے تقاضے سے خود کو اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ حقائق کے بیان کرنے میں آزاد اور جرات مند ہیں۔

ہزار مرتبہ سر سود بر زمین زاہد
چہ سود برد بجز خاک بر جبین زاہد
ریا و زہد ترا شہرت و تماشاہاست
برآ ز خلوت و در جلوہ گہ نشین زاہد11

(زاہد نے ہزاروں سجدے کیے لیکن سوا اپنی پیشانی کو خاک آلود کرکے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ریا کاری اور دیکھاوے کا زہد ہی زاہد کی شہرت ہے اگر تو واقعی زاہد ہے تو خلوت سے باہر نکل۔)

آپ کے عرفانی اشعار بھی دو طرح سے ہیں:

(الف) عرفان وتصوف کے عام مسائل کے بیان میں جو نام ہے تزکیہ، تصفیہ، تجلیہ، دنیوی تعلقات سے کنارہ کشی، بے ثباتی اور مسائل طریقت، اوراد و وظائف اور کچھ دیگر چیزوں کا جن کی طرف آپ درست رہنمائی فرماتے ہیں۔

(ب) خالص عرفانی اشعار کہ جن میں حقائق ومعارف جیسے وحدت وجود، وحدت شہود، تجدد امثال، کثرت میں وحدت، وحدت میں کثرت اور ان سے متعلق دیگر مسائل نہایت ہی گہرائی و بینائی کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔

وحدت وجود ایک ایسی بحث ہے کہ شاہ تراب نے اس سے متعلق اپنے بہت سارے آثار چھوڑے ہیں اور آپ کے کلام میں موجود تمام عناصر میں یہ عنصر اس طرح سے غالب ہے کہ پتا چلتا ہے کہ وحدت وجود کہنے کی نہیں بلکہ سمجھنے کی چیز ہے، اس بحث سے متعلق آپ کی غزلیں اس قدر اور اتنی اچھی ہیں کہ ان کی زیبائش اور دل نشینی قابل دید ہے، آپ کی زبان سادہ اور ہر طرح کے تکلف اور پابندی رسم سے دور ہے۔

آپ کے اشعار میں سے کچھ اشعار جن کا تعلق غزل سے ہے اور اک حقیقت در مجاز کے قبیل سے ہیں کہ ہر شعر سے حقیقت ظاہر ہوتی ہے، یا زلف، رخسار اور ہونٹ وغیرہ کی تمثیل اور لفظی مناسبات سے حسن وعشق مجازی کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے کہ قاری کا ذہن حقیقت کی طرف ایک بارگی مائل ہو جاتا ہے۔

آپ کے کلام میں ایک خوبی معنی آفرینی ہے جو درست طریقے سے نظر آتی ہے اور اس وصف سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے بے جان چیزوں میں آپ نے جان ڈال دی ہے اور بے علت چیزوں کو علت ومعلول بنا دیا ہے۔

علاوہ ازیں آپ کی شاعری کے موضوعات میں ایک موضوع اور ایک موثر طریقہ اور مفید لہجہ یہ ملتا ہے کہ موسیقی کلام کے ہر نوع کو وہ اپنے کلام میں اس طرح سے برتتے ہیں کہ اجناس کے انواع، ظاہر اور پوشیدہ حروف، تکرار کلمات، مناسب نکات، لفظی ہم آہنگی، لف ونشر مرتب اور غیر مرتب، رنگا رنگ تشبیہات، استعارات، عربی فارسی محاورات بطریق احسن استعمال کیے گئے ہیں۔

تشبیہات واستعارات کی کثرت استعمال اور دیگر صنائع وبدائع کے لحاظ کے باوجود محبوب کی تعریف میں آپ کا دل کلی طور سے محو نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ محبوب کے عشق میں بیدار رہتے ہیں اور گل وبلبل، شمع وپروانہ کو محض تشبیہ واستعارہ ہی سمجھتے ہیں، ان عناصر سے استفادہ اتنے ہنرمندانہ اور زیرکانہ طریقے سے کرتے ہیں کہ آپ کے اشعار کو سننے یا پڑھنے والا اقبل اس کے کہ صنائع کی طرف متوجہ ہو کر از خود رفتہ ہو جائے وہ آپ کے اشعار کی زیبائش، لطافت اور ہم آہنگی میں ڈوب جاتا ہے۔

شاہ تراب علی یقیناً علوم روحانی کے معلم اور اسرار باطنی کے حکیم بھی تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں روحانیت کی گہرائی نظر آتی ہے اور پڑھنے والوں کو رموز مخفی سے آگاہی ہوتی ہے، شاہ تراب کے کلام میں تصوف کے بنیادی مسائل مثلاً: وحدت الوجود، طریقت کے مسائل، معرفت کے امور، تسلیم ورضا کی تلقین، صبر وقناعت کی ہدایت، ترک دنیا کا خیال، سکون قلب کی تدابیر، آفرینش کائنات کی حقیقت، کن فیکون کا مفہوم، حسن وعشق کے رموز، دنیائے فانی کی بے حقیقتی کا افسانہ اور بے ثباتی کا ترانہ، موت وحیات، ذات حق کی قدامت، غیب وشہود، وجود مطلق کے اوصاف، وجود مقید کی بے مائیگی، حسن ازل کی جھلک، یوم الست کا وعدہ و پیمان، تزکیہ نفس کی اہمیت وغیرہ بخوبی موجود ہیں۔ان کے کلام میں تصوف کی سطح سے ہٹ کر بھی ذاتی فکر کی روشنی اور شخصی اجتہاد کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔

آخر کار 94 سال کی عمر میں ربیع الآخر 1275ھ/1858 کو فالج کا شکار ہو کر داعی اجل کو لبیک کہا اور اس طرح سے روحانیت کے پیالے سے محبت کا جام پلانے والے ہونٹ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے، فارسی شاعری کی تاریخ کا ایک باب مکمل ہوگیا اور علم وفضل کا آفتاب عالم تاب روپوش ہوگیا۔

## حواشی

1. تذکرہ گلشن کرم، شاہ تقی انور قلندر، ص67، نامی پریس لکھنؤ،1213ھ
2. خانوادۂ کاظمیہ کی ادبی خدمات، پروفیسر عمر کمال الدین، ص155، عادل پبلی کیشنز1230 کلاں محل نئی دہلی1996
3. تذکرہ گلشن کرم، تقدیم وترتیب جدید، ڈاکٹر حافظ شعیب انور علوی کاکوروی، ص88، سنہ اشاعت2020
4. مصدر سابق، ص95
5. خانوادۂ کاظمیہ کی ادبی خدمات، پروفیسر عمر کمال الدین، ص:178,179، عادل پبلی کیشنز، 1230 کلاں محل، نئی دہلی، 1996
6. دیوان فارسی شاہ تراب علی قلندر، بکوشش دکتر حافظ شعیب انور علوی کاکوروی، ص24، سنہ اشاعت، 2015
7. مصدر سابق، ص96
8. مصدر سابق، ص95
9. دیوان فارسی شاہ تراب علی قلندر، بکوشش دکتر حافظ شعیب انور علوی کاکوروی، ص45، سنہ اشاعت2015
10. مصدر سابق، ص90
11. مصدر سابق، ص68

**Sayyad Anwar Safi (Safi Ibn Safi)**
Research Scholar, Dept of Persian
University of Lucknow
Lucknow-226007 (UP)
Cell.:9918300200
sayyadanwarsafi@gmail.com

# اردو کے تین جگر

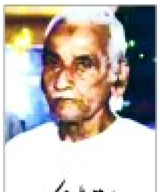

مختار ٹونکی

راقم التحریر کے زیرِ مطالعہ جگر تخلص والے تین نامور شعرا رہے ہیں اور تینوں ہی اپنی فکر رسا اور طرزِ ادا کے اعتبار سے منفرد و ممتاز کہے جاسکتے ہیں۔ پہلے ہیں علی سکندر جگر مرادآبادی جنھوں نے بہانگِ قلم کہا تھا۔

جان کر منجملۂ خاصانِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

دوسرے شیام موہن لال جگر بریلوی ہیں جنھوں نے اپنے بارے میں کچھ یوں فرمایا تھا۔

معراج سخن، سخن میرا ہے
آپ اپنے کمال پر فدا ہوں

اور تیسرے نورالدین جگر اجمیری کہہ گئے کہ۔

وہ نقش جگر چھوڑ چلا بزم ہنر میں
کرتے ہی رہیں گے مجھے اربابِ ہنر یاد

واضح رہے کہ جگر مرادآبادی اور جگر بریلوی دونوں 1890 میں عالمِ وجود میں آئے۔ اول الذکر نے 1960 میں وفات پائی اور ثانی الذکر 4 مارچ 1976 میں آنجہانی ہوئے مگر شہرت و مقبولیت جگر مرادآبادی کے حصے میں آئی۔ حالانکہ اس زمانے کے معروف نقاد حضرت نیاز فتح پوری نے اس طرح اظہارِ خیال کیا تھا کہ:

''جگر کے یہاں دعوت فکر کم اور دعوتِ کام و دہن زیادہ ہے۔''

اور یوں بھی رائے زنی کی تھی کہ ''متعدد بار میں نے مشاعروں میں جگر کے اشعار پر بے ساختہ داد دی لیکن گھر آ کر بہت افسوس ہوا کہ اِس معمولی شعر پر کس طرح داد دی جاسکتی ہے۔'' ہر چند ان کی ابتدائی شاعری میں فکر وفن کی وہ بلندی نہیں پائی جاتی جو ان کے ہم عصر شعرا حسرت موہانی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، فراق گورکھپوری جگر بریلوی وغیرہ کے کلام میں ملتی ہیں۔ پھر بھی رشید احمد صدیقی نے حسرت، فانی، اصغر، فراق اور جگر کو غزل کے نشاۃ الثانیہ کا پیروکار ٹھہرایا ہے کیونکہ ان شعرائے کرام نے میدانِ غزل میں ایسی مساعیِ جمیلہ کی کہ غزل ایک بار پھر اپنی تمام تر رعنائیوں اور دلربائیوں کے ساتھ مسندِ شاعری پر جلوہ افروز ہوگئی۔ جگر رئیس المتغزلین ٹھہرے صرف اس لیے کہ ان کی پوری شاعری عشقیہ رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اپنے مجموعۂ کلام 'شعلۂ طور' میں انھوں نے خود درج کیا ہے:

''میری شاعری غزل تک ہی محدود ہے اور چونکہ حسن وعشق ہی میری زندگی ہے اس لیے بعض مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی دوسرے میدان میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرسکا۔''

بنارس میں پیدا ہوئے اور مرادآبادی کہلائے جانے والے جگر فطری شاعر تھے۔ چہرے مہرے اور حلیے بشرے سے ان میں تھوڑی سی بھی جاذبیت نہ تھی۔ میانہ قد، چھریرے بدن کے سیاہ فام بشر تھے مگر ترنم ان کے رگ وپے میں سمایا ہوا تھا۔ خدا نے ایک خاص قسم کا لحنِ داؤدی انھیں ودیعت کیا تھا، جب وہ مشاعرے میں غزل پڑھتے تھے تو ان کے والہانہ انداز اور ساحرانہ ترنم سے سامعین کیا در و دیوار جھوم اٹھتے تھے۔ شاید اسی لیے ایک دلنواز شخصیت بن کر ابھرے۔ ان کی شاعری میں عشقیہ رنگ کی جھلکیاں یہاں وہاں ملتی ہیں کیونکہ وہ بذات خود عشق و عاشقی کی بدنام وادیوں سے گزرے ہیں اور اس کے لیے طوائفوں سے بھی بیاہ رچائے۔ مستزاد یہ کہ بادہ نوشی نے انھیں اور دیوانگی و وارفتگی بخش دی تھی۔ میکشی اور شاعری ان کے لیے لازمۂ زندگی بن گئی تھیں۔ خود کہا ہے۔

جگر کی بادہ کشی ان دنوں معاذاللہ
جب آپ دیکھیں گے غرقِ شراب دیکھیں گے

ملحوظ رہے کہ ان کی شعری کائنات صرف تین شعری مجموعوں 'داغِ جگر'، 'شعلۂ طور' اور 'آتشِ گل' تک محدود ہے۔ بعد میں ان کا کلام 'یادِ جگر' کے نام سے ڈاکٹر محمد اسلام نے شائع کرایا تھا۔ جگر کی شاعری کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ بہرحال لازمی ہے۔ ان کا اولین مجموعہ شعری 'داغِ جگر' 1924 میں مرزا احسان احمد ایڈوکیٹ نے طبع کرایا تھا جس میں 1903 سے 1922 تک کی غزلیات شامل ہیں جس میں ہلکی پھلکی رمی شاعری کے نمونے ملتے ہیں، مثلاً

نقشِ وفا کا رنگ مٹایا نہ جائے گا
مل بھی گیا جو زہر تو کھایا نہ جائے گا
ان کو جلا کے اور پشیماں ہوئے جگر
یہ کیا خبر تھی ہوش میں آیا نہ جائے گا

دوسرا مجموعہ 'شعلہ طور' 1942 میں شائع ہوا۔ اس دوران جگر صاحب کے ربط و ضبط اصغر گونڈوی سے زیادہ بڑھ گئے تھے، اس لیے ان کے کلام میں اصغر کے رنگ تصوف کی جھلک ملتی ہے اور شعور و ادراک کی پختگی کا احساس بھی ہوتا ہے، مثلاً

شاعرِ فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرے ذرے میں سما جاتا ہوں میں
یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے
اک حسن کا دریا ہے اک نور کا طوفاں ہے
اس پیکرِ خاکی میں یہ کون خراماں ہے

'آتش گل' کے نام سے تیسرا شعری مجموعہ 1954 میں پاکستان سے شائع ہوا۔ یہی وہ مجموعہ ہے جس پر ساہتیہ اکادمی نے جگر کو پانچ ہزار روپے کے انعام سے نوازا تھا اور یہی وہ مجموعہ ہے جس کے ذریعے وہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ فکر کی گہرائی، خیال کی طرفگی اور فن کی پختگی دیکھنا ہو تو یہ سبھی خصوصیات 'آتش گل' میں ملیں گی۔

ترے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ
دل بن گیا نگاہ، نگہ بن گئی زباں
آج اک سکوت شوق قیامت ہی ڈھا گیا
جنونِ سجدہ کی معراج ہے یہی شاید
کہ تیرے در کے سوا کوئی آستاں نہ رہا
تو محبت کو لازوال بنا
زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

بلاشبہ جگر نے بہت سے معرکۃ الآرا شعر کہے جو زبان زد عام بھی ہوئے ہیں۔ راقم الحروف کے چند پسندیدہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے
کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے
وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے، وہی فاتح زمانہ
محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
یہ شاخ گل بھی تلوار بھی ہے
دل گیا، رونقِ حیات گئی
غم گیا، ساری کائنات گئی
آئی جوان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی
اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں
اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے
پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن
ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

جگر بریلوی بھی جگر مرادآبادی کی طرح ایک بلند پایہ شاعر تھے مگر ناقدوں کی نظروں میں نہیں چڑھ سکے اور نہ ہی انھوں نے سستی شہرت کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے۔ علی سکندر صرف نویں پاس تھے اور ان کا خاندان مولویوں کا تھا جب کہ شام موہن لال نے بریلی کالج سے گریجویشن کی ڈگری لی تھی۔ دادا رائے بہادر منشی درگا پرشاد اور والد رائے بہادر کنہیا لال عالم و فاضل، رئیس، زمیندار اردو فارسی انگریزی زبانوں کے ماہر تھے۔ منشی درگا پرشاد انگریزی حکومت کے زمانے میں بھی اپنی قابلیت کی بنا پر انسپکٹر آف اسکولس رہے، بعدۂ آنریری مجسٹریٹ بھی بنائے گئے۔ اس جگر کے والد بھی ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے پر فائز رہے۔ شاعر بھی تھے اور دل تخلص فرماتے تھے۔ خود جگر نے مشن اسکول میں سرکاری نوکری کی اور پھر نائب تحصیلدار بن کر نامور ہوئے۔ اس جگر نے عاشقی نہیں کی۔ بیوی کے علاوہ کسی غیر عورت کو دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ شراب نوشی سے بھی کوسوں دور رہے۔ بے ایمانی اور ایذا رسانی کو گناہ سمجھنے والے پارسا چال چلن والے جگر کا اصول تھا۔Help ever- hurt never۔ حسرت موہانی کے طرز پر انھوں نے بھی کہا تھا۔

کارِ سرکاری بھی، رنج عشق و فکر شعر بھی
مرد میدان وفا ہے کوئی ہم سا اور بھی

وہ جگر صرف شاعر تھے اور صرف تین شعری مجموعوں کے خالق جگر' یہ' جگر سخنور ہونے کے ساتھ نثر نگار بھی تھے اور کئی کتابوں کے باضابطہ مصنف، مرادآباد والے جگر غزل کے رسیا تھے جب کہ بریلی کے جگر نے کئی مثنویاں، مسدس، رباعیات و منظومات کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ملاحظہ ہوں ان کی چند مطبوعات جن کی تفصیل 'پرتوِ الہام' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مطبوعات نثر: اردو ہندی، ہندوستانی (1938)، یاد رفتگاں (1944)، یادگارِ نظر (1945)، حدیث خودی (1959)، صحت زبان، اردو زبان پر ایک تحقیقاتی نظر (1969)

مطبوعات نظم: پیام ساوتری (1954)، رنگ و بو، کائستھ درپن، رس (1960)۔

اس سلسلے میں جگر کے لائق صاحب زادے رادھے موہن رائے نے 'پرتو الہام' کے پیش لفظ میں بتایا ہے کہ:

''جگر کا تعارف ان کی شاعری سے بہتر اور کہاں مل سکتا ہے۔ جگر اپنے وقت کی جانی مانی ادبی شخصیت تھے۔ اردو نثر اور نظم دونوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا، لاثانی تھا، غزل کو تو انھوں نے ایک نیا آیام دیا۔ رباعی اور قطعہ سے لے کر نظم، مسدس، مثنوی، تنقیدی مضامین میں کامل تھے مگر جہاں ان کا مسدس' پپیہا اور پی کہاں' اپنی طرح کا انوکھا نمونہ ہے وہیں مثنوی' پیام ساوتری' ہندی سنسکرتی، دھرم اور فلسفے کی اردو میں انوکھی رچنا ہے۔ جگر نے نثر میں مضامین، سوانح عمری، تنقید و تبصرہ، مزاحیہ مضامین، بچوں کے لیے نظمیں اور ڈرامے وغیرہ بھی اونچے پایے کے لکھے۔

ملحوظ رہے کہ جب وہ میرٹھ میں مقیم تھے تو مالک رام، گوپی چند نارنگ، ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی جیسی شخصیات ان سے ملنے آتی تھیں۔ ویریندر پرشاد سکسینہ نے 'جگر بریلوی' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی جسے ساہتیہ اکادمی نے سنہ 2000 میں شائع کیا ہے۔ یوپی سرکار نے جگر کی ادبی خدمات کو مدنظر انعام و اعزاز سے بھی نوازا تھا۔ جگر کے لائق صاحبزادوں موظف پروفیسر مادھو موہن رائے جامی اور موظف وائس پرنسپل رادھے موہن رائے نے اگست 2012 میں جگر کی 344 غزلوں پر مشتمل مجموعہ کلام پرتوِ الہام' شائع کیا ہے جس میں 1923 سے لے کر 1967 کی عہدوار غزلیات شامل ہیں جو خاکسار کی نظر میں تخیل، تفکر اور تصوف کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ اور ان سے اہل فن و ہنر بخوبی یہ جان سکیں گے کہ 'تغزل' کسے کہتے ہیں۔ جگر مرادآبادی کو 'رئیس المتغزین' کہنے والے جگر بریلوی کے صرف کچھ مطلع دیکھیں اور اندازہ لگائیں کہ وہ کس پایے کے شاعر تھے۔

فریب خوردۂ دیوار و در نہیں ہوں میں
جو خم ہو دیر و حرم میں وہ سر نہیں ہوں میں
کچھ فکر نہ کر، تدبیر نہ کر، تدبیر سے ہمدم کیا ہوگا
جو سانس لیے سے بڑھتا ہے وہ درد بھلا کم کا ہوگا
ایسی بھی بعض گھڑیاں آتی ہیں زندگی میں
سو رہیے زہر کھا کر آتا ہے بس یہ جی میں
گل و گوہر میں، مہ و اختر میں پنہاں نکلا
وہی اک شعلہ جو دل میں میرے رقصاں نکلا
آدمی وہ آدمی ہے درد جس کے دل میں ہے
ورنہ مٹی کے سوا کیا مشت آب وگل میں ہے
کفر کو قربان یا ایماں کو قرباں کیجیے
ہوسکے تو دل میں پیدا درد انساں کیجیے
برنگِ شمع غم کی آگ میں ہر لحظہ جلتے ہیں

تمھیں جو چاہتے ہیں نور کے سانچے میں ڈھلتے ہیں

بڑی قسمت سے پہلو میں دلِ اندوہگیں آیا
غمِ الفت سے ہم کو اپنی ہستی کا یقیں آیا
نہیں خودبینیاں عبث منظور
پردۂ دل میں ہے کوئی مستور
لیجیے تابانیِ عالم کے ساماں ہوگئے
دل کے ذرے اڑ کے ہر جانب پریشاں ہوگئے

آخر میں ایک مقطع۔

رعنائیِ خیال سے نا آشنا ہوں میں
وہ رنگ شعر میں ہے جو خونِ جگر میں ہے

ہماری تمھاری صدی میں جگر اجمیری بھی ہوئے ہیں جو پیدا تو گلابی شہر جے پور میں ہوئے مگر کچھ عرصے دارالخیر اجمیر میں رہ کر اجمیری کا لاحقہ لگا لیا۔ دراصل ان کے والد اللہ بخش غوری کا اجمیر میں زرکوبی دستکاری کا کارخانہ تھا اس لیے تیس سال تک اجمیر شریف میں مقیم رہے۔ شاعری میں مغل اجمیری سے زانوئے تلمذ تہہ کیا جو مضطر خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ مرزا مغل نے ایک انجمن 'فروغِ ادب' بنام سے تشکیل کی تھی جو ہر سال ایک کل ہند مشاعرے کا اہتمام کرتی تھی۔ جگر اس انجمن کے سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ مشاعرے میں حضرت جگر مرادآبادی کو بھی مدعو کیا جاتا تھا اس طرح پیر و برنا جگروں کی سخن سنجیاں اجمیر میں گونجتی تھیں۔ سید فضل المتین نے لکھا ہے کہ ''جگر اجمیری طرحی نشستوں کے شاعر تھے۔ پابندی سے شریک ہونے والے اور طرحی غزلیں کہنے والے شاعر تھے۔'' اس ضمن میں واضح ہو کہ 1964 میں بمقام جودھپور ایک سہ روزہ کل راجستھان اور سمپوزیم اور کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ مشاعرے کا مصرعۂ مطرحہ اصغر گونڈوی کا مشہور مصرع ع

مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

دیا گیا تھا۔ جگر اجمیری کو راقم الحروف نے بھی وہاں غزل پڑھتے دیکھا اور سنا تھا۔ مطلع و مقطع ملاحظہ ہو۔

حسنِ یوسف پہ زلیخا ترا شیدا ہونا
ہائے وہ مصر میں گھر گھر ترا چرچا ہونا
عشق والے کہیں رسوائی سے ڈرتے ہیں جگر
عشق والوں کا تو اک کھیل ہے رسوا ہونا

اجمیر میں اس زمانے کے بزرگ شعرا مولانا معنی، مولانا خنداں، ساغر اجمیری، بابو ارمان وغیرہ سے ان کی صحبتیں رہیں اور ان کی شعری نشستوں سے بخوبی فیضیاب

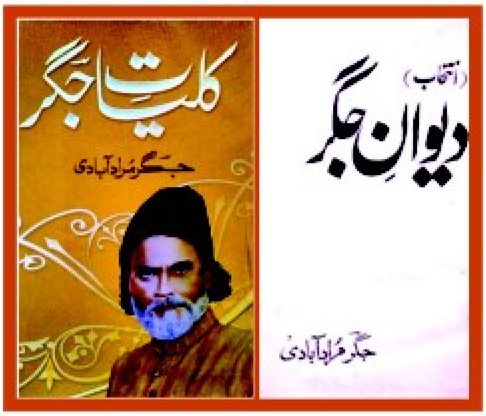


ہوئے۔ بعدازاں وہ 1925 میں جے پور منتقل ہوگئے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے 'اپنی بات' کے تحت خود لکھا ہے:

''ہندوستان کی آزادی کے دو سال قبل جے پور سکونت رہی۔ مسلسل 20 سال تک جے پور میں نشستوں میں شرکت کرنا اور آل انڈیا پیمانے کے مشاعروں میں شرکت کرتا رہا۔ اس دور کے بزرگ حضرات مولانا منصور علی بسمل آگاہی، مولانا کوثر سے فیض یاب ہوا۔ احترام الدین شاغل، ایوب صاحب قمر واحدی، عشقی، احمر، پارسا جیسے دوستوں کا ساتھ رہا۔

پیشہ آبا کو برقرار رکھنے اور وسعت دینے کے لیے 1970 میں وہ بمبئی میں منتقل ہوگئے اور 1980 سے 1997 تک کا زمانہ ملک عراق، شہر کربلا اور بغداد میں گزارا مگر ہر جگہ شعری اور ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ بمبئی میں بھی ان کا ادبی حلقہ تھا۔ آرزو لکھنوی، کامل چاندپوری، اشرف سرحدی، انجم رومانی، حسن کمال، فنا کانپوری، یوسف مینائی، استاد پرتو، شکیب بنارسی، کالی داس گپتا رضا وغیرہ سے ان کی ملاقاتیں رہا کرتی تھیں۔ بالآخر 87 سال کی عمر میں 2003 میں بمبئی میں ہی وفات پائی۔

جگر اجمیری کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ وہ نامور شاعر تو تھے مگر جگر مرادآبادی اور جگر بریلوی کی طرح قدآور سخنور نہیں تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ 'ورق ورق حسن و عشق' کے نام سے جنوری 2013 میں ممبئی سے شائع ہوا ہے جس کے مرتب جگر کے پسر محمد سلیم غوری ہیں جس کے مطالعے سے ہر کس و ناکس پر یہ واضح ہوگا کہ جگر اجمیری قدیم کلاسیکی شاہراہِ سخن پر گامزن تھے۔ عشق بازی اور بادہ نوشی ان کے مسلک میں بھی حرام تھی۔ ترقی پسندی اور جدیدیت سے انھوں نے کوئی واسطہ نہیں رکھا۔ پورا کلام قدیم رنگِ سخن کا آئینہ دار ہے۔ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے لیکن اجمیر اور بغداد میں رہنے کی وجہ سے نعوت اور مناقب بھی انھوں نے خوب کہے ہیں مگر ان کے جذبات و احساسات 'تغزل' کی صورت میں ہی شعر بن کر ڈھلتے تھے۔ پیرایۂ بیان صاف ستھرا ہے اور ہر بات بغیر لاگ لگاؤ کے برملا کہی ہے۔ کچھ اشعار یہاں وہاں سے اٹھا کر درج کرتا ہوں تا کہ اس حساس شاعر کی شعریت اور کیفیت سے آپ بھی آگاہ ہوجائیں۔

وہ جی کے کیا کرے چمن روزگار میں
جس کا چمن اجڑ گیا فصل بہار میں
رخ روشن کی قسم، زلف پریشاں کی قسم
حلقۂ کفر میں رہتا ہوں مسلماں ہوکر
میں اپنے آپ سے بھی ان دنوں بیگانہ رہتا ہوں
خدا جانے یہ راہ عشق میں کیسا مقام آیا
کبھی کانٹوں سے بھی میں نے کیا ہے پیار اے ہمدم
کبھی پھولوں سے بھی میں نے بچایا اپنے دامن کو
جب اے جانِ جگر تجھ کو جگر نے دیکھنا چاہا
تو آئینہ اٹھایا اور صورت دیکھ لی اپنی
بہ وقتِ دید ڈرتا ہوں نہ یہ انجام ہوجائے
میں ان کو دیکھنا چاہوں نظر ناکام ہوجائے
عاشقی کھیل نہیں ہے بڑی مشکل ہے جناب
یہ جگر مانگے ہے، دل مانگے ہے، جاں مانگے ہے
مرے پاس کچھ نہیں ہے یہ درست یہ بجا ہے
مرے پاس جب کہ تم ہو مرے پاس کیا نہیں ہے
ہم ایسے جیے ہیں شب فرقت کی سحر تک
سو بار گلے آکے قضا ہم سے ملی ہے
عشق معصوم کی بلا جانے
کیا بھلائی ہے، کیا برائی ہے
شعر، شاعر سے ذرا حسن بیاں مانگے ہے
جس کو کہتے ہیں غزل سادہ زباں مانگے ہیں

عبارت مختصر، جگر مرادآبادی ہوں کہ جگر بریلوی یا پھر جگر اجمیری مجھے تینوں ہی عزیز ہیں کہ انھوں نے عروس سخن کی مشاطگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور خزینۂ غزل میں اپنے اشعار دُرِ شہوار سے قابل القدر اضافے کیے ہیں۔ جب تک اردو شاعری عالم امکاں میں دھوم مچاتی رہے گی، ان کے نام بھی بہرحال زندہ و تابندہ رہیں گے۔

■

**Mukhtar Tonki**
Kali Paltan Road
Pul Mohd Khan
Tonk-304001 (Rajasthan)
Mob.: 9214826684

سید احمد قادری

## کثیر الجہات شخصیت

# قیوم خضر

قیوم خضر (6 دسمبر 1924 – 12 مارچ 1988) کا شمار اپنے دور کی ان شخصیات میں ہوتا ہے جنھیں اپنی ذات میں انجمن کہا جاتا تھا۔ان کی شناخت بیک وقت ایک منفرد اسلوب کے نثر نگار، ماہر لسانیات، محقق، صحافی اور شاعر کے طور پر تھی۔ اردو زبان و ادب، صحافت اور سیاست کے تعلق سے ان کی جو خدمات رہی ہیں وہ وقت گزرنے کے باوجود روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے عصری سیاست، صحافت اور ادب کے میدان میں اپنے تعمیری اور تخلیقی ذہن کے ساتھ ساتھ اپنے گہرے مطالعے و مشاہدے سے جتنی وسعت دی ہے، انھیں بھلایا نہیں جا سکتا ہے۔

اردو زبان و ادب اور اردو صحافت کی خدمات کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کرنے والی یہ شخصیت اب سے ٹھیک سو سال قبل یعنی 6 /دسمبر 1924 کو تاریخی شہر گیا کے موریا گھاٹ محلے میں پیدا ہوئی تھی۔ان کی خدمات کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ قیوم خضر نے اپنی پوری زندگی ادب و صحافت کے حسن و معیار کی آرائش و زیبائش کے لیے وقف کر دی تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی خود کے بنائے اصول، ضابطے کے ساتھ خودداری و تہذیبی اقدار کے ساتھ باوقار طریقے سے گزارتے ہوئے اپنی تحریر، تحریک اور تقریر سے ادب، صحافت اور سیاست کے میدان میں اپنی ایک خاص شناخت قائم کرنے میں کامیاب تھے۔ لیکن ان کی خدمات کا جائزہ جس طرح لیا جانا چاہیے تھا اور وہ جس مقام کے مستحق تھے، افسوس کہ اس طرح جائزہ لیا گیا اور نہ ہی انھیں وہ مقام دیا گیا، جس کے وہ مستحق تھے۔

قیوم خضر نے درجن بھر کتابیں تصنیف و تالیف کی تھیں، جو علم و ادب کے قیمتی خزانے سے کم نہیں ہیں۔ ان کی کتابوں خاص طور پر 'اردو درپن' (لسانیات)، 'اردو اور قومی ایکتا' (لسانیات)، 'خضر راہ' (تصوف)، 'تنویرات' (مختلف مضامین کا مجموعہ)، صادق پور، قربان گاہ، آزادیِ وطن، مسلمان اور حالات حاضرہ، کلید گم شدہ کی بازیافت، ارتعاش قلم (مضامین) وغیرہ میں جس طرح سماجی، صحافتی، ادبی، لسانی، تاریخی اور اسلامی تعلیمات کی معلومات کے خزانے کو ایک خاص حسن و معیار کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کی نظیر عہد حاضر میں ملنا مشکل ہے۔ وہ اپنے نثری اسلوب کی انفرادیت کے لیے بھی جانے جاتے تھے۔ اس اسلوب کی سحر انگیزی ایسی تھی کہ وہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی اور قاری اس میں ڈوبتا چلا جاتا۔

> اردو زبان و ادب اور اردو صحافت کی خدمات کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کرنے والی یہ شخصیت اب سے ٹھیک سو سال قبل یعنی 6 /دسمبر 1924 کو تاریخی شہر گیا کے موریا گھاٹ محلے میں پیدا ہوئی تھی۔ ان کی خدمات کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ قیوم خضر نے اپنی پوری زندگی ادب و صحافت کے حسن و معیار کی آرائش و زیبائش کے لیے وقف کر دی تھی۔

قیوم خضر کا اصل نام شیخ عبدالقیوم تھا جن کا رشتہ مشہور و معروف صحافی اور طنز و مزاح نگار انجم مانپوری سے بہت قریبی تھا۔ مشہور زمانہ ادبی رسالہ 'ندیم' کے بانی مدیر اور شہرہ آفاق انشائیہ 'میر کلو کی گواہی' کے خالق انجم مانپوری دراصل قیوم خضر کے چھوٹے دادا تھے۔ اس لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ علم و ادب اور صحافت انھیں ورثے میں ملی— ان کے والد کا نام شاہ محمد اختر تھا۔ قیوم خضر کی بسم اللہ گھر پر ہی مولانا محمد اسمٰعیل مانپوری نے کرائی تھی۔ قرآن پاک اور اردو فارسی کی تعلیم مولانا تقی نے دلائی اور 1935 میں قیوم خضر جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی گئے، پھر اپنے وطن لوٹے اور تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی یہ سیاسی، سماجی، ملّی اور ادبی طور پر بے حد متحرک اور فعال ہو گئے تھے۔

قیوم خضر نے آزادیِ ہند میں اہم کردار ادا کیا اور خاص بات یہ تھی کہ اس میدان میں بھی انھوں نے اپنی انا اور خودداری کو برقرار رکھتے ہوئے ایثار و قربانی کی مثالیں پیش کی ہیں۔ ذاتی نقصان اٹھایا لیکن کبھی بھی صبر و تحمل کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس روش پر چلتے ہوئے انھیں ہمیشہ اپنی فقیرانہ روش اور خودداری پر ناز رہا۔ بیباک اور جرأت مندانہ صحافت کی عظمت کے وہ ہمیشہ قائل رہے اور ہمیشہ اس بات پر قائم رہے کہ 'عام صحافیوں کی طرح قلم کی سوداگری کبھی بھی میرا پیشہ نہیں رہا'۔ اپنی

حق گوئی اور بیبا کی کے لیے وہ مشہور رہے۔ انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ 'میری زبان کی تلخی مصلحتوں کی منافقانہ شیرینی کو ایک لمحے کے لیے بھی گوارا کرنے کو تیار نہیں'۔ ان کی ان ہی خوبیوں کے باعث انھیں ہمیشہ عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا گیا۔ یوں تو ان کی درجنوں تصانیف موجود ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی شناخت ایک اچھے ادبی صحافی کے طور پر تسلیم کی گئی ہے۔

اگست 1950 سے قیوم خضر نے گیا سے ماہنامہ 'اشارہ' کا اجرا کیا۔ اسی ادبی ماہنامے سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ سید شاہ لعل قادری اور ان کے دیگر کئی دوستوں نے ابتدائی دور میں رسالے کو جاری رکھنے میں بے حد معاونت کی۔ قیوم خضر کی صحافتی زندگی تقریباً پچیس برسوں پر محیط ہے۔ انھوں نے اپنے رسالے کو عام صحافتی روش سے الگ ہٹ کر ایک خاص مزاج و آہنگ سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی۔ یہی وجہ تھی کہ 'اشارہ' میں ایک طرف جہاں ہندو پاک کے ہر مکتبۂ فکر کے مشاہیر شعر وادب مثلاً سریر کابری، جمیل مظہری، نوح ناروی، ڈاکٹر سید محمود، مانی القادری، اختر پیامی، حسن نعیم، قاضی عبدالودود، شکیلہ اختر، تلوک چند محروم، شکیل الرحمٰن، احتشام حسین، رضا نقوی واہی، اختر اورینوی، فضل حق آزاد، جوش ملسیانی، وغیرہ جیسے نامور قلمکاروں کی شمولیت ہوتی تھی، وہیں ابوذر عثمانی، علیم اللہ حالی، سعیدہ وارثی، قمر اعظم ہاشمی وغیرہ جیسے نو واردوں کی شعری و نثری تخلیقات بھی نمایاں طور پر شائع ہوتی تھیں۔ بعد میں یہی نووارد ادب آسمان ادب کے درخشندہ ستارے بن کر جھلملائے۔ اس سلسلے میں قیوم خضر نے اپنی کتاب 'محاسبہ' میں 'صحرائے صحافت کی آوارہ گردی' عنوان کے تحت لکھا ہے:

''میں نے اگست 1950 میں جب پہلی بار اپنے وطن مالوف گیا سے ماہنامہ اشارہ کا اجرا کیا تو میری صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ جس کا سلسلہ پچیس برسوں یعنی 1975 تک قائم رہا۔ شروع ہی سے میں نے رسالہ کو عام صحافتی روش سے الگ ایک خاص مزاج میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ زیادہ تر صحافیوں کا عام طور پر یہ رویہ چلا آ رہا ہے کہ وہ مضامین کی افادیت پر غور نہیں کرتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ کس مضمون نگار سے زیادہ مالی فائدہ ہونے کی امید ہے۔ اگر غیر افادی مضامین ہونہار نومشقوں کی ہمت افزائی کے لیے شائع کیے جائیں تو

قیوم خضر کی صحافتی زندگی تقریباً پچیس برسوں پر محیط ہے۔ انھوں نے اپنے رسالے کو عام صحافتی روش سے الگ ہٹ کر ایک خاص مزاج و آہنگ سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی۔

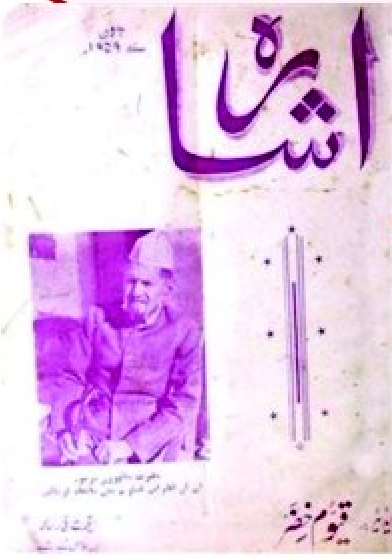


بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس میں تعلیم وتربیت کا پہلو مضمر ہے۔ چنانچہ اشارہ میں جہاں ملک کے مستند اور معتبر ادبا اور شعرا کے مضامین نظم ونثر آپ کو ملیں گے ان نومشقوں اور نوجوان ادبا اور شعرا کی تخلیقات بھی ملیں گی جن کی نہ کوئی گنتی تھی نہ پوچھ یعنی ادارہ اشارہ نے اپنی پالیسی کے پیش نظر صرف زبانی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا بلکہ تربیت کی خاطر نئی پود کے ادبی نونہالوں کی کچی پکی چیزوں کو چھاپ کر عملی طور پر ایسی حوصلہ افزائی کی کہ ان میں سے بیشتر ادبا اور شعرا ایسے ابھر کر سامنے آئے جو آگے چل کر آسمان ادب کے آفتاب و ماہتاب ثابت ہوئے۔'' ('محاسبہ' از: قیوم خضر، ص 121)

'اشارہ' کے اداریے ہمیشہ ادبی، لسانی و سماجی مسائل پر ہوتے تھے جو قارئین کے بڑے حلقے کو متاثر کرتے تھے۔ قیوم خضر کی زبان وبیان میں ایک خاص انداز ہوتا اور اپنی بات کو وہ اس خوبصورت اسلوب کے ساتھ پیش کرتے تھے کہ پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتی۔ اپنے رسالے کے مشمولات پر بھی وہ کافی توجہ دیتے تھے اور ہمیشہ ایک معیاری رسالہ پیش کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے۔ اپنے اداریوں میں ہمیشہ صحافتی حسن و معیار کے ساتھ ساتھ صحافتی تقاضوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ ان کی طرز نگارش میں اکثر مولانا آزاد کی خوبصورت اور معنویت سے بھرپور نثر کا پرتو جھلکتا تھا۔ 'اشارہ' کے پہلے شمارے اگست 1950 کا اداریہ ایسا تھا جس کے مطالعے کے بعد بے اختیار مولانا آزاد کے اسلوب کی یاد تازہ ہو جاتی۔ 'اشارہ' کے پہلے اداریے کا یہ انداز بیاں دیکھیے:

''رات کے پچھلے پہر تاریکی کو انگڑائیاں لیتے دیکھ کر تمام تارے خوابوں کی بستی میں چھپ جاتے ہیں اور جب آکاش کے کناروں سے سورج مسکراتا ہے تو ہوائیں لہرا اٹھتی ہیں۔ کسمساتے ہوئے انسان بستروں سے جاگ پڑتے ہیں۔ گویا سورج کی پہلی کرن انھیں ایک نیا دن ایک نئی جاگرتی ایک نئی زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ہم نے نیند سے بوجھل پپوٹوں پر بیداری چھڑکنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دیکھیں آنکھوں سے نیند کی مستی چھٹتی ہے یا نہیں؟ آج پھر ہم نے جوشش وراسخ و بیدل و آزاد و شفق وشاد کی سرزمین کو بیداری حیات کا پیغام سنایا ہے۔ دیکھیں ڈوبی ہوئی نبضوں میں ندگی کی حرارت پیدا ہوتی ہے یا نہیں؟ آج پھر علم نے علم وادب کے ٹمٹماتے ہوئے کنول کی لو کو اکسانے کی جرأت کی ہے۔ دیکھیں لویں ایوان حیات اپناتی ہیں یا نہیں؟''

ادبی ماہنامہ 'اشارہ' کو گیا سے نکلتے ہوئے ابھی چند ہی برس ہوئے تھے کہ وقت اور حالات کی ستم ظریفی نے قیوم خضر کو 1953 میں گیا سے پٹنہ منتقل ہونے پر مجبور کر دیا یا یوں کہیں انھیں ہجرت کرنا پڑی اور پٹنہ میں جیسے ہی حالات کچھ معمول پر آئے وہ اپنی روحانی تسکین کے لیے ایک بار پھر معاشی تنگدستی کے باوجود ادبی صحافت کے میدان میں کود پڑے اور دسمبر 1958 سے دوبارہ 'اشارہ' کی اشاعت پٹنہ سے شروع کر دی۔ دوسرے دور کی اشاعت میں کئی تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ مثلاً 'اشارہ' کے سرپرست مشہور کانگریسی رہنما عبدالقیوم انصاری، معاون عزیز عظیم آبادی اور ایڈیٹر قیوم خضر ہوئے۔ اس کی پرنٹ لائن پر اس طرح درج ہوا کرتا تھا۔

''طابع وناشر ایم اے قیوم خضر نے لیبل لیتھو پریس رمنہ روڈ، پٹنہ سے چھپوا کر دفتر 'اشارہ' صادق پور سرائے پٹنہ سے شائع کیا۔'' فی رسالہ قیمت 50 نئے پیسے

**میں نے قومی یکجہتی کے موضوع پر جتنے اداریے لکھے اور دوسروں کے جتنے مضامین چھاپے اس دور میں شاید ہندوستان کا کوئی اردو ماہنامہ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔**

اور سالانہ چندہ چھ روپے ہوا کرتا تھا۔ 'اشارہ' کی پیشانی پر 'علم وادب کے نئے اشاروں کا علمبردار' درج ہوتا تھا۔ دوسرے دور کے بعد بھی بڑھتی مالی تنگدستی نے کئی بار اس کی اشاعت کو التوا میں ڈالا، لیکن قیوم خضر کی ہمت، حوصلہ اور جنون ایک پھر انگڑائیاں لیتا اور وہ ایک نئے حوصلے اور امنگ کے ساتھ 'اشارہ' کی اشاعت کے لیے کمربستہ ہو جاتے اور اپنی ذاتی ضروریات کو تج کر 'اشارہ' کو منظر عام پر لانے کی سعی کرتے۔ اپنی کسی کتاب میں انھوں نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک بار ان کے کرایے کے مکان میں 'اشارہ' کے سرکولیشن اور رسالے سے ہونے والی آمدنی کی انکوئری کے لیے کچھ سرکاری عملہ اچانک تشریف لے آئے۔ آنے والے سرکاری کارندوں نے رسالہ کے مدیر، معاون مدیر، سرکولیشن منیجر، ایڈورٹائزنگ منیجر، اکاونٹنٹ وغیرہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ قیوم خضر نے بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ بتایا کہ یہ سب تن تنہا میں ہی ہوں اور اشارہ کے دفتر کا چپراسی بھی میں ہی ہوں۔ سرکاری عملے کو ان کی بات پر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ٹھیک اسی وقت پاس کی چائے کی دوکان والا اپنے بقایہ پیسے کے تقاضے کے لیے آدھمکا۔ یہ دیکھ کر سرکاری عملے کو ان کی بے بسی سے زیادہ ان کی بے کسی پر رحم آ گیا اور وہ سب معذرت کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ ایسی تنگدستی اور معاشی بدحالی کے درمیان قیوم خضر اپنے اس اردو کے ماہنامہ رسالے کو اپنے خون جگر سے سینچتے رہے اور ادبی صحافت کے میدان میں ہمت و حوصلے کو جگاتے رہے۔ اسی کسمپرسی بھرے حالات سے گزرتے ہوئے 'اشارہ' تعطل کے ساتھ شائع ہوتا رہا اور آخر کار اس ادبی ماہنامے نے شمارہ اگست 1967 دم توڑ دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وضاحت قیوم خضر نے کچھ اس انداز سے کی ہے:

''حصول اشتہارات کے مجوزہ منصوبے کے ناکام ہو جانے کے بعد رسالہ پھر سنکٹ بھنور میں پھنس گیا اور تجربے سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ کم پونجی والوں کو محض ذوق ادب کی دیوانگی میں رسائل وجرائد کا نکالنا ہرگز ہرگز زیبا نہیں اور نہ ہی ان لوگوں کو اس راہ میں قدم رکھنا چاہیے جو مصاحبت اور چاپلوسی کا فن نہیں جانتے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کو تو قدم رکھنے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیے، جو گروپ بندی کر کے تکڑم بازیوں اور گھپلے بازیوں کے ہنر سے واقف نہیں۔ چنانچہ ان ہنرمندیوں سے عدم واقفیت کی بنا پر تیسری بار بھی صحافتی میدان میں وہ کامیابی نہیں ہوئی......'' (محاسبہ قیوم خضر، ص 29-128)

اس طرح قیوم خضر کے ماہنامہ ادبی رسالے 'اشارہ' کا سفر اگست 1950 سے شروع ہو کر اگست 1967 میں ختم ہوتا ہے۔ لیکن تھک کر سپر ڈال دینا، قیوم خضر کی فطرت میں شامل نہیں تھا چنانچہ ایک بار پھر انھوں نے ایک نئے جوش و ولولے اور ہمت و حوصلے کے ساتھ 'اشارہ' کو ہفتہ وار کی شکل میں 9 جنوری 1974 سے شائع کرنا شروع کیا۔ اس ہفتہ وار میں قیوم خضر نے جوائنٹ ایڈیٹر اپنے فرزند نشاط قیصر کو بنایا۔ لیکن جلد ہی پھر وہی حوصلہ شکن حالات ان کے بڑھتے قدموں میں زنجیریں ڈال دیں اور بالآخر 23/ اپریل 1975 کا آخری شمارہ نکال کر وہ صحافتی میدان سے الگ ہو گئے۔ اپنے پسندیدہ صحافتی میدان سے سبکدوشی کے بعد اپنے احساس وجذبات کا اظہار قیوم خضر نے یوں کیا تھا:

'' 23 اپریل 1975 کو ہمیشہ کے لیے صحافت کے میدان سے کنارہ کش ہو گیا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ادب وصحافت کا روگ ایسا ہے کہ کینسر کی مہلک بیماری اچھی ہو سکتی ہے مگر اس روگ سے نجات پانا ممکن نہیں۔ چنانچہ ہوا بھی یہی کہ ادبی روگ نے صحافت کے بجائے تصنیف وتالیف کا رخ اختیار کر لیا اور جب علم وادب کی سرگرمیاں اس نئی راہ پر گامزن ہوئیں تو صحافت کی سعی نامشکور سے نجات مل گئی''

('محاسبہ' قیوم خضر، ص 137)

اردو صحافت کے تلخ وشیریں تجربات کے بعد انھوں نے اپنی بقیہ زندگی کو پورے انہماک کے ساتھ زبان وادب کی خدمات میں لگا دیا۔ اس دوران کی کئی اہم تصانیف وتالیفات منظر عام پر آئیں۔ جن کا تذکرہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں کیا ہے۔

قیوم خضر کی صحافتی زندگی کے روشن باب آج بھی اپنے حسن ومعیار، اسلوب، ندرت اور متنوع موضوعات کی وجہ سے یادگار ہیں، جنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر ان کی جو صحافتی زبان تھی، وہ زبان بہت کم لوگوں کو میسر ہوئی۔ قیوم خضر، مشہور ناقد پروفیسر عبدالمغنی کے بے حد قریب تھے۔ وہ عرصے تک ان کے ساتھ انجمن ترقی اردو کے رکن رہے اور اپنی سرگرم لسانی تحریک سے اردو زبان کو بہار میں دوسری سرکاری زبان بنوانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

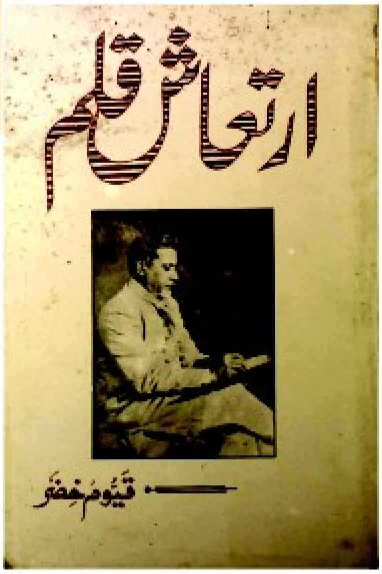


قیوم خضر کی زندگی کا گہرائی سے مطالعہ ومشاہدہ کیا جائے تو اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ قومی یکجہتی ان کا مقصد حیات تھا۔ انھوں نے اپنے مختلف اداریوں، مضامین اور کتابوں میں قومی یک جہتی کو کافی اہمیت دی ہے۔ اس تعلق سے ان کے مضامین بکھرے پڑے ہیں، لیکن جو مضامین کتابوں میں جگہ پا سکے ہیں، ان کا مطالعہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ قیوم خضر قومی یکجہتی کے ایک سچے اور بے لوث علمبردار تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی قومی یک جہتی کے لیے وقف کر دی تھی۔ اردو درپن، اردو اور قومی ایکتا، خضر راہ اور 'تنویرات' وغیرہ میں مختلف عنوانات کے تحت قومی اتحاد واتفاق پر انھوں نے کافی زور دیا ہے۔ ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ قیوم خضر کی

سرشت میں ہی یکجہتی اور ہم آہنگی کا جذبہ شامل تھا۔اس سلسلے میں ان کا یہ دعویٰ غلط نہیں تھا کہ:

’’میں نے قومی یکجہتی کے موضوع پر جتنے اداریے لکھے اور دوسروں کے جتنے مضامین چھاپے اس دور میں شاید ہندوستان کا کوئی اردو ماہنامہ اس کی مثال پیش نہیں کرسکتا۔‘‘ (’ارتعاش قلم‘،از: قیوم خضر،ص26)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قیوم خضر نے قومی یکجہتی کے تعلق سے بہت سارے مضامین لکھے اور لوگوں سے لکھوائے۔ اپنے مضامین کے مجموعہ ’محاسبہ‘ کے معروضات میں بھی انھوں نے ’قومی ایکتا۔ میرا مقصد حیات‘ کو فوقیت دی ہے۔قومی یک جہتی کی یوں تو ہر دور میں اہمیت اور افادیت رہی ہے لیکن تقسیم ملک کے بعد جب ہر طرف فرقہ واریت، نفرت اور عداوت کی کالی آندھیاں چل رہی تھیں اور بعض سیاسی وسماجی شر پسند عناصر ملک کی فضا کو مسموم کرنے کے درپے تھے ایسے وقت میں قیوم خضر نے قومی مفاد کے لیے سیاسی، سماجی اور قومی فریضے کی ادائیگی کے لیے اپنی تحریروں سے اس کالی آندھی کو روکنے کی کوشش کی اور دوستی، محبت، اتحاد واتفاق اور بھائی چارہ کے لیے فضا کو سازگار بنانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قومی یکجہتی کی اہمیت کو سمجھنے اور سمجھانے میں لگا دیا۔

قیوم خضر نے جہاں رام اور کرشن وغیرہ کی تعلیمات کی اہمیت اور ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، وہیں انھوں نے اہل صادق پور، ٹیپو سلطان، پیر علی، شیخ گلاب وغیرہ کی قومی خدمات کے ساتھ ساتھ راکھی، ہولی اوردسہرہ وغیرہ جیسے تیوہار کی روایات اور تاریخ بیان کرکے یہ ثابت کرنے کی مثبت کوشش کی ہے کہ یہ تمام شخصیتیں اور یہ تیوہار ہمیشہ دلوں کو جوڑنے اور بھائی چارگی کے فروغ کے لیے جانے جاتے رہے ہیں۔

اردو زبان پر جب عصبیت حاوی ہونے لگی، اس وقت قیوم خضر نے اپنا فرض سمجھا کہ اس غلط فہمی کو دور کرکے سازش کا پردہ فاش کیا جائے جو اس زبان کے وجود کے خاتمہ کے درپے ہے۔چنانچہ انھوں نے ’اردو اور قومی ایکتا‘ کے نام سے ایک مکمل اور بے حد معیاری کتاب لکھ ڈالی۔ جس میں اس زبان کی لسانی اور تاریخی اہمیت اور حیثیت کو بتاتے ہوئے اس بات کی پوری طرح وضاحت کردی کہ یہ اردو زبان دلوں کو توڑنے والی نہیں، بلکہ جوڑنے والی ہے۔وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’اردو حاکموں کی انتہائی بے توجہی کے باوجود عام جنتا کی زبانوں پر چڑھی اوردلوں میں بیٹھی راج کررہی ہے۔موجودہ صدی میں اردو زبان وادب کی ترقی وکامیابی اور قومی یک جہتی کے سلسلے میں اس کے اہم رول کا جائزہ لینے کے لیے ایک الگ مستقل کتاب کی ضرورت ہے ......بہر حال ......سطور بالا کی روشنی میں اب آپ خود ہی فیصلہ کیجیے کہ اردو فرقہ پرستی کی زبان ہے یا قومی یک جہتی کی......؟‘‘

(اردو اور قومی ایکتا،ص78-77)

**اردوزبان پر جب عصبیت حاوی ہونے لگی، اس وقت قیوم خضر نے اپنافرض سمجھاکہ اس غلط فہمی کودور کرکے سازش کاپردہ فاش کیاجائے جواس زبان کے وجود کے خاتمہ کے درپے ہے۔چنانچہ انھوں نے ’اردواورقومی ایکتا‘ کے نام سے ایک مکمل اوربے حد معیاری کتاب لکھ ڈالی۔**

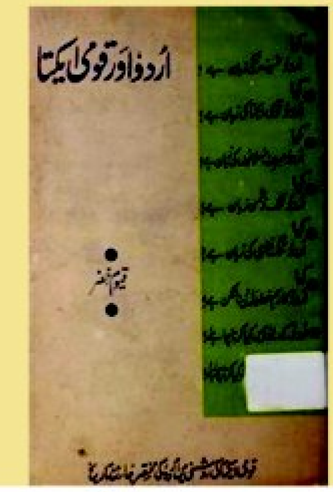


مضمون کی طوالت کے پیش نظر قیوم خضر کے ان مضامین کے اقتباسات دینے سے گریز کررہا ہوں جن میں انھوں نے تواریخ کے حوالے سے اس بات کو مکمل طور پر ثابت کردیا ہے کہ اس ملک میں مختلف فرقوں، ذات، زبان، لباس اور تہذیب کے ہوتے ہوئے بھی دوستی، محبت، اخوت، بھائی چارگی اور یک جہتی کی شاندار روایتیں رہی ہیں اور صدیوں سے لوگ ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے آئے ہیں اور ان تمام روایتوں نے مل کر ایک الگ گنگا جمنی تہذیب کو جنم دیا ہے۔

قیوم خضر کی زندگی بامقصد زندگی رہی۔انا، اصول، ضابطہ، خودداری کے خمیر سے تیار ان کی شخصیت کا ایک مقصد حیات تھا اور وہ تھا انسان دوستی، جس کے لیے انھوں نے عمر بھر کوششیں کیں، اپنی تحریر، تحریک اور تقریر سے اپنے مشن میں وہ ہمیشہ مصروف و عمل رہے۔ان کی ایک اور خصوصیت کا ذکر عام طور پر نہیں کیا جاتا ہے کہ وہ احساسات و جذبات کے تخلیقی اظہار کے لیے شاعری بھی کیا کرتے تھے۔گرچہ شاعری ان کا میدان نہیں تھا لیکن قدرت نے انھیں جو فکر وفن کی دولت ودیعت کی تھی اس کا تقاضہ تھا کہ وہ اپنے اظہار کے لیے شاعری جیسی اہم صنف کا بھی سہارا لیں۔قیوم خضر نے اپنی غزلوں، نظموں، قطعات اور مثنوی میں وقتاً فوقتاً میں جو افکار وخیالات پیش کیے ہیں اور جو بکھرے پڑے تھے۔انھیں بڑی ہنرمندی سے ان کے فرزند اظہار خضر نے اپنے والد کے انتقال کے بعد یکجا کرکے ’تشنگی‘ کے نام سے شائع کیا تھا۔جس کے مطالعے سے قیوم خضر کی حیات وکائنات کو مختلف انداز اور نظریات کے ساتھ دیکھنے اور سمجھنے کا اشارہ ملتا ہے۔ان شعری افکار واظہار میں جہاں قیوم خضر کی جمالیاتی حس کی بیداری کا احساس ہوتا ہے وہیں عصری سیاسی، سماجی اور معاشرتی انحطاط کا فنکارانہ اظہار بھرپور معنویت کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے۔قدروں کی پامالی، بدلتے وقت اور حالات کی تبدیلی اور سماجی رشتوں کے بکھراو گزشتہ کئی دہائیوں سے شعرا کے موضوعات رہے ہیں لیکن ان تبدیلیوں کو شاعر نے کس طور پر سمجھا اور برتا ہے اس کی اہمیت اور انفرادیت ہوتی ہے اور اس تناظر میں قیوم خضر کی شاعری کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

قیوم خضر کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر ایسی شخصیت جو کہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھی کو نہ صرف یاد کیا جائے بلکہ ان کے غیر مطبوعہ مضامین و مقالات کو شائع کرکے ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا جائے۔

■

**Dr Syed Ahmad Quadri**
7 New Karimganj
GAYA-823001 (Bihar)
Mob.: 8969648799
squadri806@gmail.com

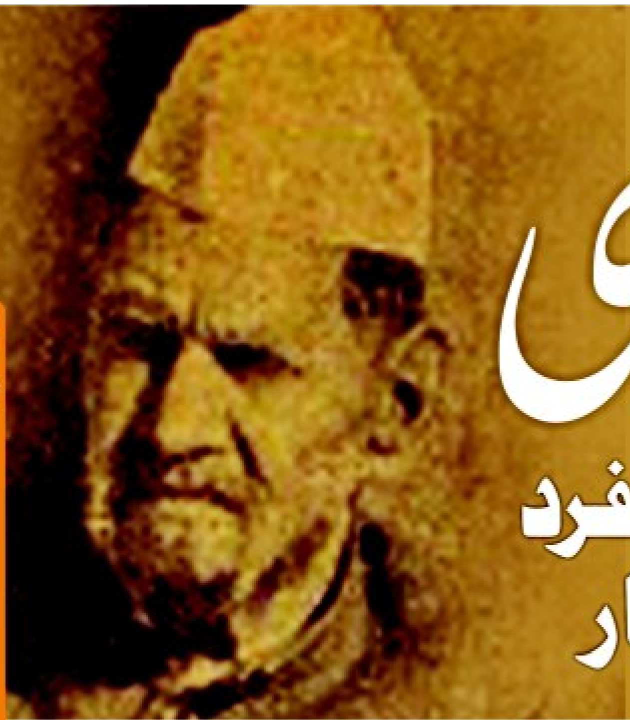

# انجم مانپوری
## ایک منفرد طنزنگار

شبیر عالم

طنز ومزاح نگاری میں کمال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب طنز ومزاح نگار زبان، زندگی اور زمانہ کے نشیب وفراز، مزاج اور سمت ورفتار کی بصیرت مندانہ آگہی کا حامل ہو۔ اردو میں رشید احمد صدیقی کے بعد یوں تو کئی طنز ومزاح نگار منظرِعام پر آئے لیکن جو شہرت اور قبولیت عام انجم مانپوری کو حاصل ہوئی، وہ کم لوگوں کو میسر آئی ہے۔

انجم مانپوری ایک منفرد طنز ومزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر، ناقد اور صحافی بھی تھے۔ انجم مانپوری محلہ مان پور (شہر گیا) میں 1881 میں پیدا ہوئے انجم مانپوری کی پیدائش کی تاریخ ان کے استاد بھائی جناب بسمل سہنسہاروی کے اس مصرع سے تصدیق ہوتی ہے۔

سنہ ولادت من 'در صغیر 1300ھ' ہست نہاں

محلہ مانپور شہر گیا کے مشرق میں تاریخی 'پھلگو ندی' کے اس پار واقع ہے جسے اس وقت شہر کا درجہ حاصل تھا۔ انجم مانپوری کا اصل نام نور محمد تھا اور انجم تخلص کرتے تھے اور مانپور چونکہ ان کا آبائی وطن اور ان کی جائے پیدائش ہے اس لیے اپنے کو مانپوری کہتے تھے انجم مانپوری نے اپنے نام کا جو سجع کہا ہے اس میں بڑی خوبی واحسن طریقے سے تخلص بھی شامل کر دیا ہے کہتے ہیں ع

تاباں بود از نورِ محمد انجم

انجم مانپوری کی ابتدائی عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے وطن گیا میں ہوئی۔ اس کے بعد لکھنؤ گئے اور وہاں ندوۃ العلما میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہاں ان کی ملاقات سید سلیمان ندوی سے ہوئی جو ان کے ہم جماعت تھے۔ دونوں میں کافی دوستی ہوگئی اور یہ لوگ مدرسے میں ساتھ بیٹھ کر درس لیا کرتے تھے۔ انجم مانپوری کو عربی و فارسی زبان و ادب سے بے حد رغبت تھی انھوں نے اس سلسلے میں ہندوستان کے مختلف مشاہیر و ادبا سے رجوع کیا۔ ندوۃ العلما میں چند برس گزارنے کے بعد مزید تحصیل علم کے لیے مراد آباد تشریف لے گئے اور شاہی مسجد مراد آباد میں مولانا احمد حسن امروہوی اور مولانا محمود حسن سہوانی سے کسب فیض کیا اور پھر اپنے وطن گیا واپس چلے آئے۔ ان کے اہل وعیال مانپور سے محلہ موریہ گھاٹ جو پرانا جیل خانہ سے مشہور ہے وہاں پر زمین خرید کر رہائشی مکان بنوا کر مقیم ہوگئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انجم مانپوری کی سکونت اس نئے مکان میں ہی ہوئی۔ مگر شہر گیا میں سلسلہ تعلیم بھی جاری رکھا اور مدرسہ کنز العلوم میں داخل ہوکر علامہ عبد الوہاب صاحب فاضل بہاری سے عربی کی تعلیم کی تکمیل کی۔

انجم مانپوری کی شخصیت دو خانوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ پہلا انجم اور دوسرا مانپوری۔ جب وہ اپنی تحریروں میں، تخلص انجم استعمال کرتے تو انتہائی بردبار سنجیدہ شخص کی شکل میں رونما ہوتے ہیں لیکن جہاں تخلص مانپوری استعمال کیا ہے۔ وہاں وہ سر سے پاؤں تک طنز وظرافت کا مجموعہ نظر آتے ہیں۔ انجم مانپوری نے اپنے ایک شعر میں انجم اور مانپوری کے معمّے کو خود ہی واضح کر دیا ہے۔

سنجیدہ مضامین تو کبھی طنز و مزاح
گہہ انجم و گاہ مانپوری ہوں میں

دونوں مصرعوں میں خاص الفاظ کی ترتیب پر تھوڑے غور سے واضح ہو جاتا ہے کہ سنجیدہ مضامین کے لیے وہ تخلص انجم استعمال کرتے ہیں اور اس نثر کو جو وہ مانپوری کے نام سے لکھتے ہیں، اسے 'طنز ومزاح' قرار دیا ہے۔

1938 میں انجم مانپوری کا طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا پہلا انتخاب 'طنزیات مانپوری (حصہ اول)' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں 'میر کلو کی گواہی'، ماما کی مصیبت، میری اسیری، ہاں میں ہاں، میرا روزہ، سکنڈ ہینڈ موٹر، پاگل خانہ کی سیر، شادی کی تقریب، پنک آشرم، اڈیشنل وائف، میونسپل الیکشن، ہاتھی اور کرایہ کی ٹم ٹم کے عنوانات سے تیرہ مضامین ہیں۔ طنزیات مانپوری (حصہ اول) کا مقدمہ سید وصی احمد بلگرامی ڈپٹی کلکٹر پلاموں نے تصنیف کیا۔ 'طنزیات مانپوری' (حصہ اول) کے بعد 'طنزیات مانپوری' (حصہ دوم) 1940 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں اپٹوڈیٹ شاعری، آنریری مجسٹریٹ، میری عید، تامرد نگفتہ باشد، ہوم پالیٹکس، وبال جان، اینٹی فادر کانفرنس، سخن تکیہ، ایک ناگہانی دوست، اسٹوڈنٹ لائف، ہوسٹل لائف اور صاحب کا کتا کے نام سے بارہ مضامین شامل ہیں۔ آخری صفحے پر قطعہ 'تاریخ طنزیات مانپوری' درج ہے جس کے آخری شعر سے 'طنزیات مانپوری' (حصہ دوم) کی تاریخ نکلتی ہے۔ اس قطعہ کا آخری شعر ملاحظہ ہو۔

عیسوی تاریخ رقم کن احمد
طنزیات مانپوری روح افزائے مذاق

1940

اس کا مقدمہ مشہور شاعر علامہ جمیل مظہری نے لکھا ہے۔

انجم مانپوری کا تیسرا مجموعہ 'مطائبات مانپوری' 1952

میں شائع ہوا اس مجموعے میں ان کے 9 مضامین کلکتہ ریٹرنڈ، میری لیڈری، میری پہلی اسپیچ، دوستی، میرا سفر، انڈر گریجویٹ، ٹیوشن، سفارش اور ہمارے داروغہ جی کے عنوانات سے شامل ہیں۔ اس کتاب کا مقدمہ خود انجم مانپوری نے لکھا تھا۔ اسی سال یعنی 1952 میں ہی 'ظریات مانپوری' (حصہ اول) کا دوسرا اڈیشن بھی نکلا جس کا ہندی اڈیشن 'نورتن' کے نام سے بھی سامنے آیا۔

'مرنے کے بعد' انجم مانپوری کا چوتھا اور آخری مجموعۂ مضامین ہے۔ یہ مجموعہ 1958 میں انجم مانپوری پبلشنگ ہاؤس کی جانب سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کو خود انجم مانپوری نے ترتیب دیا تھا لیکن اس کی اشاعت 27 اگست 1958 کو مانپوری کی وفات کے بعد عمل میں آئی۔

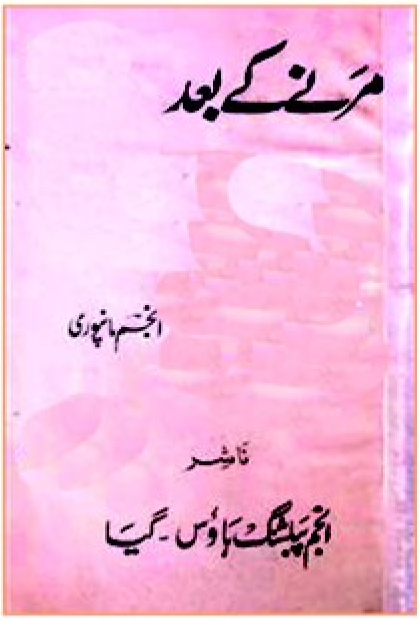


انجم مانپوری کا پہلا انشائیہ 'میر کلو کی گواہی' کو اردو طنز وظرافت میں شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ اس انشائیے کا مرکزی کردار 'میر کلوؔ' ہے جو اپنی حاضر جوابی اور ذہانت کے لیے مشہور ہے 'میر کلوؔ' ہندوستان کے عدالتی نظام کے گرد جنم لینے والا ایک ایسا کردار ہے جس کی تخلیق میں مانپوری نے اپنا سارا کس وبل استعمال کردیا ہے۔ میر کلو ایک ایسا گواہ ہے جو ہر وقت مقدمے کے سلسلے میں کام آتا ہے۔ میر کلو ایک ایسا پیشہ ور گواہ ہے جو عام طور پر ہندوستان کی ہر عدالت میں مل جاتا ہے۔ یہ کردار عدالت کے تمام پیچ وخم سے واقف ہے۔ اس لیے وہ اچانک جملے کو بھی برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے یہ کردار مقدمے کی روح سے نابلد ہونے کے باوجود جب کٹہرے میں کھڑا ہوتا ہے تو فریق مخالف کے وکیل کے تابڑ توڑ حملے سے جرح میں نہیں ٹوٹتا اور اپنی ذہانت سے ہر سوال کو اس خوبصورتی کے ساتھ ٹالتا چلا جاتا ہے کہ آخرش فریق مخالف کا وکیل اپنے عجز کا اعتراف کر لیتا ہے اور اس طرح یہ پیشہ ور گواہ کسی کے کام آجاتا ہے۔

یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

وکیل: میر کلو آپ کبھی جیل کی بھی سیر کر چکے ہیں؟

میر کلو: آج کل کون ایسا خادم قوم ہے جو جیل نہ ہو آیا ہو۔

وکیل: آپ کو ملک کی کس خدمت کے صلے میں یہ فخر حاصل کرنے کا موقع ملا؟

میر کلو: وہی قانون شکنی۔

وکیل: کس قانون کو توڑنے کی خدمت آپ نے اپنے ذمے لی تھی؟

میر کلو: گاندھی جی نے نمک کے قانون توڑنے کا بیڑا اُٹھایا تھا بعض لیڈروں نے قانون جنگلات کی خلاف ورزی کی ذمے داری لی۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ ضرورت قانون شہادت کی اصلاح کی ہے اس لیے میں نے اسی کو منتخب کیا.....

وکیل: ان کی عمر کیا تھی؟

میر کلو: یہی تیس اور ساٹھ کے درمیان ہی تھی۔

وکیل: یہ تیس اور ساٹھ کے درمیان کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ صاف کہیے وہ بوڑھے تھے یا جوان؟

میر کلو: عمر کے لحاظ سے تو بہت زیادہ بوڑھے نہیں تھے۔ مگر اکثر بیمار رہنے کی وجہ سے بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔

وکیل: بال سفید تھے یا سیاہ؟

میر کلو: نزلہ کی وجہ سے بال سفید ہوگئے تھے لیکن جب خضاب لگاتے تھے تو جوان معلوم ہوتے تھے۔[1]

مانپوری نے الفاظ ومحاورات کا استعمال برمحل و برجستہ کیا ہے لیکن کہیں کہیں پر ٹھیٹھ مقامی یعنی اودھی محاورات کا استعمال کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فکر وفن کے سلسلے میں ان کا زاویہ نظر عوامی زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں پیچیدہ تراکیب نہیں ملتی ہیں۔ بھاری بھرکم الفاظ کم سے کم استعمال کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جاہل سے عالمانہ گفتگو کرنے کے قائل نہیں ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی خیال رکھتے ہیں کہ عالم سے جاہلانہ گفتگو نہ ہو۔ انجم مانپوری کے تمام کردار زمینی ہیں ان کے یہاں حقیقی زیادہ ہیں اور مثالی کم استعمال ہوئے ہیں۔ وہ اپنے اردگرد کے واقعات کو مضحکہ خیز انداز میں بیان کرتے ہیں۔

'میری عید' اس مضمون میں انجم مانپوری نے عید سے قبل پیش آنے والی گھریلو پریشانیوں کو مزاحیہ پیرایے میں اُجاگر کیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اتنے کمسن لڑکے کو نماز میں شریک ہونے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ میں نے کہا نادان بچہ تھا غلطی سے مسجد دیکھنے چلا گیا۔ مجھے بھی کبھی آپ نے عید کے سوا یہاں دیکھا ہے؟ ایک حضرت نے ذرا روکھے تیور سے پاس آکر کہا کہ آپ کے لڑکے نے چیخ چیخ کر سب کی نماز خراب کردی۔ اس پر مجھے غصہ آگیا میں نے بگڑ کر کہا کہ نماز میں رقت طاری ہونے پر گریہ وبکا کرنے کے لیے کیا عمر کی بھی قید ہے؟[2]

بڑا ظرافت نگار وہی ہے جو اپنی ذات پر ہنسے اور دوسروں کو بھی ہنسائے۔ یہ جملہ انجم مانپوری پر صادق آتا ہے۔ انھوں نے خود اپنی ذات کو نشانہ بنایا ہے اور سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کا اپنے طنز کے نشتر سے Operation بھی کیا ہے اور مزاح کا مرہم بھی لگایا ہے۔ ان کا مضمون 'میری عید' اسی کا متقاضی ہے۔ چنانچہ مسجد میں نماز کے دوران کسی نے ان کا جوتا غائب کردیا لہٰذا سیڑھی پر پڑا پرانا جوتا جلدی سے پہن کر جانا چاہتے تھے کہ گھر پہنچ کر نوکر سے جوتا واپس سیڑھی پر پہنچوادیں گے۔ 'میری عید' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک خاں صاحب کی قسم کے آدمی صحن سے لپکتے ہوئے میرے نزدیک پہنچ کر لگے زور زور سے چلانے، اجی حضرت! یہ کیا حرکت ہے یہ میرا جوتا ہے لاحول ولاقوۃ شریفوں کی سی صورت اور یہ کرتوت، جوتے بھی چرانے تھے تو عید میں۔ ایک سے ایک قیمتی اور خوبصورت نئے جوڑے پہن کر لوگ آئے ہیں۔ مجھ غریب کے پرانے جوتے پر کیوں نظر انتخاب پڑی۔ میں جواب کیا دیتا کھسیانی صورت بنا کر خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا معاف کیجیے گا۔ میرا جوتا بھی بعینہٖ اسی قسم کا تھا میں نے اچھی طرح غور نہیں کیا اور غلطی سے اپنا جوتا سمجھ کر پہن لیا۔ خاں صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا غلطی کی ایک ہی کہی۔ دو انچ ڈھیلا جوتا پہننے کے بعد بھی آپ کو اپنے ہی جوتے کا شبہ رہا۔''[3]

بحیثیت مجموعی مصنف نے 'میری عید' میں ایک ایسے مسئلے کو موضوع بنایا ہے۔ جس پر انجم مانپوری سے قبل

کسی بھی مصنف کی رسائی نہیں ہوسکی اور یہی وہ طنزیہ پیرایہ ان کے مضامین کی کامیابی کا ضامن ہے۔

'مرنے کے بعد' انجم مانپوری کا چوتھا اور آخری مجموعۂ مضامین ہے۔ یہ مجموعہ 1958 میں انجم مانپوری پبلشنگ ہاؤس کی جانب سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کو خود انجم مانپوری نے ترتیب دیا تھا لیکن اس کی اشاعت 27 اگست 1958 کو مانپوری کی وفات کے بعد عمل میں آئی۔ 'مرنے کے بعد' میں مانپوری کے پانچ طنزیہ و مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔ 'ناخواندہ مہمان'، 'مرنے کے بعد'، 'انٹرویو'، 'جھوٹ کا نباہ'، 'اسٹیشن کی سیر' لیکن ان کا مضمون 'مرنے کے بعد' ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے بعض مشاہیر کی رائے میں 'میر کلو کی گواہی' کے بعد ان کا مضمون 'مرنے کے بعد' ایک شاہکار طنزیہ تحریر ہے۔ 'مرنے کے بعد' 1952 میں ڈھاکہ کے رسالے 'خاور' میں شائع ہوا تھا لیکن اس مضمون کی طنزیہ و مزاحیہ انفرادیت کی بنا پر اس مضمون کو اس زمانے کے کئی اردو رسالوں نے بھی شائع کیا۔ یہ مضمون انشائیہ سے زیادہ ایک طنزیہ مضمون کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں انشائیہ کی طرح بات سے بات تو نکالی گئی ہے اور اس میں ذہن کی آزاد ترنگ کا اظہار بھی ہے لیکن ان تمام باتوں کو اور ترنگوں کو واقعاتی انداز میں ربط و تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

'مرنے کے بعد' میں مزاحیہ عناصر بھی ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے اس میں طنزیہ پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ اس مضمون میں انجم مانپوری نے اپنی موت کے بعد پیش آنے والے واقعات کی تصوراتی تصویر پیش کی ہے۔ اپنے مرنے کا ذکر مانپوری نے اس طرح کیا ہے:

''غالباً شب کے تین بجے ہوں گے کہ یکایک سینے میں کچھ درد محسوس ہوا اور معلوم ہوا جیسے کسی نے کلیجے کو چٹکی سے لے کر مسل دیا ہو منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی یہ دردناک چیخ سن کر گھر کے کل لوگ دوڑ پڑے ارد گرد جمع ہو کر گھبرائی آواز میں زور زور سے پوچھنے لگے کہ کیا ہوا کیسی حالت ہے۔ اب لاکھ کوشش کرتا ہوں مگر حلق سے آواز ہی نہیں نکلتی فوراً آدھ گھنٹے کے اندر کئی ڈاکٹر مع سول سرجن یکے بعد دیگرے بلائے گئے ان سب کے پہنچتے پہنچتے میں اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ ہو گیا اور میری روح جسم سے علیحدہ کردی گئی۔4

انجم مانپوری نے زندگی کی سچائیوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مرنے کے بعد اسباب اور اعزا حد درجہ رنج و غم میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور محفل میں ان کا ذکر ہوتا ہے لیکن مانپوری کے مطابق آج کی مادہ پرست دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ عزیز و اقارب دوست احباب مرنے والے کو سپرد خاک کر کے اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

مضمون کے آخر میں مصنف نے یہ انکشاف کیا ہے کہ مرنے کے بعد کی یہ ساری کیفیتیں انھوں نے خواب میں دیکھی تھی۔

مرنے کے واقعہ کو مانپوری نے مضمون کے آخر میں کچھ اور دلچسپ بنا دیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے جب اس خواب کا ذکر دوستوں سے کیا تو دوستوں نے اس خواب کی خبر کو کمال مبالغے کے ساتھ پورے شہر میں پھیلا دیا کہ واقعی میری روح پرواز کر گئی تھی اور عالمِ

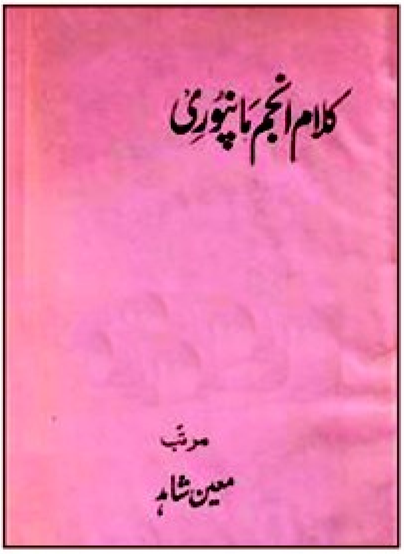


بالا سے پھر لوٹ آئی اور میں دوبارہ زندہ ہو گیا۔ جو شخص بھی آتا مجھ زندہ مردے سے موت کے بعد کیا کیفیت ہوتی ہے دریافت کرنا شروع کر دیتا انجم مانپوری نے یہاں اپنے چند دوستوں مثلاً میاں مّی، احقر، رضی، ولایت، محمود وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے بڑے دلچسپ انداز میں اس دنیا کو جہنم الستان اور آسمان کو جنت الستان کی جیسی اصطلاحوں سے یاد کیا ہے اس طرح انھوں نے جسم کے لیے جسم الستان اور عالم ارواح کے لیے روح الستان کی ترکیبیں بھی واضح کی ہیں۔ ان کے مضمون کا یہ حصہ طنزیہ بھی ہے مزاحیہ بھی اور عبرتناک بھی، یہ اقتباس دیکھیے:

''محمود نے اپنے تمسخرانہ انداز کو متانت میں بدل کر کہا کہ آخر جنتستان سے پھر لوٹ کر اس دنیا جہنمستان واپس آنے کی کیا وجہ ہوئی میں نے بھی اس کی اس شرافت آمیز گفتگو کو نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا کہ بھائی صاحب اس جسمستان سے روحستان کے لیے یکایک روانہ ہونے کو ہو گیا، لیکن ان دونوں ممالک یعنی جنتستان اور ہندوستان کے درمیان بیچ سرحد گورستان سے اب محض آپ لوگوں کی محبت کی کشش لوٹا لائی حالانکہ سرحد تک پہنچانے اور سی آف کرنے کے لیے جو لوگ ساتھ گئے تھے ان لوگوں نے زبردستی ٹیل ٹال کر اس پار بھیجنے کی بہت کوشش کی بلکہ عین بونڈری کے ایک گڑھے میں ٹیل کر بھاگ بھی آئے مگر میں گرد جھاڑ کر ان کے پیچھے پیچھے واپس چلا آیا۔''5

انجم مانپوری کے اس شاہکار طنزیہ و مزاحیہ مضمون میں طنز و مزاح کے پردے میں سنجیدہ سماجی اور تہذیبی حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان جب تک زندہ رہتا ہے۔ کس کس طرح اپنے جسم کے ساتھ ساتھ اپنی ہزاروں خوش فہمیوں کو بھی پالتا رہتا ہے دراصل مانپوری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بقائے دوام کے لیے ضروری ہے کہ انسان عوام الناس کے فائدے و اصلاح کے لیے ایسی خدمات انجام دے کہ مرنے کے بعد واقعی ان کے غم خواروں کی تعداد کی نا کوئی حد ہو نہ حساب۔ اگر مانپوری کے ادب اور اردو طنز و مزاح میں ان کے مقام اور مرتبے کا اندازہ لگانا ہو تو 'میر کلو کی گواہی'، 'میری عید' اور 'مرنے کے بعد' کا مطالعہ کافی ہوگا۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انجم مانپوری ایک ایسے بلند پایہ طنز و مزاح نگار ہیں جو اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی پہلی صف کے فن کاروں میں شامل کیے جانے کا پورا حق رکھتے ہیں۔

راہ مضمون تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے باب سخن
(ولی)

حواشی

1 طنزیات مانپوری حصہ اول، میر کلو کی گواہی، مرتب مظفر بخاری، لاہور، ص 6-10
2 طنزیات مانپوری حصہ دوم، میری عید، ص 282
3 طنزیات مانپوری حصہ دوم، میری عید، ص 283-84
4 مضمون 'مرنے کے بعد' مجموعہ مرنے کے بعد، ص 39
5 ایضاً، ص 47

**Dr. Shabbir Alam**
Dr. Bhim Rao Ambedkar College
University of Delhi
Delhi- 110032
Mob.:9968492060
shabbirdu@gmail.com

نصرت پروین

# دہلی کی تہذیبی روایت کا امین
# بشیر الدین احمد دہلوی

**بیسویں** صدی کے ممتاز و مشہور ادیب، شاعر، ناول نگار، محقق، مورخ اور دانشور مولوی بشیرالدین احمد دہلوی کی پیدائش 4 اگست 1861 اور وفات 23 اگست 1927 دہلی میں ہوئی۔ یہ شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد کے اکلوتے صاحب زادے تھے۔ بشیر الدین احمد دہلوی تقریباً بیس کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کتابوں میں 'اقبال دلہن 1908 'حسن معاشرت' 1912 'اصلاح معیشت' 1917 'تاریخ بیجانگر' 1910 'واقعاتِ مملکتِ بیجاپور، حصہ اول، دوم، سوم 1915 'واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی، حصہ اول، دوم، سوم 1919 'نشاط عمر' 1911 'عصائے پیری' 1914 'حرز طفلاں' 1915 'عزم بالجزم' 1921 'شمع ہدایت' 1921 'حکایت لطیفہ' 1925 'لطائف عجیبہ' 1925 'مجموعہ استاذ' اور 'لکچروں کا مجموعہ' 1918 جس کے پہلے حصے میں 1888 سے 1895 تک کے 22 لکچرز اور اسی کتاب کے دوسرے حصے میں 1895 سے 1905 تک کے 22 لکچرز شامل ہیں۔ بشیر الدین احمد نے اپنے والد ڈپٹی نذیر احمد کے لکچرز کو یکجا کر کے دو جلدوں میں شائع کیا۔ 'مجموعہ نظم بے نظیر' میں بھی نذیر احمد کی ہی نظموں کو شائع کیا گیا ہے۔ 'فرامین سلاطین' 1926 میں خاندان سلاطین خلجی سے لے کر فرامین عادل شاہی بیجاپور کی یادگارِ فرامین اور فہرستِ تصوراتِ عکسی وغیرہ شامل ہیں۔ 'لختِ جگر' حصہ اول اور دوم 1921، دیوانِ بشیر' 'انشائے بشیر' 1924، حیات قیصری'، 'تمثال الامثال'، 'درد دل' رسالہ 'مس لیڈز' بھی شامل ہیں۔ ان تمام کتابوں کی فہرست مضامین سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے کارنامے کس درجہ وسیع اور بلند ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے اس دور کی ادبی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، اور اخلاقی صورت حال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کتابیں اس قدر اہمیت کی حامل ہیں جس میں اس عہد کی تاریخ اور اس کے کلچر سے ہمیں روبرو کراتی ہیں اور اتنا ہی نہیں یہ تمام تصانیف اس عہد کا آئینہ بھی ہیں جس میں 115 سال پرانی ہندوستانی تاریخ خصوصا دہلوی تہذیب وتمدن سے واقف ہو سکتے ہیں اور اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر بھی کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے انھوں نے جس زمانے میں اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا اسے ہر لحاظ سے تبدیلیوں کا دور کہا جاتا ہے اور اس زمانے میں ان کی شہرت ومقبولیت سے بیش تر احباب واقف تھے لیکن آج کے دور میں ان کو ناول نگار کی حیثیت سے شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ان کی تاریخی کتاب 'واقعات درالحکومت دہلی' کی وجہ سے ہی محض ان کی شناخت ابھی تک برقرار ہے۔

بشیر الدین احمد دہلوی کا شمار اردو ناول کے اولین معماروں میں ہوتا ہے۔ ان کی تمام تصانیف جن کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا گیا اگر ہم ان پر ایک نظر بھی ڈالیں تو یہ واضح ہوگا کہ ان کی چند کتابیں اس صنف میں اولیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ امریکی پادری ڈاکٹر سلوینس اسٹال کی چار کتابوں کا انھوں نے اردو میں ترجمہ کیا جس کا عنوانات حرز طفلاں، نشاط عمر، عصائے پیری اور شمع ہدایت ہیں۔ ان کتابوں میں نوجوان بچوں کی نفسیات کو باقاعدہ طور پر مکمل نفسیات کے پیرایے میں لکھی گئی ہم پہلی کتاب تسلیم کر سکتے ہیں۔ اس بات کی گواہی خود اس کے مصنف بشیر الدین احمد دہلوی نے کتاب کے مقدمے میں دی ہے کہ اس موضوع پر ہندوستان میں کوئی کتاب اس وقت تک نہیں لکھی گئی تھی۔ کتاب کے مقدمے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اس کا ترجمہ مصنف نے بہت ڈرتے ڈرتے ہی کیا تھا۔ یہ تو ترجمے کی بات ہے لیکن بہت افسوس ہے کہ بیسویں صدی کے فکشن نگاروں نے بھی ان کو کس طرح فراموش کر دیا گیا۔

بشیر الدین احمد دہلوی کے ناولوں میں بعنوان اقبال دلہن، حسن معاشرت اور اصلاح معیشت اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور ہر ایڈیشن میں کم از کم دو سے چار ہزار کتابیں منظر

عام پر آئیں اور اس کے ساتھ ان ناولوں کی اس قدر پزیرائی ہوئی تھی کہ پنجاب، آگرہ اور اودھ کی ٹکسٹ کمپنیوں نے اپنے مدارس کے نصاب میں شامل بھی کیا تھا۔ لیکن ان کتابوں کو بھی فراموش کر دیا گیا۔ اگر ہم بیسویں صدی کے ناول نگاروں کا مطالعہ کریں تو بشیر الدین احمد دہلوی کے ناول کا ذکر کہیں نہیں کیا جاتا ہے۔ حالانکہ انھوں نے اپنے والد ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی تقلید کرتے ہوئے منفرد اسلوب اور اسی طرز اظہار میں رسم و رواج کی ایسی نقاشی کی ہے جس میں دہلی کی تہذیب، رسم و رواج اور یہاں کے ثقافتی لوک گیتوں کی بہترین مثال پیش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جن نکات کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے ان میں روایتی تعلیم کے فروغ، لندن کی آب و ہوا، نوجوان ذہن کی آبیاری اور فیشن طلب نئی باتوں کی اہمیت وغیرہ کا بھرپور نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ان کے ناولوں کا مطالعہ کئی حوالوں سے اہم ہے۔ ایسے موقعے پر صالحہ عابد حسین کا خیال آتا ہے جو انھوں نے اپنے مضمون بعنوان 'دلی کی خواتین تہذیبی وسماجی زندگی' میں رسم و رواج کی پابندی کے تعلق سے کیا خوب لکھا ہے، پہلے اسے ملاحظہ کریں پھر بشیر الدین احمد کے ناولوں سے اقتباس دیکھیے جس میں کتنی مماثلت پائی جاتی ہے:

''اسی طرح میلاد باری باری سب اپنے اپنے گھروں میں کرتے.. اس وقت عورتوں کی زندگی میں ان کی بڑی اہمیت تھی اور ان کی تہذیبی زندگی کا یہ ایک بڑا جزو تھی۔ ایک حد تک آج بھی ہے۔ شادی بیاہ، منگنی، سانچق وغیرہ کی رسمیں تو اس تہذیب کی گویا جڑیں تھیں۔ زندگی میں چہل پہل اور خوشی اس سے پیدا ہوتی تھی۔ تعلقات اس میں بنتے اور بگڑتے تھے۔ روٹھنا، منانا اس میں ہوتا تھا۔ یہ تقریب سعید دو چار دس پانچ دن کی نہیں ہوتی تھی، مہینوں اس کی مصروفیت رہتی۔''

(دلی کی تہذیب، صالحہ عابد حسین، اردو اکادمی، دہلی 2001، ص 56)

اب بشیر الدین احمد دہلوی کے ناول 'اقبال دلہن' سے ایک اقتباس دیکھیے جس میں رسم و رواج کو پیش کرتے ہوئے کتنی باریک بینی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ منگنی کی رسم کے بعد جس طرح شادی اور جہیز کی تیاریاں کی جاتی ہیں اسی طرح بارات آنے سے قبل ادا کی جانے والی ایک رسم 'سانچق' کی منظر کشی کتنی خوبصورتی سے کی گئی ہے، ملاحظہ کریں:

''سانچق کی رسم بھی منگنی کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ جمعرات کو سانچق ٹھہری اور جمعہ کو بارات ہفتے کی وداع۔ بری پہلے سے طیار [تیار] تھی۔ خوان پوش، کشتی پوش اور تورے پوش ڈھک دیے گئے۔ سہاگ پُڑا الگ جھم جھم کر رہا تھا۔ گیارہ من میوہ، ڈھائی من مصری، چاندی کی قلعی کی چار ٹھلیاں دو میں دودھ اور دو میں شربت۔ بانس کی پچپیوں کے سیکڑوں جو گھڑے رنگ برنگ کے کاغذات اور پنی سے منڈھے ہوئے ان میں چار چار نقشیں ٹھلیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اس میں سونے چاندی کی دو کنگھیاں دو شیشیاں عطر سہاگ، ناگرموتھا، بال چھڑ صندل، زعفران وغیرہ خوشبودار

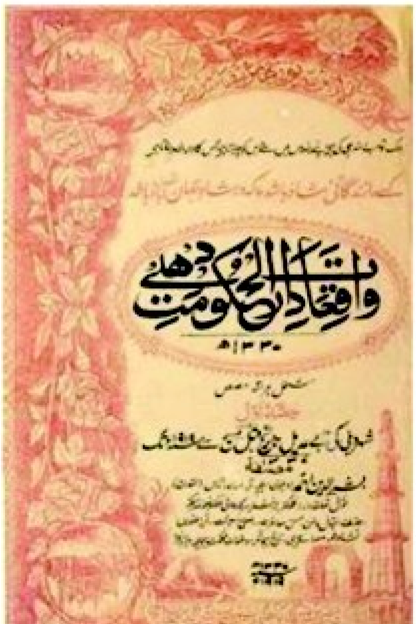


چیزیں اور اکیس روپے دلہن کی بہنوں کے نیگ، چوتھی کا جوڑا، سرمے اور مسی کی دو بڑیاں، تیل اور گلاب کے چاندی کے کنٹر، سرخ ریشمیں ململ کا دوپٹہ اور اس ململ کے چولے کا سبز کپڑا۔''

(اقبال دلہن، بشیر الدین احمد دہلوی، دلی پرنٹنگ ورکس دہلی، 1913، ص 131)

اسی طرح سانچق سے قبل مائیو کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ناول نگار اس رسم کی بھی عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں۔ 'اقبال دلہن' ناول میں چالیس ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ دسواں باب دلہن کی تلاش سے لے کر منگنی، جہیز کی تیاری، مائیوں بٹھانا، سانچق، بارات، رخصتی، ولیمہ، چوتھی، چالے سے لے کر بچے کی ولادت تک اتنے رسم و رواج کی پابندی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو جس طرح بیان کیا گیا ہے گویا اس میں دہلی کی تاریخی تہذیبی اور ثقافتی رسم و رواج اور یہاں کی لوک گیتوں کی ایک تاریخ تحریر کی گئی ہے۔ ایک بہترین ناول ماضی کی تاریخ اور حال کا ترجمان ہونے کے ساتھ مستقبل کے پوشیدہ راز اور حیات نو کے لیے پیغام بھی ہوتا ہے جو زندگی کو بہتر بنانے میں مزید حوالوں سے مددگار ثابت ہوتا ہے اور یہ خوبی ہی مقصد حیات کہلاتی ہے۔ اس اعتبار سے بشیر الدین احمد دہلوی کا ناول اس کی عمدہ مثال ہے۔ بشیر الدین احمد نے اپنے والد ڈپٹی نذیر احمد کی وراثت کو نہ صرف محفوظ کیا بلکہ اسے مضبوط اور توانا بھی بنایا۔

بشیر الدین احمد دہلوی کے اہم معاصرین اور اس عہد میں لکھے گئے ناولوں کا اگر سرسری مطالعہ بھی کریں تو سب سے پہلا نام مرزا ہادی رسوا کا آتا ہے۔ بشیر الدین احمد اور رسوا کے یہاں کردار، تکنیک اور اسلوب میں مماثلت ضرور پائی جاتی ہے لیکن رسوا کے ناولوں میں مکالماتی بیانیہ زیادہ درپیش ہیں۔ رسوا کا نسوانی کردار بعض صورتوں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور بشیر الدین احمد محض اصلاحی پہلو اجاگر کر پاتے ہیں۔ ان کے کردار کا مقصد محض اسلامی مذہب کی راہ پر چل کر انسانی زندگی کی تزئین وتہذیب اور معاشرتی اخلاق واشتراک کا یقین کرنا ہے۔ ہاں لیکن رسوا کے مقابلے بشیر الدین احمد شادی بیاہ اور ازدواجی زندگی کو زیادہ بہتر ڈھنگ سے پیش کرنے میں کامیاب ہیں۔ رسوا کے بعد اگر ہم عبدالحلیم شرر کے ناولوں کا مطالعہ کریں تو شرر کے سماجی ناولوں اور بشیر الدین احمد دہلوی کے ناولوں کا پس منظر ایک جیسا ہی ہے۔ مذہبی آدمی یہ دونوں تخلیق کار ہیں۔ 'بدرالنساء کی مصیبت'، 'آغا صادق کی شادی' اور 'اقبال دلہن' میں شادی بیاہ اور رسم و رواج کو پیش کیا گیا ہے لیکن بشیر الدین احمد نے 'اقبال دلہن' میں جس طرح رسم و رواج کی پابندی کی وہ شرر کے یہاں کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس عہد کے بڑے تخلیق کاروں میں راشد الخیری کا نام بھی آتا ہے۔ ان دونوں کے ناولوں کی اشاعت عنقریب ہی ہے۔ تعلیم نسواں کی اشاعت اور اس کے فروغ میں روشن خیالی کا گہرا مشاہدہ جس طرح راشد الخیری کرتے ہیں اور تاریخی واقعات کو جن ہنرمندی سے بیان کرتے ہیں اس معاملے میں بشیر الدین احمد کمزور ہیں۔

بشیر الدین احمد اور راشد الخیری کے ناولوں میں

مماثلت جہاں سب سے زیادہ پائی گئی ہے، وہ ان کی دہلوی نثر، دہلی کے سماجی اور تاریخی واقعات کا بیان ہے۔مگر ان دونوں کی انفرادیت جس مقام پر قائم ہوتی ہے وہ راشدالخیری کے یہاں ماضی کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے جدید رجحانات کو پیش کرنے میں ایک فنی نقطہ نظر کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ بشیرالدین احمد کے یہاں حال سے مستقبل کا سفر طے کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان کا نقطہ نظر حال میں ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں اپنا فیصلہ خود کرنے کی صلاحیت کرداروں میں موجود ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس عہد میں راشدالخیری ایک بڑے اہم تخلیق کار ہیں جن کے یہاں نذیر احمد کی طرز تحریر، زبان و بیان اور تمثیلی حالات و واقعات کو یا ان اثرات کو پیش کرنے میں بشیرالدین احمد سے زیادہ قریب وہ نذیر احمد کے ہوجاتے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم کا ناول 'ثالث بالخیر' اور بشیر الدین احمد کا ناول 'اقبال دلہن' موضوع کے لحاظ سے ملتے جلتے ہیں۔ ان دونوں ناولوں میں بیش تر حصہ ازدواجی زندگی کا شامل ہے، لیکن ایک میں مغربی معاشرت کی بھرپور عکاسی ہے اور ایک مشرقی معاشرت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اپنے ناولوں میں داستانوی عناصر کا ان دونوں نے خوب استعمال کیا ہے۔ زیورات، کپڑے اور جہیز کا سارا سامان اور اس کے بیان میں بھی مماثلت زیادہ پائی جاتی ہے۔ فرسودہ رسم و رواج کی وجہ سے معاشرے میں جو برائیاں پھیل چکی تھیں اس کو یلدرم سے زیادہ بہتر طریقے سے دور کرنے کی کوشش بشیرالدین احمد کرتے ہیں۔ آخر میں اگر ہم پریم چند کے یہاں بھی دیکھیں تو یہ دونوں ہر لحاظ سے بہت مختلف ہیں لیکن پریم چند کے دو ناول، ایک 'ہم خرما اور ہم ثواب' اور دوسرا 'روٹھی رانی' کے عنوانات میں کہیں کہیں جہاں شادی اور رسم و رواج کو بیان کیا گیا ہے وہاں مماثلت پائی جاتی ہے۔ پریم چند نے جہاں بھی رسم و رواج کی پابندی کی یا اس منظر کو پیش کیا وہاں ان کی نظر کردار کی حرارت پر زیادہ ہوتی ہے۔ بشیرالدین احمد ایسے موقع پر دہلی کے ایک معزز خاندان کے تمام مثبت رسم و رواج کو ہی پیش کرتے ہیں جس کا دائرہ مخصوص ہے مگر بشیرالدین احمد رسم و رواج کا بیان اور منظر کشی پریم چند سے زیادہ بہتر ڈھنگ سے پیش کرنے میں کامیاب ہیں۔

بشیرالدین احمد نے اپنے ناولوں میں دہلی کی تہذیبی و ثقافتی روایتوں کو اس طرح زندہ رکھا ہے کہ جس سے ہمیں اس وقت کی عورتوں کی مذہبی، سماجی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی، دلی میں تقریبات کی دھوم دھام، مذہبی عقیدے کا سماجی زندگی میں کیا مقام تھا۔ میلاد کی محفلیں، شادی بیاہ منگنی، سانچق وغیرہ کی رسموں میں یہاں کی تہذیب کی جڑیں، جہیز اور بری کا سامان، دہلی کا دستور، شادی میں، سمدھنوں کی شان وشوکت اور نخرے، تانے بانے وغیرہ ان تمام چیزوں کا بیان دراصل یہاں کے کلچر میں جو چیزیں اخلاق اور زندگی میں شامل تھیں اس وقت یہاں کی خواتین کے لیے یہ بڑی اہم چیزیں تھیں۔ اس پر بشیرالدین احمد کو عبور حاصل ہے۔ اگر ہم دہلی کی تہذیبی روایت کا مطالعہ کریں تو دلی میں جو شادی بیاہ کے موقعے پر ایک دستور تھا خصوصاً جہیز لے جانے کا، وہ کس شان بان سے دولہا کے گھر سامان پہنچتا تھا جس میں مسرت و شادمانی کی فضا میں بہت ساری رسموں کو انھوں نے بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔ اس وقت عورتوں کی زندگی میں شادی بیاہ کی بڑی اہمیت ہوتی تھی جو آج کے وقت میں مسائل کافی بدل چکے ہیں۔

بشیرالدین احمد نے اپنے ناولوں سے یہ ثابت کردیا کہ تہذیب کی تشکیل میں عورتوں کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہم بشیرالدین احمد دہلوی کو دہلی کی تہذیبی و ثقافتی روایت کا امین مان سکتے ہیں۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بشیرالدین احمد نے اپنے ناولوں میں پرانی تہذیب، پرانی قدروں، پرانی رسموں اور اپنے بزرگوں کے بنے بنائے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے نئی تعلیم اور نئے زمانے کے ساتھ بدلتی ہوئی دنیا کو بھی پیش کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں جدید تعلیم کو حاصل کرنے کے بعد نوجوان نسلوں میں ایک انقلاب کی صورت بھی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن بشیرالدین احمد اس زمانے کے ڈھانچے اور اس زمانے کے کلچر، یہاں کی تہذیب، رہن سہن، ریت رواج وغیرہ کے بیان میں پہلے کی تہذیب اور بعد کی سماجی صورت حال اور ان میں پیدا ہونے والے مسائل پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ یہ پرانی تہذیب کے دلدادہ ہیں اور نئی قدروں کو بھی اپنے سینے سے لگاتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں کرداروں نے یہ ثابت کیا کہ اخلاق اور تہذیبی قدریں اگر باقی رہتی ہیں تو پرانی اور نئی تہذیب کی آمیزش سے ایک نئے اور زیادہ دلکش رنگ وآہنگ کا کلچر پیدا ہوتا ہے جس کی بنا پر انسانیت کا ایک اور منفرد رنگ ابھرتا ہے۔ اس خوبیوں کی داد دینی ہوگی کہ بشیرالدین احمد نے اپنے ناولوں میں دلی کی عورتوں کی ایک ایسی تاریخ رقم کی ہے جس میں یہاں کی تہذیبی، مذہبی، اخلاقی، اور لسانی قدروں کو ان لوگوں نے اپنے سینے سے کس طرح لگا رکھا تھا، اس کی عمدہ ترجمانی کی گئی ہے۔ بشیرالدین احمد نے اپنے ناولوں سے یہ ثابت کر دیا کہ تہذیب کی تشکیل میں عورتوں کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہم بشیرالدین احمد دہلوی کو دہلی کی تہذیبی وثقافتی روایت کا امین مان سکتے ہیں۔

بشیرالدین احمد نے اپنے سے قبل ناول کی تکنیک کو دیکھا اور سمجھ رکھا تھا اس لیے ان کے یہاں جدید تعلیم، ریاضی اور سائنس کی دلچسپی نے ایک شریف اور معمولی کردار جو کہ ناول 'اقبال دلہن' میں اقبال مرزا کا ہے، اسے آئی اے اس کے امتحان پاس کرنے کے بعد لندن کے سفر کے لیے روانہ ہوا۔ ان کے مزاج میں حقیقت بینی اور حقیقت نگاری بھی پیدا کر کے دکھائی۔ ان خوبیوں کے ساتھ دہلی میں رہتے ہوئے یہاں کے اہل زبان کی اصل بول چال اور اس کی کھلی فضا نے ایک جاذب اور دلکش رنگ وآہنگ کو بھی دکھایا۔ ایک خوبصورت نوجوان لڑکا جو کئی خوبیوں کا مالک اور ہر صلاحیت سے بھرپور اقبال مرزا وہ لندن کی آب وہوا میں اپنی تہذیبی روایت کو برقرار رکھتا ہے لیکن ہندوستان آکر ایک ایسے موڑ پر جب اس کی بیوی کو اولاد نہیں ہوتی تو یہ بغیر اطلاع یا اجازت کے دوسرا نکاح کر لیتا ہے۔ ایسے میں بشیرالدین احمد نے مرد کی نفسیات اور اس کے تخیل کے متضاد تصور میں حقیقی عنصر کو کس طرح ظاہر کیا یہ اہم ہے۔ ان حالات اور گرد وپیش کے معاشرے کو جس طرح دکھایا گیا اس سے قدم قدم پر ان کی تخلیقی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

انھوں نے محض اپنے ناولوں میں خیالی قصے نہیں گڑھے ہیں بلکہ حقیقی واقعات میں فن کے مطابق ترمیم و تنسیخ بھی کی ہے۔ واقعات کے انتخاب میں انھوں نے جگہ جگہ کردار سے وہ کام بھی لیا جس میں بڑے سلیقے اور ہنر مندی سے جب جیسے حالات ہوئے اس مطابق اس کا رخ بھی موڑ لیا گیا جو بعض اوقات قاری کو حیرت میں بھی ڈال دیتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تجربہ کہیں نہ کہیں مصنف کی زندگی میں اپنے تجربات اور مشاہدات سے جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت کو بنیاد بنا کر تخلیقی عنصر کی مدد سے واقعات میں وہ لچک پیدا کر دی گئی ہے کہ ہمارے اندر ان کے ناولوں کو پڑھنے کا تجسس پیدا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ زمانہ ناولوں کے سوانحی عنصر کا ہے کیونکہ اس دور میں کئی ناول ایسے لکھے گئے ہیں جس میں سوانحی عناصر نمایاں ہیں۔ ان میں سرشار، شرر، رسوا اور بعد میں پریم چند کے یہاں بھی قصے ان کی زندگی کے واقعات پر مبنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی شخص کے لیے اس کے اپنے تجربات اور مشاہدات سے بڑھ کر حقیقی اور جذباتی چیز شاید ہی کچھ اور ہو سکتی ہو۔ اس لیے بشیر الدین احمد کے بیشتر ناولوں کی بنیاد مجھے ان کی اپنی زندگی کے واقعات سے ملتی جلتی بھی محسوس ہوتی ہے جس میں یہ اپنے معاصرین سے منفرد اور کامیاب نظر آتے ہیں۔

جیسا کہ بشیر الدین احمد نے لکھا بھی ہے کہ انگریزی کے ناولوں کا بھی مطالعہ کیا تھا کیونکہ قدیم انگریزی ناولوں میں منظر نگاری پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں اس کی بھرپور تقلید کی ہے۔ ناولوں کے علاوہ بھی الگ الگ مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔ اچھے اور برے دونوں طرح کے نمونے شامل کیے ہیں۔ طویل بیانات سے پرہیز کیا گیا ہے۔ قدرتی مناظر کو انھوں نے بالکل نظر انداز کیا ہے۔ مناظر کی جگہ پر جذبات نگاری کو زیادہ بہتر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ ڈرامائی عناصر بھی نہیں دکھائے گئے ہیں اس لیے کہانی پہلے سے بنی بنائی محسوس ہوتی ہے۔ ناول کی وہ خصوصیات جو انسانی زندگی کے بے ربط واقعات کو مربوط رکھ کر بے معنی و مقصد زندگی میں قدروں کی تخلیق اس طرح کرتی ہے جس سے ناول کی ہیئت اور معنویت کا اندازہ ہوتا ہے وہ ناول کے کردار سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ خوبیاں ناول کے اچھے کردار کے کاندھوں پر ہوتی ہے جو باقی

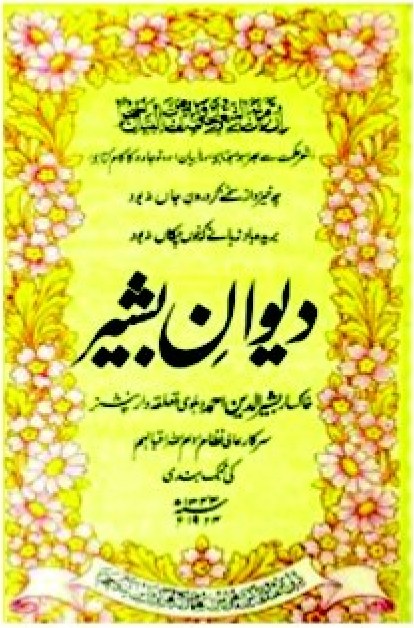


کردار کی خوبیوں یا خامیوں کو اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ بشیر الدین احمد کو جو اس زمانے میں اتنا سراہا گیا تھا شاید ان خوبیوں کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے کردار کے زندہ رہنے کی وجہ شاید اصلاحی و مقصدی خوبی ہی ہے۔ ان کے ناولوں میں عورتوں کا کردار مرد کردار سے زیادہ طاقتور اور ایماندار ہے جو آخر دم تک دھوکہ نہیں دیتی اور وفا کی دیوی ثابت ہوتی ہے۔ باغیانہ جوش ان کے نسوانی کردار میں کہیں نظر نہیں آتا۔ تین عورتیں ان میں ایک بیوہ ماں دوسری بڑی بیگم اور تیسری چھوٹی بیگم کو کہ سوکن ہے یہ کردار کی تشکیل میں جو مشاہدے کی گہرائی اور نفسیاتی بصیرت نظر آتی ہے وہ مرد کردار پر بھاری ہے۔ یہ مثالی کردار مخصوص خیالات کو پیش کرنے میں اہم ہیں۔ ان مثالی کرداروں سے ہم مرعوب تو ہو سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ان کو احترام کی نظر سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ انتہائی رنج و غم میں بھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتی جس سے ان کے خاندان اور پرورش پر کوئی سوال اٹھائے جب کہ یہ ہر قدم بڑھانے کی اہل ہیں۔ ان کے مکالمے مختصر ہیں ان کے کردار نذیر احمد کے کرداروں کی طرح بحثوں میں نہیں لگے رہتے ان کے مکالموں میں حقیقی گفتگو کی خوبی بھی نظر آتی ہے۔

بیسویں صدی کا احاطہ کرتے ہوئے اردو ناول کے ارتقا میں جتنی اہم تنقیدی و تحقیقی کتابیں شائع کی گئی ہیں ان میں بشیر الدین احمد دہلوی کے کارناموں کو نظر انداز کیا گیا۔ ان تمام کتابوں کی اہمیت اور اس کی نوعیت منفرد ہے۔ علی عباس حسینی کی کتاب 'ناول کی تاریخ و تنقید'، احسن فاروقی کی کتاب 'ناول کی تنقیدی تاریخ'، سہیل بخاری کی کتاب 'اردو ناول نگاری' احسن فاروقی کی ایک اور کتاب 'ادبی تخلیق اور ناول'، یوسف سرمست کی کتاب 'بیسویں صدی میں اردو ناول' شائع ہوئی۔ مجموعی طور پر ان تمام کتابوں میں ناول کا تنقیدی و تحقیقی یا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ اگر ہم ان تمام کتابوں کا مطالعہ کریں تو بہت حیرت ہوگی کہ بشیر الدین احمد دہلوی کے ناولوں کو کس طرح فراموش کیا گیا۔ اگر کسی نے ان کا نام ناول نگار کے طور پر لیا بھی ہے تو اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ واقعی ڈپٹی نذیر احمد کے صاحبزادے بشیر الدین احمد دہلوی ہی ہیں یا کوئی اور ہم نام ناول نگار ہیں۔ حالاں کہ بشیر الدین احمد دہلوی کے ناول مغربی اصولوں اور معیاروں کو عملی طور پر پیش کرنے میں بھی بہت آگے ہیں۔ بیسویں صدی کی امتیازی اور اہم خصوصیات ہمیں ان کے ناولوں میں ضرور نظر آتی ہیں۔ حالاں کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور میں رسوا اور شرر کے علاوہ تقریباً تمام بڑے اہم ناول نگاروں کو توجہ میں نہیں لایا گیا تھا۔ بشیر الدین احمد دہلوی اس پورے عرصے میں مسلسل لکھتے پڑھتے رہے ہیں۔ ان کا مقصد انسانی زندگی اور اس کے حالات کو بہتر بتانا ہے۔ ان تمام باتوں کے بعد اب ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ ہم بیسویں صدی کی ناول نگاری میں بشیر الدین احمد دہلوی کا نام شمار کریں اور ان کے ناولوں پر گفتگو کریں کیونکہ انھوں نے اردو ادب کو بڑی صحت مند اور پائندہ روایات دی ہیں۔ خصوصیات کی بنا پر ان کے کارنامے بڑی قدر و اہمیت رکھتے ہیں۔ دہلی معاشرے کی ایسی مکمل جس میں دہلی کی تہذیب، روایت اور یہاں کی جیتی جاگتی جامع تصویر اور اس میں زندگی کا ہر پہلو، ہر جذبہ یہ حقائق کو دیکھنے اور دکھانے اور اس کو اصل حالت میں پیش کرنے، فرد کی نفسیات، نفسیاتی زندگی کی پیش کش وغیرہ جیسی اہم خصوصیات کو برتنے کا فن بشیر الدین احمد دہلوی کے ناولوں میں بڑا دلکش اور منفرد ہے۔

■

**Nusrat Perween**
B-154, Abul Fazal Enclave,
Jamia Nagar, New Delhi-110025
Mobile: 9015133636
Emai: nusrat.rizwan07@gmail.com

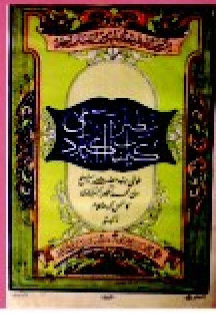

حنا کوثر



# ہندوستانی تہذیب کا عکاس

# نظیر اکبرآبادی

نظیر اکبرآبادی کا اصل نام سید ولی محمد اور تخلص نظیر تھا۔ والد کا نام محمد فاروق، والدہ نواب سلطان خاں قلعہ آگرہ کی بیٹی تھیں۔ نظیر اکبرآبادی کے والدین کی تیرہ اولادیں تھیں لیکن کوئی زندہ نہیں بچی، صرف نظیر زندہ رہے۔ ان کی پرورش والدین نے بڑے نازو محبت سے کی۔ ولادت 1735 کو دہلی میں ہوئی۔ وہ محض 4 سال کے تھے کہ 1739 میں احمد شاہ ابدالی اور 1747 میں نادرشاہ نے دہلی پر حملہ کر دیا، چاروں طرف تباہی اور بربادی پھیل گئی اسی سبب وہاں کے باشندے دہلی چھوڑ کر دوسرے شہروں میں منتقل ہو رہے تھے۔ نظیر اکبرآبادی کو ان کی والدہ اور نانی دہلی سے لے کر اکبرآباد (آگرہ) آگئیں اور یہاں کے محلّہ تاج گنج میں نوری دروازے کے نزدیک ایک مکان لے کر رہنے لگیں۔ یہیں پر نظیر کی شادی محمد رحمان کی بیٹی ظہور النسا بیگم سے ہوگئی۔ ان کی دو اولادیں ایک لڑکا گلزار علی اور بیٹی امامی بیگم تھیں۔ نظیر اکبرآبادی کی شخصیت بہت ہی پروقار تھی، وہ ایک سیدھے سچے، خوش اخلاق اور ملنسار انسان تھے۔ انھوں نے اپنی نظم کے ذریعے اپنی شخصیت کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی ہے:

چند اشعار ملاحظہ ہو۔

کہتے ہیں جس کو نظیر تک اس کا بیاں
تھا وہ معلم غریب بزدل و ترسندہ جاں
پست روشن، پستہ قد، سانولہ، ہندی نژاد
تن بھی کچھ ایسا ہی تھا قد کے موافق درمیاں
ماتھے پہ ایک خال تھا چھوٹا سا مسّے کے طور
تھا وہ بڑا آنکھ اور ابروؤں کے درمیاں
جتنے غرض کام لیں اور پڑھانے کے سوا
چاہیے کچھ اس سے ہوں اتنی لیاقت کہاں
فضل سے اللہ نے دیا اس کو عمر بھر
عزت وحرمت کے ساتھ پارچہ وآب وناں

نظیر نے اپنی بیشتر نظموں میں اکبرآباد کا ذکر کیا ہے کیونکہ انھیں اپنے وطن سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ خودداری ان کی رگ رگ میں رچی بسی تھی اس لیے اپنے عہد کے مشہور روساء کی دعوت پر کبھی ان کے یہاں نہیں گئے۔ اپنی مرضی سے معلّمی کے لیے متھرا گئے لیکن جلد ہی وہاں سے لوٹ آئے، آگرہ میں چند روز بھاؤ قلعہ دار کو درس، بعد ازاں محمد علی خاں کے بچوں کو تعلیم دینے لگے لیکن یہاں بھی ان کی طبیعت نہیں لگی۔ راجا ولاس رائے کے بچوں کو 17 روپے ماہانہ تنخواہ پر اپنے گھر کے سامنے نیم اور بیری کے درخت کی چھاؤں میں بوری پر بیٹھا کر پڑھاتے تھے۔ اپنی بقیہ عمر انھیں درختوں کے سایہ میں گزار دی۔ بالآخر 1826 کو فالج کا دورہ پڑنے کے سبب 16 اگست 1830 کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

نظیر اردو کے پہلے شاعر ہیں جس نے صحیح معنوں میں اردو شاعری کو زندگی اور اس کے مسائل کا ترجمان بنایا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اردو شاعری میں زندگی اور خارجی دنیا کی صحیح نمائندگی کا آغاز نظیر اکبرآبادی کی شاعری سے ہوا۔ انھوں نے کسی خاص طبقے کو نہیں بلکہ ہر طبقے کے انسان اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی شاعری میں شامل کیا۔ نظیر نے اردو شاعری کے ذریعے عوام کو بہت کچھ عطا کیا اور عام انسان کی زندگی کو اپنے فن کی اساس بنایا۔

نظیر نے غزل کے زمانۂ عروج میں جب غزل کو ہر شاعر اپنے کلام کا حصہ بنائے ہوئے تھا، اُس وقت انھوں نے نظم کو اظہار خیال کا بھرپور وسیلہ بنایا، اس لیے ہم انھیں نظم گوئی کا مطلع اول قرار دے سکتے ہیں۔ وہ اپنے دور کے تنہا شاعر ہیں جنھوں نے روایت سے ہٹ کر شاعری کی اور غزل کے اس دور میں صنف نظم کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ:

"نظیر جیسا شاعر جو اپنے عام انداز میں روایت شکن ہے۔ غزل کے بجائے نظم اختیار کرتا ہے۔"

ولی کے شمالی ہند آنے کے بعد اردو شاعری میں غزل کی حکمرانی رہی ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے ولی سے لے کر غالب تک کے زمانے کو دیکھا، ان کے مقلدین میں آبرو، ناجی، یک رنگ، مضمون، شاکر اور احسن تھے۔ ان سبھی شعرا نے غزل سرائی کی اور ایہام گوئی سے کام لیا۔ اس کے بعد مظہر جانِ جاناں اور خان آرزو نے زبان میں ندرت اور سادگی پیدا کی۔ پھر حاتم اور ان کے بعد سودا و میر کا عہد آتا ہے۔ میر غزل کے بادشاہ تھے، قصیدہ گوئی کے میدان میں کوئی شاعر سودا کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میر حسن نے سحرالبیان لکھ کر حیات جاوید حاصل کی، لیکن ان سبھی شعرا نے عموماً روایتی اصناف شاعری پر ہی توجہ صرف کی۔ اس کے برعکس نظیر ہی ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے عام مروجہ روایت سے ہٹ کر شاعری کی۔ ان کے متعلق ابواللیث صدیقی تحریر فرماتے ہیں:

"اس دور میں نظیر کا وجود ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک پھیلے

ہوئے ریگستان میں ہرے بھرے نخلستان کا ہوتا ہے۔‘‘[2]

نظیر ایک فطری شاعر تھے انھوں نے جو کچھ بھی تحریر کیا اپنی فطری صلاحیتوں کے سبب کیا اس لیے وہ اپنے دور کے بے نظیر شاعر کہلائے۔ اپنی بیشتر شاعری عوام کے لیے لکھی جو کچھ ان کی نظروں کے سامنے موجود رہا یہی ان کے کلام کے موضوعات بنے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری فطری ہے۔ انھوں نے اپنے کلام کو یکجا یا جمع کرنے کی کبھی فکر نہیں کی۔ وہ راہ چلتے نظمیں کہہ دیا کرتے تھے۔ عوام ان سے طرح طرح کی فرمائش کرتی، بچے نے کہا تو نظم لکھ دی، فقیر آیا اس کے لیے صدا لکھ دی، کوئی شاعر آیا غزل لکھوا لے گیا اور جس شے پر مزاج بن گیا نظم کہہ دیتے۔ ہندوستان کے تمام مذہب انھیں پسند تھے اور ہر موسم ان کو اچھا لگتا تھا اس لیے انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے روز مرہ، عوامی زندگی، ہندوستانی موسموں اور تہواروں کی عکاسی بڑے اچھوتے انداز میں کی۔ ہندوستانی رسم و رواج، عادات و اطوار، میلوں، ٹھیلوں کا بیان جتنی خوش اسلوبی کے ساتھ نظیر کے یہاں نظر آتا ہے اس کی مثال شاید ہی کسی دوسرے شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہو۔ نظیر کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ ان کا رنگ منفرد تھا کیونکہ انھوں نے روایت سے ہٹ کر عوام کے لیے شاعری کی۔ گلشن بے خار میں شیفتہ ان کی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں:

’’اس کے بہت سے اشعار بازاری لوگوں کی زبانوں پر ہیں، لیکن ان اشعار کی وجہ سے ان کو شاعروں میں نہیں گنا جا سکتا۔‘‘[3]

نظیر اکبرآبادی کا انداز منفرد تھا۔ انھوں نے جس زمانے میں آنکھیں کھولی وہ بڑا پُر آشوب دور تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے ناگہانی حملوں نے دہلی کو بالکل تباہ و برباد کر دیا۔ ادھر جاٹوں نے بھی بغاوت کر دی، انھیں اسباب کی وجہ سے ملک میں ایسی تباہی پھیلی کہ اقتصادی اور سماجی نظام کا شیرازہ بکھر گیا۔ نظیر، اکبرآباد میں رہتے ہوئے بھی اس تباہی و بربادی کے المناک واقعے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے متعدد نظموں میں ان حالات کی عکاسی کی ہے۔ ان کی مشہور نظم ’شہر آشوب‘ میں سماجی شعور اور انسانی درد مندی کی بہترین مثال دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے زوالِ تہذیب پر افسوس ظاہر کیا ہے، عام انسانوں کے درد کو اپنا سمجھ کر حالات کی ستم ظریفی کا شکوہ کیا ہے۔ نظم کی بنیاد بے روزگاری پر ہے بند ملاحظہ ہو۔

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی
کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی
ہر گھر میں اس طرح سے پھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوئے ہے جو اک بار بند

نظیر نے دنیا کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا بھی۔ وہ عام لوگوں سے بہت قریب تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں عوامی زندگی کو موضوع کے طور پر پیش کیا۔ ان کی شاعری کا تعلق عوامی زندگی سے ہے، اسی لیے انھوں نے وہی زبان استعمال کی جو عوام میں رائج تھی۔ ان کی نظموں کے اہم موضوع جو عوامی زندگی کی دلچسپیاں، ہنگاموں، عادات و اطوار، رسم و رواج، خیالات و عقائد اور نفسیات کی مرقع کشی بھی ہیں۔ نظیر عام طبقے سے بخوبی واقف تھے۔ وہ ان کے ہر سیر تماشا، میلہ ٹھیلہ، جلوس و جلسہ میں شریک رہتے تھے۔ انھوں نے مختلف تہواروں مثلاً ہولی، دیوالی، راکھی، جنم کنھیا، درگا جی کے درشن، عید، شب رات وغیرہ پر نظمیں تحریر کیں۔ اس وجہ سے ان کی شاعری میں مقامی رنگ جا بجا نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں فرسودہ و عشقیہ داستان کی جگہ روزمرہ کے عام مسائل پائے جاتے ہیں۔ جو چیزیں آنکھوں کو نظر آ جاتی نظیر ان کی عکاسی اپنے الفاظ میں کر دیتے جس میں ان کا منفرد انداز پایا جاتا ہے۔ موت، خوشامد، تسلیم، رضا، دنیا، سواریاں، کی کڑی اور پنکھیا وغیرہ ان گنت نظمیں ہیں۔ جو اس کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے مساوات کا پیغام دیا ہے۔ مشہور و معروف نظم ’آدمی نامہ‘ کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظم ’آدمی نامہ‘ کے متعلق ڈاکٹر ابواللیث کا خیال ہے کہ:

’’آدمی نامہ انسان دوستی کا ایسا منشور ہے جس میں نظیر کی کہانی پہلی مرتبہ انسان محض انسان کا تصور ہمارے سامنے آتا ہے۔‘‘[4]

نظیر خالص ہندوستانی شاعر تھے۔ انھوں نے ہندی زبان میں بہت کچھ لکھا، وہ ہندوستانی زبان استعمال کرتے تھے۔ ’لنڈرے‘ جیسے لفظ کا استعمال ’بگلا بھگت‘ جیسے ہندی محاورے کی بھرمار و تشبیہ، استعارے اور تضاد کا برمحل استعمال شاید ہی دیگر شعرا کے کلام میں دیکھنے کو ملے۔ اس کی عمدہ مثال نظم ’دنیا بھی کیا تماشا ہے‘ جس کے اشعار پیشِ نظر ہیں۔

بطخوں کی لمبی گردنیں مورست لنڈورے ہیں
سفید کوئے ہیں چیلوں کے رنگ بھورے ہیں
جو سادھو سنت ہیں پورے سو وہ ادھورے ہیں
کپٹ کی ندی پہ بگلے بھگت کے پورے ہیں

نظیر نے اپنی شاعری میں ہندوستانی زبان استعمال کی ہے۔ ان کی شاعری میں تشبیہ و استعارے کا استعمال جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے ساتھ ہی انھوں نے مناظر فطرت کی عکاسی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ ان کے یہاں ایک قسم کا تضاد بھی نظر آتا ہے کیونکہ ایک طرف تو وہ لوگوں کو دنیا سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتے ہیں، زندگی کی عیش و عشرت اور رنگ رلیوں سے فیض اٹھانے کی ترغیب دیتے ہیں اور دوسری جانب دنیا کی بے ثباتی اور موت سے ڈرا کر دنیا والوں کی تمام خوشیاں چھین لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر احتشام حسین رقمطراز ہیں:

’’نظیر کے یہاں ایک قسم کا تخلیقی تضاد نظر آنے لگتا ہے......ایک طرف تو نظیر نے دنیا سے لطف اندوز ہونے پر زور دیا ہے عیش و مسرت کو اکسا کر اس دنیا کو رنگین بنانے کی دعوت دی ہے۔ زندگی کے لطف اور جوانی کی سیر، مستیوں کی طرف اشارہ کر کے رنگ رلیوں میں حصہ لینے کی جانب مائل کیا ہے اور دوسری طرف موت، خدا، نیکی اور بدی، فنا اور عقبیٰ سے ڈرا کر عیش و مسرت کی تخلیقی لذت بھی ہم سے چھین لیتے ہیں۔‘‘[5]

نظیر نے زندگی اور موت کا ایسا تصور پیش کیا ہے کہ چاہے جس حالت میں زندگی بسر کرو لیکن ایک روز موت ضرور آنی ہے۔ اپنی مشہور نظم ’موت‘ میں وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

پہنا کسی نے خوب لباس عطر کا بھرا
یا چیتھڑوں کی گدڑی کوئی اوڑھ کر پھرا
آخر کو جب اجل کی چلی آن کر ہوا
اولے کے جھونپڑے کو کوئی چھوڑ کر چلا

باغ و مکاں، محل کوئی بنوا کے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر ایک آ کے مرگیا

ہندوستان میں عوام کا بنیادی اور خاص مسئلہ مفلسی اور غریبی رہا ہے۔ اس مسئلے کو انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے متعدد جگہ بیان کر کے پورے ملک کا نقشہ کھینچا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں یہ مسئلہ عہد حاضر تک موجود ہے۔ یہی سبب ہے کہ ترقی پسند شعراء نے سب سے زیادہ فیض نظیر کے کلام سے اٹھایا تھا کیوں کہ ان تمام مسائل کو نظیر نے اپنی شاعری میں اجاگر کیا ہے۔ نظم 'در بیان مفلسی' کے بند سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے عام آدمی کی زندگی کو بہت نزدیک سے دیکھا تھا۔

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز، بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی

نظیر کی شاعری کا محور ہندوستانی دیہات رہا ہے۔ دیہاتیوں اور باورچی خانے میں استعمال ہونے والے مصالحے وغیرہ کے ایسے الفاظ جن کو اس عہد کے شعرا نے کم تر اور بازاری سمجھ کر چھوڑ دیا تھا انھیں الفاظ کو نظیر نے اپنی زیست بنایا۔ بدھیا، بیل، بھیسا، آگ، دھواں، گیہوں، مٹر، شکر، مصری، قندگری، سانبھر، سونٹھ، مرچ، کیسر، لونگ، سپاری جیسے الفاظ کا استعمال کوئی نہیں کرتا تھا۔ انھوں نے اپنی مشہور نظم 'بنجارہ نامہ' میں ایسے الفاظ کا بخوبی استعمال کیا ہے۔

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر کیا گوئیں، پلا سر بھارا
کیا گیہوں، چاول، موٹھ، مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اردو ادب کی ابتدا میں ادب اطفال پر لکھنے والوں میں امیر خسرو، میر، غالب، نظیر، حالی، محمد حسین آزاد اور اس کے بعد اقبال، پریم چند، اسماعیل میرٹھی، چکبست، حامد اللہ افسر کی تخلیقات بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان تمام ادیبوں میں صرف نظیر اکبرآبادی ہی واحد ایسا نام ہے جو معیاری ادب اطفال پر کھرا اترتا ہے۔ ان کی مشہور نظمیں ہرن کا بچہ، گلہری کا بچہ، ریچھ کا بچہ، پتنگ بازی، کبوتر بازی دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیمات کو عام کرتی ہیں۔ اس کے متعلق محمود الرحمٰن تحریر فرماتے ہیں:

''صحیح معنوں میں نظیر اکبرآبادی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بچوں کے ادب کو مذہب اور نعت کی سنجیدہ بزم سے نکال کر نونہالوں کی بزم میں پہنچایا ہے جہاں ان کے احساسات و جذبات نمایاں ہیں۔''[6]

نظیر نے معاشرے میں پھیلی ہوئے بخل و لالچ جیسی برائیوں کا احتجاج بھی اپنی نظموں کے ذریعے کیا ہے۔ اس بند کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ نظیر معاشرے میں رہ رہے ہر فرد کو نصیحت کر رہے ہیں کہ وہ بخل سے کنارہ کشی اختیار کرے، ملاحظہ ہو۔

دولت جو ترے پاس ہے رکھ یاد تو یہ بات
کھا تو بھی اور اللہ کی راہ میں کر خیرات
دینے سے رہے اس کے ترا اونچا سدا ہاتھ
اور یہاں بھی تری گزرے گی سو عیش سے اوقات
اور واں بھی تجھے سیر دکھلائے گی بابا

ہمارا ہندوستان ملی جلی تہذیب کا گہوارا ہے یہی وجہ ہے کہ نظیر کو ہندوستانی اقوام سے محبت تھی۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہر قوم کے تہواروں کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں کیا وہ اپنی شاعری میں ہندوستانی جھلک پیش کرنا چاہتے تھے۔ ہندی الفاظ پر انھیں کافی عبور حاصل تھا اس لیے انھوں نے ہندوستانی تہذیب کی عکاسی بڑے اچھے ڈھنگ سے کی ہے۔ کرشن کنہیا، راجا کنس، گرونانک اور حضرت شیخ سلیم چشتیؒ پر انھوں نے اچھی نظمیں لکھیں ہیں۔ جن کے ذیل میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

———

دوستوں کیا کیا دیوالی میں نشاط و عیش ہے
سب مہیا ہے جو اس ہنگام کے شایان ہے شے

———

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

———

ابر کرم سے تیرے دائم ہے سبز و خرم
عالم کا سب گلستاں حضرت سلیم چشتی

نظیر اکبرآبادی کو ملک کی ہر شے سے الفت تھی اس لیے اپنی نظموں کے ایسے عنوانات کا انتخاب کیا جس کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ مناظر قدرت کا نظارہ بڑے خوبصورت پیرائے میں کیا۔ بادل کی نوبتیں، جھینگر کی آوازیں، پپیہے کی پی پی، مینڈک کی ملار، برسات کے موسم میں کس طرح لطف دیتی ہیں جن سے ہم مزہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ تمام مناظر اور اشیا ہمیں کسی دیگر ملک میں دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ برسات کے موسم کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے گھومتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بند ملاحظہ ہو

بادل لگا ٹکوریں نوبت کی گت لگاویں
جھینگر جھگار اپنی سرنائیاں بجاویں
کہ شور مور، بگلے جھڑیوں کا مینا بلاویں
پی پی کریں پپیہے، میڈک ملارے گاویں
کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

نظیر کی شاعری میں ہندوستانی معاشرے کی ہر چھوٹی بڑی شے کے عناصر موجود ہیں۔ انھوں نے اپنی نظمیں صاف و سلیس زبان میں تحریر کیں تا کہ عام قاری کو بآسانی سمجھ میں آسکے۔ ان کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد انھیں خالص ہندوستانی شاعر کہا جاسکتا ہے۔ جب نظم جدید کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو انجمنِ پنجاب کے حوالے سے محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کی خدمات کو اس تحریک کے نقطۂ آغاز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن اس تحریک کے آغاز سے قبل نظیر اکبرآبادی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی شاعری کو ادبی معیار پر پرکھ کر دیکھیں تو نظیر اکبرآبادی کی قدر و قیمت اپنے آپ مسلم ہو جائے گی۔

**حواشی**

1. نظیر اکبرآبادی ان کا عہد اور شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، اردو اکادمی سندھ کراچی، ص 28
2. ایضاً، ص 28
3. گلشن بے خار، شیفتہ
4. نظیر اکبرآبادی ان کا عہد اور شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، اردو اکادمی سندھ کراچی، ص 101
5. تنقیدی جائزے، احتشام حسین، ص 186
6. آزادی کے بعد بچوں کا ادب، محمود الرحمٰن، مشمولہ ماہنامہ کتاب، لاہور جنوری 1976، ص 9

■

**Dr. Hina Kausar**
Kausar Villa, Gali No 2
New Abadi Brola Zafra Abad
Aligarh - 202201 (UP)
Cell.: 9319215561
hkhenakausar1@gmail,com

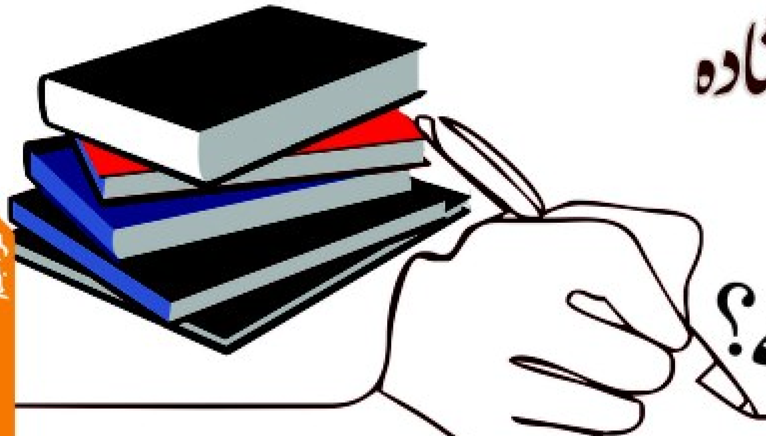

# کیا ناول نگار کشادہ ذہن ہوتا ہے؟

مصنف: ہاروکی موراکامی
ترجمہ: نایاب حسن

(ہاروکی موراکامی (پ:1949) عالمی شہرت و مقبولیت کے حامل جاپانی ادیب اور فکشن نگار ہیں،اب تک ان کے تقریباً دو درجن ناول اور افسانوی مجموعے، جب کہ غیر افسانوی تحریروں کے بھی متعدد مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔وہ کم و بیش درجن بھر قومی و بین الاقوامی اعزازات سے نوازے جاچکے ہیں۔ ان کی کتابوں کا دنیا کی پچاس سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے، جن کے کئی ملین نسخے فروخت ہوئے ہیں۔ ان کی چند کتابوں کا اردو میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے، جن میں South of the Border, West of the Sun (سرحد کے پار، سورج سے پرے، مترجم: ریحان اسلام)،Kafka on the Shore (کافکا برلبِ ساحل، مترجم: نجم الدین احمد)، Norwegian Wood (نغمۂ مرگ، مترجم:ڈاکٹر عبدالقیوم) اور ان کی منتخب کہانیوں کا ترجمہ'یک سنگھے'(مترجم:قیصرنذیر خاور) قابل ذکر ہیں۔ زیر نظر تحریرموراکامی کے مجموعۂ مضامین کے انگریزی ایڈیشن Novelist as a Vocation (ط:پینگوئن رینڈم ہاؤس 2022) سے ماخوذ و مترجَم ہے)

مجھے لگتا ہے کہ ناولوں پر گفتگو ایک نہایت وسیع اور گنجلک موضوع ہے، جس سے نمٹنا آسان نہیں ؛ اس لیے میں نسبتاً زیادہ خاص پہلو یعنی ناول نگاروں پر بات کروں گا، کہ وہ نمایاں نظر آتے ہیں اور روزمرہ زندگی میں ہمارا ان سے واسطہ پڑتا ہے؛ چنانچہ ان سے تعامل آسان ہے۔

کچھ مستثنیات سے انکار نہیں، مگر جہاں تک میں نے مشاہدہ کیا ہے، زیادہ تر ناول نگار مجبتی اور منصف مزاج نہیں ہوتے، ان کے اندر ایسی خصوصیات بھی نہیں پائی جاتیں کہ انھیں اچھا رول ماڈل سمجھا جائے، وہ خود پسندانہ اطوار کے حامل ہوتے ہیں اور ان کا طرزِ زندگی عجیب وغریب ہوتا ہے۔ تقریباً سبھی ناول نگار (میرے خیال میں 92 فیصد، جن میں خود میں بھی شامل ہوں) اس خوش فہمی میں جیتے ہیں کہ صرف ان کا اسلوبِ حیات وتخلیق درست ہے، باقی سارے غلط راہ پر ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کم ہی لوگ ہوں گے، جو ان کے دوست یا پڑوسی بننا چاہیں گے۔

جب بھی میں سنتا ہوں کہ دو ادیب اچھے دوست ہیں، تو میرے کان کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مجھے ایسا ہونے سے انکار نہیں ہے، مگر ایسے لوگوں کے درمیان حقیقی قلبی دوستی زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتی؛ کیونکہ ادیب اور تخلیق کار بنیادی طور پر انانیت پسند، مفتخر اور انتہائی حد تک متنافسانہ جذبات رکھنے والی مخلوق ہوتے ہیں۔ اگر آپ دو بڑے ادیبوں کو کچھ دیر کے لیے ایک کمرے میں بند کردیں، تو اغلب ہے کہ نتیجہ توقع کے برخلاف ہی نکلے گا، آپ میری بات مانیں، میں کئی بار اس قسم کی صورت حال سے گزر چکا ہوں۔

اس کی مشہور مثال 1922 کی وہ ڈنر پارٹی تھی، جس میں مارسل پروسٹ (1871-1922) اور جیمس جوائس (1882-1941) بھی مدعو تھے، دونوں ایک دوسرے کے پاس ہی بیٹھے تھے، حاضرین بیسویں صدی کے ان دونوں عظیم ادیبوں کے فرمودات عالیہ سننے کے لیے اپنی سانسیں روکے کھڑے رہے، مگر انھوں نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا؛ کیوں کہ ان کے درمیان کوئی گفتگو ہوئی ہی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ دونوں کا جذبہ خود پسندی ایک دوسرے پر کھلنے کی راہ میں پہاڑ بن کر حائل ہوگیا۔

اس کے باوجود اگر بات استثنائی حالات کی ہو یا کسی خاص پیشے سے منسلک جماعتوں کی مجموعی جبلت کی ہو، تو مجھے لگتا ہے کہ ناول نگاروں سے زیادہ فیاض اور نوواردوں کو خوش آمدید کہنے کا والا کوئی اور قبیلہ نہیں ہے، ناول نگاروں میں بہت کم خوبیاں پائی جاتی ہیں اور یہ ان میں سے ایک ہے۔

میں اپنی گفتگو کا دائرہ مزید محدود کرتا ہوں۔

فرض کریں کہ ایک ناول نگار، جسے قدرت نے خوش گلوئی سے بھی نوازا ہے، وہ گلوکاری کے شعبے میں داخل ہوتا ہے یا ایک اچھا ناول نویس، جو ایک بہترین آرٹسٹ بھی ہے، وہ اپنی نقاشی کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا ہے، تو یقین جانیں کہ اسے سخت مزاحمت؛ بلکہ تمسخر کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ناقدین پورے شہر میں یہ کہتے پھریں گے کہ 'اسے اپنے فن میں طبع آزمائی کرنا چاہیے'، کچھ دوسرے لوگ کہیں گے کہ 'یہ ناقص پیش کش ہے، اس میں مہارت یا ہنرمندی کا فقدان ہے'، جبکہ پیشہ ور گلوکار اور آرٹسٹس کندھے اچکا کر آگے بڑھ جائیں گے اور ہوسکتا ہے کہ اس کے اس عمل پر منفی اور تہکمانہ تبصروں کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا جائے۔ بہرکیف، کسی بھی محاذ پر اسے اس قسم کا حوصلہ بخش جملہ سننے کو نہیں ملے گا کہ 'ہمارے کلب میں تمھارا استقبال ہے' اور اگر اس کا پرجوش استقبال کیا بھی جائے، تو وہ بہت محدود پیمانے پر اور محدود دائرے میں ہوگا۔

میں خود اپنی مثال بیان کرتا ہوں۔ میں فکشن لکھنے کے ساتھ گزشتہ تین دہائیوں سے امریکی ادب کے تراجم بھی کر رہا ہوں، مگر ابتدائی دنوں میں (بلکہ شاید

تاہنوز) پروفیشنل مترجمین کی جانب سے مجھ پر سخت تنقیدیں کی گئیں۔ کہا گیا کہ ’ادبی ترجمہ نگاری ہر کہہ ومہہ کے بس کی بات نہیں ہے‘۔ اور اس قسم کا شور برپا کیا گیا کہ ’جو تخلیق کار ترجمے میں اپنا ہاتھ آزماتے ہیں، وہ خود اپنے لیے بھی اور قارئین کے لیے بھی وبالِ جان بنتے ہیں‘۔

اسی طرح جب غیر افسانوی مضامین پر مشتمل میری کتاب Underground شائع ہوئی، تو غیر افسانوی ادیبوں نے مجھ پر شدید تنقیدیں کیں، کسی نے کہا کہ ’اس کتاب میں غیر افسانوی ادب لکھنے کے بنیادی اصولوں کی پاسداری نہیں کی گئی‘، کسی نے کہا کہ ’یہ اول درجے کی جذباتی کہانی معلوم ہوتی ہے‘ اور کسی نے کہا کہ ’نہایت بچکانہ تحریریں ہیں‘؛ حالانکہ میں نے روایتی معنوں میں غیر افسانوی ادب نہیں لکھا تھا؛ بلکہ ایسی تحریریں لکھنے کی کوشش کی تھی، جو کسی بھی غیر افسانوی ادبی صنف کے تحت نہیں آتیں، اس کے باوجود میں نے ان شیروں کی دُم پر پاؤں رکھ دیا تھا، جو غیر افسانوی ادب کی بارگاہ کے محافظ ہیں؛ چنانچہ وہ غضب ناک ہوگئے۔ مجھے ان کا یا اس بات کا علم نہیں تھا کہ غیر افسانوی ادب لکھنے کے کچھ طے شدہ اصول ہیں؛ اسی وجہ سے اول وہلہ میں تو مجھے سخت حیرانی ہوئی۔

میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ کسی بھی شعبے کے متخصصین ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے، جو بھولے بھٹکے ان کے شعبے میں آجاتے ہیں۔ جس طرح خون کے سفید خلیے ہمارے جسموں کو بیرونی حملہ آوروں (مضرت رساں جراثیم) سے بچاتے ہیں، اسی طرح وہ لوگ اپنے شعبے کو نئے لوگوں سے بچانا چاہتے ہیں۔ اس کے باوصف جو لوگ مسلسل اور بلا خوف اپنے کام میں لگے رہتے ہیں، تو بالآخر مقتدرہ ان کے حال پر رحم کھاتی ہے اور ضمناً انھیں متعلقہ شعبے میں داخلہ مل جاتا ہے، گو کہ اول اول راہ خاصی مشکل ہوتی ہے۔ جو شعبہ جتنا زیادہ محدود اور متخصصانہ ہوتا ہے، اس کے اربابِ اقتدار اپنے تئیں اتنے ہی زیادہ مفتخر ہوتے ہیں اور نئے لوگوں کے حوالے سے ان میں جذبۂ تنافر اتنا ہی قوی ہوتا ہے۔

لیکن اگر معاملہ برعکس ہو، یعنی اگر گلوکار یا آرٹسٹ یا مترجمین ناول نگار بن جائیں، تو کیا ہوتا ہے؟ کیا پیشہ ور ناول نگار ان کے تئیں کراہیت کا اظہار کرتے ہیں؟ میرا تجربہ ہے کہ نہیں؛ بلکہ اس کے برعکس وہ ان کی تخلیقات کو مثبت نظروں سے دیکھتے ہیں؛ بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی مشہور ناول نگار نے کسی مبتدی تخلیق کار کو یہ کہہ کر پھٹکار لگائی ہو کہ ’تم نے کیا بکواس لکھا ہے؟‘، نہ میں نے کسی نئے ناول نگار کے بارے میں یہ سنا کہ اسے اپنے سے زیادہ تجربہ کار ناول نگاروں کی طرف سے کسی بدنیتی یا توہین و تمسخر کا شکار ہونا پڑا ہو؛ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بڑے ادیب نئے لکھنے والے کو بلاتے ہیں، اس کی تخلیق پر گفتگو کرتے ہیں اور ممکن ہو تو رہنمائی کرنے کے ساتھ اس کی تحسین و تشجیع بھی کرتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سینئر ناول نگار مبتدی تخلیق کاروں کے بارے میں نجی مجلسوں میں بھی کوئی منفی بات نہیں کرتے، وہ تو خود اپنے ہم رتبہ ناول نگاروں کے بارے میں بھی ایسی باتیں کرتے ہیں اور اس قسم کی تنقیدیں ہر شعبے میں چلتی رہتی ہیں، مگر اس کا تعلق نئے لوگوں کو اپنے شعبے میں داخلے سے روکنے سے نہیں ہے۔ ناول نگاروں میں بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں، مگر یہ خامی ان میں نہیں پائی جاتی، عموماً وہ اپنے شعبے کے نوواردوں کا فیاضانہ استقبال کرتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟

مجھے لگتا ہے کہ اس حوالے سے میری سوچ دلچسپ ہے۔ جو چیز ناول کو مختلف بناتی ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص محنت کرکے ناول لکھ سکتا ہے، جبکہ مثلاً پیانو بجانے یا رقص میں مہارت حاصل کرنے کے خواہش مند انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچپن سے ہی متعلقہ شعبے میں سخت ٹریننگ سے گزرے، تبھی وہ کما حقہ اپنے فن کا مظاہرہ کرسکتا ہے، اسی طرح ایک آرٹسٹ کے لیے ضروری ہے کہ وہ متعلقہ موضوع پر کم از کم ضروری معلومات اور مہارتوں سے لیس ہو، جو آلات اور وسائل چاہئیں وہ تو علیحدہ ہیں۔ اسی طرح کوہ پیمائی کے لیے بہت زیادہ جسمانی قوت، ٹریننگ اور شجاعت چاہیے ہوگی، مگر اس کے برخلاف اگر ایک شخص ناول نگار بننے کا خواہاں ہے، تو اس کے اندر بس لکھنے کی بالقوہ صلاحیت (جو اکثر انسانوں میں ہوتی ہے)، ایک قلم، کاپی اور کہانی کہنے کی ایسی استعداد کا ہونا کافی ہے، جو اس کہانی کو ناول میں بدل دے، بھلے اس نے اس کام کے لیے کوئی خاص تربیت لی ہو یا نہ لی ہو، کہ یہ اصل مقصد نہیں ہے۔ باضابطہ یونیورسٹی میں ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، اگر آپ نے تخلیقی ادب کو بہ طور نصابی موضوع پڑھا ہے، تو

میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی مشہور ناول نگار نے کسی مبتدی تخلیق کار کو یہ کہہ کر پھٹکار لگائی ہو کہ ’تم نے کیا بکواس لکھا ہے؟‘، نہ میں نے کسی نئے ناول نگار کے بارے میں یہ سنا کہ اسے اپنے سے زیادہ تجربہ کار ناول نگاروں کی طرف سے کسی بدنیتی یا توہین و تمسخر کا شکار ہونا پڑا ہو؛ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بڑے ادیب نئے لکھنے والے کو بلاتے ہیں، اس کی تخلیق پر گفتگو کرتے ہیں اور ممکن ہو تو رہنمائی کرنے کے ساتھ اس کی تحسین و تشجیع بھی کرتے ہیں۔

بھی اچھا ہے اور نہیں پڑھا، تو بھی کوئی مسئلہ نہیں۔

ایک مبتدی تخلیق کار بھی اگر باصلاحیت ہے، تو وہ اچھا ناول لکھ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر میں نے جب ناول نگاری شروع کی تھی، تو میرے پاس اس کی کوئی تربیت نہیں تھی۔ یہ صحیح تھا کہ میں یونیورسٹی میں ڈراما اور سنیما کا طالب علم رہا تھا، مگر ان دنوں (ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں) شاذ و نادر ہی میں نے کلاسز کی تھیں، اس کی بجائے میں لمبے بال، پراگندہ ڈاڑھی اور گندے کپڑوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ ادیب بننے کا میرا کوئی منصوبہ نہیں تھا اور میں نے مشق کے طور پر بھی ان دنوں کچھ نہیں لکھا تھا، حتی کہ ایک دن اچانک مجھے کسی کیڑے نے کاٹا (آپ چاہیں تو ایسا کہہ سکتے ہیں) اور میں نے اپنا پہلا ناول Hear the Wind Sing لکھا، جسے نئے تخلیق کاروں کے لیے مخصوص ایک ادبی میگزین کا ایوارڈ بھی ملا۔ پھر میں بطور پیشہ لکھنے کی تربیت حاصل کیے بغیر ہی مسلسل لکھنے لگا۔ شروع میں اپنے اس عمل پر حیرانی ہوئی، پھر معمول بن گیا۔

میری اس بات پر بعض لوگوں کو غصہ آسکتا ہے، میں ان کی تند و تیز آواز سن رہا ہوں کہ 'تمھیں ادب کے بارے میں کیا پتا ہے؟'، مگر میں بھی وہی بتا رہا ہوں کہ ادب کیا ہے؟ نظریات گڑھنا الگ چیز ہے؛ لیکن اگر آپ معاملے کی تہہ میں جائیں، تو معلوم ہوگا کہ ناول کا فارم نہایت وسیع ہے اور یہی وسعت ہے، جو اس کے اندر حیات پذیری کی حیرت ناک قوت پیدا کرتی ہے۔ میری نظر میں یہ بات کہ 'ہر شخص ناول لکھ سکتا ہے' کوئی افواہ یا مبالغہ آمیز بیان نہیں؛ بلکہ تعریفی جملہ ہے۔

مختصر یہ کہ ناول نگاری کی دنیا ریسلنگ کے رِنگ جیسی ہے، جو ہر اس شخص کا استقبال کرتا ہے، جو اس رِنگ میں آنا چاہتا ہے۔ بس آپ کو رسیوں کے درمیان کا خلا پار کرنا ہے، پھر آپ بہ آسانی اندر داخل ہوسکتے ہیں، رِنگ وسیع و عریض ہے، کوئی محافظ آپ کی راہ نہیں روکے گا، نہ آپ پر چلائے گا نہ باہر نکلنے کو کہے گا، جو پہلوان (سینئر فکشن نگار) رِنگ میں پہلے سے موجود ہیں، وہ بھی کم سے کم آپ کے وجود کو تسلیم کریں گے اور کہیں گے کہ 'گھبراؤ نہیں، آؤ اور اپنا دم خم دکھاؤ'۔ ان کا رویہ ایسا ہی ہوگا؛ پر لطف، ہلکا پھلکا، دلچسپ اور کلیتاً پر سکون۔ البتہ رِنگ میں داخل ہونا تو آسان ہے، مگر وہاں دیر تک ٹھہر پانا مشکل ہے، ہم ناول نگاروں کو اس کا اچھی طرح علم ہے؛ کیونکہ ایک یا دو ناول لکھنا مشکل نہیں ہے؛ لیکن مسلسل تخلیقی عمل میں مصروف رہنا اور تا حیات لکھتے رہنا ایک بالکل مختلف معاملہ ہے۔ یہ ایک مشقت آمیز مشغلہ ہے اور یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ایسا کرنے والے بہت کم لوگ ہوتے ہیں، مسلسل تخلیقی عمل میں مصروف رہنے کے لیے ایک تخلیق کار کو کچھ خاص چاہیے ہوتا ہے، صلاحیت تو اہم ہے ہی؛ بلکہ ریڑھ کی ہڈی کے مثل ہے، قسمت کا بھی بڑا رول ہوتا ہے، مگر ایک اور چیز بھی ضروری ہوتی ہے، وہ مخصوص قسم کی اہلیت ہوتی ہے، بعضوں کے پاس یہ اہلیت ہوتی ہے اور بعضوں کے پاس نہیں ہوتی، بعضوں کے پاس یہ اہلیت پیدائشی ہوتی ہے اور بعض لوگ اس کے حصول میں پوری زندگی کھپا دیتے ہیں۔ اس اہلیت کے بارے میں زیادہ لوگ نہیں جانتے، اس کا عوامی سطح پر کبھی ذکر بھی نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظوں کے ذریعے اسے بیان کرنا یا اس کی تصویر کشی بہت مشکل ہے۔ البتہ ناول نگار اس کی اہمیت کو خوب جانتے اور اپنے پیشے کی بقا کے لیے اس کی ضرورت کو بھی سمجھتے ہیں، وہ اپنے اندرون میں اسے محسوس کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اسی وجہ سے سینئر ناول نگار رِنگ میں آنے والے نئے ناول نگاروں کے تئیں غیر معمولی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں؛ چنانچہ ان میں سے کوئی نہ کوئی تو نئے آنے والے کا کھلے دل سے ضرور استقبال کرتا ہے، بھلے بقیہ لوگ اس نو وارد کے تئیں بیگانگی کا رویہ اختیار کریں اور اگر کسی نو وارد کو غیر رسمی طور پر باہر نکال دیا جاتا ہے یا وہ خود رضا کارانہ طور پر رِنگ سے باہر ہو جاتا ہے (اور اکثر نئے ناول نگار ایسا ہی کرتے ہیں) تو پرانے ناول نگار کہتے ہیں 'بیٹے! مجھے آپ کے باہر ہونے کا افسوس ہے' یا 'اپنا خیال رکھنا'، اس کے برعکس اگر کوئی دیر تک میدان میں جما رہتا ہے، تو وہ اپنے لیے عزت و احترام حاصل کر لیتا ہے۔

ایک دوسرا سبب بھی ہے، جس کی وجہ سے پرانے ناول نگار مبتدیوں کے تئیں فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ادبی اور تخلیقی سرگرمی ایسا کھیل نہیں ہے، جس کا نتیجہ کبھی صفر بھی ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں کہیں تو رِنگ میں نئے ادیب و تخلیق کار کی آمد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو ادیب پہلے سے رِنگ میں موجود ہے، اسے باہر نکلنا ہوگا۔ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادیبوں کی دنیا اور ایتھلیٹس کی دنیا کلیتاً مختلف ہے؛ کیونکہ پیشہ ورانہ کھیلوں میں جب ٹیم میں کوئی نیا کھلاڑی آتا ہے، تو پرانے کھلاڑی کو یا اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر پانے والے نئے کھلاڑی کو رخصتی کے کاغذات تھما دیے جاتے ہیں یا اسے بنچ کے بالکل کنارے جگہ ملتی ہے، جبکہ ادبی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی نئے ناول کے ایک لاکھ نسخے فروخت ہوتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرے ناولوں کی فروخت کی شرح اس کے حصے میں چلی گئی ہے؛ بلکہ اس کے برعکس اگر کسی نئے ادیب کی کتاب بہت زیادہ فروخت ہوتی ہے، تو اس سے نشر و اشاعت کے پورے شعبے میں اچھال آجاتا ہے۔ ساتھ ہی اگر ہم دور رس نقطۂ نظر سے دیکھیں، تو پائیں گے کہ اس میں قدرتی انتخاب کا عمل بھی کام کرتا ہے؛ کیوں کہ بعض دفعہ رِنگ تو وسیع ہوتی ہے، مگر وہاں اچھے اور مثالی ادیبوں کی بھی بڑی تعداد ہوتی ہے۔ کم سے کم میرا یہ ماننا ہے۔

میں گزشتہ 35 سے زائد برسوں سے کسی نہ کسی شکل میں ایک پروفیشنل ناول نگار کی زندگی گزار رہا ہوں، یہ سارا عرصہ میں نے رِنگ میں گزارا ہے، قدیم محاورہ استعمال کریں تو میری زندگی سراسر 'قلمی زندگی' ہے، اسے محدود معنوں میں ایک کارنامہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس طویل عرصے میں، میں نے بہت سے ادیبوں کو ابھرتے ہوئے دیکھا، ان میں سے بعضوں کی تخلیقات سراہی گئیں، انھیں ناقدین کی تحسین بھی حاصل ہوئی، مختلف ادبی اعزازات بھی انھیں ملے، عوامی سطح پر بھی وہ موضوعِ گفتگو بنے، ان کی کتابیں بھی خوب فروخت ہوئیں، لوگوں کو ان کا مستقبل روشن نظر آنے لگا، دوسرے لفظوں میں کہیں، تو وہ روشنی میں نہائے ہوئے، شور و نغمے کے جلو میں رِنگ میں داخل ہوئے؛ لیکن ذرا غور کیجیے کہ جو لوگ بیس یا تیس سال قبل میدانِ تخلیق میں دھوم دھام سے آئے تھے، کیا وہ اب بھی سرگرم ہیں؟ تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بہت کم لوگ اب بھی سرگرمِ تخلیق ہیں، باقی سارے رفتہ رفتہ میدان سے غائب ہوگئے، بیشتر تو ناول نگاری سے اوب گئے یا اسے بھاری پتھر جان کر چھوڑ دیا اور دوسرے شعبوں سے منسلک ہوگئے؛ لیکن ان کے شروعاتی ناولوں کو جو غیر معمولی پذیرائی ملی تھی، ان کا کیا بنا؟ وہ اب آپ کو شاید و باید ہی کسی مکتبے پر نظر آئیں، یہی وجہ ہے کہ ناول نگاروں اور تخلیق کاروں کی امکانی تعداد گرچہ بے شمار ہوسکتی ہے، مگر بک شیلف پر طویل زندگی کم ہی تخلیق کاروں کے حصے میں آتی ہے۔

**ناول نگاری کی دنیا ریسلنگ کے رِنگ جیسی ہے، جو ہر اس شخص کا استقبال کرتا ہے، جو اس رِنگ میں آنا چاہتا ہے. بس آپ کو رسیوں کے درمیان کا خلا پار کرنا ہے، پھر آپ بہ آسانی اندر داخل ہوسکتے ہیں، رِنگ وسیع و عریض ہے، کوئی محافظ آپ کی راہ نہیں روکے گا، نہ آپ پر چلائے گا نہ باہر نکلنے کو کہے گا ،جو پہلوان (سینئر فکشن نگار) رِنگ میں پہلے سے موجود ہیں، وہ بھی کم سے کم آپ کے وجود کو تسلیم کریں گے اور کہیں گے کہ 'گھبراؤ نہیں، آؤ اور اپنا دم خم دکھاؤ'.**

مجھے لگتا ہے کہ نہایت ذہین لوگ بہ طور خاص ناول نگاری کی اہلیت نہیں رکھتے، حالاں کہ اچھی تخلیق کے لیے ایک خاص مقدار میں ذہانت، تعلیم اور جانکاریوں سے لیس ہونا ضروری ہے، میں خود بھی ان تمام شعبوں میں بالکل کورا نہیں ہوں (کم ازکم میں تو ایسا ہی سوچتا ہوں)؛ لیکن نہایت تیز دماغ اور بے انتہا ذی علم انسان ناول نگار نہیں بن سکتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ناول نگاری یا قصہ گوئی ایک ایسا عمل ہے، جس میں رفتار آہستگی سے سرعت کی طرف بڑھتی ہے، یہ کہیے کہ یہ رفتار پیدل چلنے سے تیز اور سائیکل سوار کی رفتار سے کم ہوتی ہے۔ ایک انسان کے عقلی عمل کی بنیادی رفتار اس تناسب کے مطابق کارکردگی کو ممکن یا ناممکن بناتی ہے۔ اکثر و بیشتر ناول نگار اپنے شعور میں موجود کسی چیز کو قصے میں بدلنے کی کوشش کرتی ہیں، اس کے باوجود پہلے سے جو چیز موجود ہوتی ہے اس میں اور ناول نگار کے ذریعے تخلیق کردہ نئی چیز میں یقینی طور پر ایک خلا پایا جاتا ہے، یہی خلا ایسی حرکیات کو جنم دیتا ہے، جنھیں وہ اپنے بیانیے کی تشکیل کے وسیلے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ عمل ہے اور بہت وقت طلب بھی ہے۔

جس شخص کے پیغام کی ساخت شفاف ہے، اسے اس پیغام کو قصہ بنانے کے لیے ان مراحل سے گزرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے بس الفاظ کو افکار کے سانچے میں ڈھالنا ہے، یہ عمل تیزی سے پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اور قارئین تک اس کی ترسیل بھی بہ آسانی کی جاسکے گی۔ اس طرح جس پیغام یا خیال کو ناول کا روپ دینے میں چھ مہینے لگ سکتے تھے، وہ اگر ناول نگار کے پاس مائکروفون ہے اور ذہن میں وارد ہونے والے خیال کو وہ اسی شکل میں بول سکتا ہے، تو محض تین دنوں یا دس منٹ میں یہ عمل مکمل ہوجائے گا۔ تیزی سے سوچنے والے ادیب ایسا کرسکتے ہیں۔ عام انسان گھٹنے ٹیک دے گا اور یہ سوچ کر حیران ہوگا کہ مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟، الغرض کسی ادیب یا تخلیق کار کے اسمارٹ ہونے کا مطلب یہی ہے۔ اسی طرح جو شخص وسیع المعلومات ہے، اسے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ناول جیسے مبہم و مشتبہ ظرف کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے، نہ اسے خیالی زمان و مکان خلق کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے بس اپنی معلومات کو معقول طریقے سے منظم کرنا ہے، الفاظ کے سانچے میں ڈھالنا ہے اور قارئین و ناظرین کے سامنے پیش کردینا ہے۔

میرے خیال میں ناول نگاری بنیادی طور پر ایک مطلقاً خشک عمل ہے، مجھے اس میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔ ناول نگار اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوتا ہے، لفظوں کی ادھیڑ بن میں مصروف رہتا ہے، ایک کے بعد دوسرے لفظی و واقعاتی احتمالات و امکانات کی جستجو میں مغزماری کرتا ہے اور کبھی کبھی ایک اچھی سطر لکھنے میں پورے دن سر کھپاتا ہے۔ اتنا سب کرنے کے باوجود کوئی اس کی تحسین کرنے والا، پذیرائی کرنے والا اور پیٹھ تھپتھپانے والا نہیں ہوتا، وہ تنہا بیٹھ کر اپنے لکھے ہوئے کا بار بار جائزہ لیتا اور خود ہی سر ہلا کر خوش ہو لیتا ہے، بعد میں جب ناول شائع ہوتا ہے، تو کسی قاری کا ذہن اس اسلوب یا عبارت میں کی گئی اس اصلاح کی طرف نہیں جاتا، جو اس نے دن بھر کی دیدہ ریزی کے بعد کی تھی۔ یہی ناول نگاری کی حقیقت ہے، یہ حد درجہ تھکا دینے والا اور وقت طلب عمل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی دوسرے شعبے کا کوئی شخص ناول لکھتا ہے، اس کے ناول کو ناقدین اور قارئین پسند کرتے ہیں، حتی کہ وہ بیسٹ سیلر ہوجاتا ہے، تو بھی پروفیشنل ناول نگار اسے اپنے لیے خطرہ نہیں محسوس کرتا یا اس پر غصہ نہیں ہوتا؛ کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے تخلیق کار زیادہ دن نہیں ٹکتے۔ ذہین لوگ اپنی خاص سرعت کے مطابق کام کرتے ہیں، دانش وروں کی اپنی رفتار ہوتی ہے اور اسکالرز کی اپنی روش ہوتی ہے، مگر ان میں سے کوئی بھی طویل عرصے تک ناول نگاری کی روایتی رفتار سے ہم آہنگ نہیں رہ سکتا۔ بلاشبہ کہنہ مشق ادیبوں میں بھی اسمارٹ شخصیات پائی جاتی ہیں، ان میں سے بعض بلا کے ذہین بھی ہوتے ہیں، مگر یہ فطری ذہانت سے اوپر کی چیز ہوتی ہے اور یہ بھی ناولانہ ذہانت ہے۔ اس قسم کی صورت حال میں بھی میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اس کی ایک حد ہوتی ہے، آسان لفظوں میں کہیں تو ایک ناول نگار کی اعلیٰ ترین تخلیقی صلاحیت کی مدت دس سال ہوتی ہے۔ اس نقطے پر پہنچنے کے بعد وہ ذہانت ایک بڑی اور دائمی قابلیت میں بدل جاتی ہے، یہ الفاظ دگر استرے کی دھار ٹنگاری اور پھر کلہاڑی کی دھار میں بدل جاتی ہے۔ جو ناول نگار ان مراحل سے بخیر و خوبی گزر جاتا ہے وہ نہایت اعلی مقام پر پہنچ جاتا ہے اور اکثر تو ایسی شخصیت بن جاتا ہے کہ اس کی تخلیقات اس کے زمانے سے آگے بڑھ جاتی ہیں، مگر جوان مراحل سے کماحقہ نہیں گزرتا، جلد ہی اس کا چراغ بجھا جاتا اور اس کے ستارے غروب ہوجاتے ہیں یا اسے ایسی جگہ مل جاتی ہے، جہاں وہ زیادہ ٹک کر رہ سکتا ہے، جہاں اس کی زندگی پرسکون ہوتی ہے، ایسی جگہ جو اسمارٹ لوگوں کے لائق ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے میں ان تمام لوگوں کا احترام کرتا ہوں، جو سالہا سال بغیر تھکے لکھتے رہتے ہیں۔ یہ تو ہے کہ میں اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کی وجہ سے ان کی بعض تخلیقات کو پسند کرتا ہوں اور بعض کو نہیں؛ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے لوگ اس قابل ہوجاتے ہیں کہ وہ بطور پروفیشنل ناول نگار طویل عرصے تک ادبی دنیا میں موجود رہیں، اسی طرح وہ اس لمبے سفر میں اپنے خاص قارئین کا حلقہ بھی بنا لیتے ہیں، جس سے مجھے پتا چلتا ہے کہ وہ بہت مضبوط قوتِ ارادی اور ایسے داخلی جذبات کے حامل ہیں، جو انھیں تخلیق پر ابھارتے ہیں، ان کی لگن اور مستقل مزاجی انھیں اس لائق بناتی ہے کہ وہ گھنٹوں تن تنہا تخلیقی عمل میں مصروف رہیں، میرا خیال ہے کہ ایک پروفیشنل ناول نگار میں یہی اہلیتیں مطلوب ہیں۔ ایک ناول، حتی کہ بہت اچھا ناول لکھنا بھی کچھ مشکل نہیں ہے، مشکل یہ ہے کہ سال در سال انسان ناول لکھتا رہے، یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے اور اسی وجہ سے جیسا کہ میں نے بتایا، ناول نگاروں میں کچھ خاص اہلیتوں کا ہونا ضروری ہے، جو ناول لکھنے کی روایتی قابلیت سے قطعاً مختلف ہیں۔

تو آپ اپنے اندر موجود ناول نگاری کی اہلیت کا انکشاف کیسے کریں گے؟ اس کا صرف ایک جواب ہے: یہ کہ آپ پانی میں چھلانگ لگائیں اور دیکھیں کہ ڈوبتے ہیں یا تیرتے ہیں، مجھے پتا ہے کہ آپ کو میری یہ بات احمقانہ لگے گی؛ لیکن اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ زندگی اسی کا نام ہے۔ آج جو لوگ ناول نگار ہیں، انھوں نے حالتِ اضطرار میں ہی لکھنا شروع کیا تھا، اب وہ مسلسل لکھ رہے ہیں اور میں ان کا ہم پیشہ ہونے کی حیثیت سے کھلی بانہوں ان کا استقبال کرتا ہوں۔

■

**Md Nayab Hasan**
A/22, Seema Apartment, Gr.Floor, Gali No.7
Batla House, Jamia Nagar
New Delhi-110025
Mob.9560188574

محمد فیروز عالم

# فاصلاتی تعلیم آج کی ضرورت

**فاصلاتی** تعلیم، تعلیم کا ایک ایسا شعبہ ہے جو درس و تدریس، ٹکنالوجی، اور تدریسی نظام کی ساخت پر توجہ مرکوز کرتا ہے اور اس کا مقصد ایسے طلبا تک تعلیم کی رسائی کو ممکن بنانا ہے جو کسی وجہ سے جسمانی طور پر سیکھنے کی جگہ پر موجود نہیں ہوتے۔ یہ حصولِ تعلیم کی نسبتاً نئی شکل ہے جو 200 سال پہلے مراسلاتی تعلیم کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ مگر بہت سے بیرونی عوامل (مثلاً معاشرے میں اس کے تئیں غلط رویے اور تکنیکی امداد کی کمی) کی وجہ سے ایک عرصے تک بہت زیادہ مقبول نہیں رہی، البتہ پچھلے دس بارہ سالوں کے عرصے میں اس طرزِ تعلیم کو عالمی سطح پر غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ٹکنالوجی اور انٹرنیٹ کی تیز رفتار ترقی کی وجہ سے فاصلاتی تعلیم کے اس بنیادی تصور کو عملی جامہ پہنانا ممکن ہوگیا ہے کہ ایسے طلبا کو ان کے گھروں پر معیاری تعلیم فراہم کی جائے جو مالی، جغرافیائی یا دیگر وجوہات کی بنا پر ریگولر کلاسز میں شریک نہیں ہوسکتے۔

اگرچہ حالیہ برسوں میں فاصلاتی تعلیم کی مقبولیت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے، لیکن اس کے اصل معنی پچھلے چند سالوں میں بہت بدل بھی گئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو فاصلاتی تعلیم میں پچھلے دس سالوں کے دوران ایک بڑی تبدیلی آئی ہے، ایک تو آن لائن کورسز کی شکل میں اس کے نفاذ کی وجہ سے، دوسرے اس وجہ سے کہ اب اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ثانوی تعلیمی اداروں میں بھی اسے نافذ کیا جارہا ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی میں ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کی بڑھتی ہوئی اہمیت نے تعلیمی نظام پر بھی اپنا اثر مرتب کیا ہے۔ چنانچہ حالیہ برسوں میں تعلیمی اداروں کے سامنے دو آپشنز آگئے ہیں، ایک تو یہ کہ روایتی تعلیم کے ساتھ تکنیکی اختراعات کو مربوط کیا جائے اور ریموٹ لرننگ، یعنی کلاس روم سے باہر رہ کر سیکھنے سکھانے کا عمل اپنایا جائے یا روایتی انداز میں، یعنی رو بہ رو سیکھنے کے طریقے پر قائم رہا جائے، لیکن اگر ایسا کیا جائے گا تو مستقبل قریب میں اسکولوں یا کالجوں میں داخل ہونے والے طلبا میں بڑی کمی آسکتی ہے اور ٹکنالوجی کی مانگ جو ابھی ہے وہ اگر اسی طرح بڑھتی رہی اور اسی رفتار سے لوگ اسے اپناتے رہے تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بہت سے تعلیمی اداروں کو طلبا کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً بند کرنا پڑے۔

حالانکہ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فاصلاتی طرزِ تعلیم میں بہت سے چیلنجز بھی ہیں، جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ اس صورت میں اساتذہ اور طلبا کے درمیان رو بہ رو بات چیت نہیں ہو پاتی، اسی طرح تنہائی کی وجہ سے طالب علم کی ذہنی صحت متاثر ہوسکتی ہے اور علمی حصولیابی نیز نمبرات اور گریڈ کی کمی کا بھی مسئلہ پیش آسکتا ہے۔ مگر یہ تمام خدشات دراصل اچانک تبدیلیوں کا ایک فطری ردِعمل ہیں، جو کہ بالکل نارمل ہے۔ فاصلاتی طرزِ تعلیم کے نفاذ کے اب تک کے تجربے نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ طلبا اور اساتذہ سمیت تعلیمی اداروں کے لیے بھی بہت عملیت پسندانہ ہے۔ انٹرنیٹ اور لوگوں کے گھروں میں ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز کے آنے سے لوگوں کے درمیان باہمی رابطے کے لیے جسمانی حدود کی شرط ختم ہوگئی ہے۔ چونکہ ٹیکنالوجی نے اتنی بڑی چھلانگ لگائی ہے کہ لوگ حقیقی اور ورچوئل دنیا کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت تقریباً مکمل طور پر کھو چکے ہیں۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آج کی دنیا کتنی بدل چکی ہے اور مستقبل میں مزید کتنی تبدیلیاں آنے والی ہیں۔ اس طرح، فاصلاتی تعلیم بہت سے نوجوان اور معمر لوگوں کے لیے ایک عبوری دور کی نمائندگی کرتی ہے، بلکہ یہ انھیں مستقبل قریب میں کاروباری دنیا کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کے لیے بھی تیار کرتی ہے۔ اس لیے ایک متبادل طرزِ تعلیم کے طور پر ہمیں فاصلاتی نظامِ تعلیم کو اپنانا چاہیے اور اس کے جو فائدے ہیں انھیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔

(https://knowledge.net.in/blog/post/the-significance-of-distance-education-in-today-s-society)

ہندوستان جیسے ملک میں زیادہ تر نوجوان خواہش اور شوق کے باوجود اعلیٰ تعلیم اس لیے حاصل نہیں کرپاتے کہ ان کی مالی حالت کمزور ہوتی ہے۔ اگر حصولِ تعلیم کا دورانیہ طویل ہے تو ایسے میں اسٹوڈنٹ لون، گھر کا کرایہ اور دیگر متعلقہ اخراجات بہت سے متوسط طبقے کے افراد اور ان کے اہلِ خانہ کے لیے بھاری بوجھ بن جاتے ہیں۔ البتہ پچھلے کچھ سالوں میں، فاصلاتی تعلیم کے آپشن کے متعارف ہونے کی وجہ سے سیکنڈری اسکولوں اور کالجوں کی ٹیوشن فیسوں میں نمایاں کمی آئی ہے۔ نہ صرف ٹیوشن فیس میں کمی ہوئی،

بلکہ کھانے، رہائش اور دیگر تمام ضروریات سے متعلق طلبا کے روزمرہ اخراجات میں بھی کمی آئی ہے۔ لہٰذا اگر آپ کے پاس معیاری تعلیم حاصل کرنے کے لیے مالی استطاعت نہیں ہے، تو آپ فاصلاتی طرز تعلیم اپنا کر اپنا خواب شرمندہ تعبیر کر سکتے ہیں۔

ایک اور فائدہ یہ ہے کہ فاصلاتی تعلیم کئی اعتبار سے لچک دار ہے۔ مثلاً آپ دنیا میں کہیں سے بھی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ آن لائن لرننگ کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ دنیا بھر کے طلبا اپنی مرضی کی کوئی بھی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں، جو پہلے جغرافیائی حدبندیوں کی وجہ سے ناممکن تھا۔ ابھی چند سال پہلے تک بعض ممالک کے بچے مشکل کاغذی کارروائیوں اور سخت حکومتی قوانین کی وجہ سے کسی خاص ملک کے اپنی پسند کے تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کرنے نہیں جا سکتے تھے، مگر فاصلاتی تعلیم کے متعارف ہونے کے بعد وہ گھر بیٹھے دنیا کی کسی بھی بڑی یونیورسٹی اور کالج سے اپنی پسند کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ خود ہندوستان کے اندر ان لوگوں کے لیے فاصلاتی تعلیم ایک نعمت ثابت ہوئی ہے جو معمر ہیں اور حصول علم کا شوق ہے مگر اسکول کالج میں داخل نہیں ہو سکتے یا روزگار اور نوکری کر رہے ہیں جس کی وجہ سے کلاس روم میں نہیں آ سکتے، ایسے لوگ فاصلاتی تعلیم اور اوپن لرننگ کے ذریعے اپنی تعلیمی ترقی کا خواب بخوبی پورا کر رہے ہیں۔ انٹرنیٹ اور ٹیکنالوجیز کی بدولت حالات کافی بدل گئے ہیں، جن کی وجہ سے کسی بھی کالج یا یونیورسٹی میں داخلے کے لیے درخواست دینا اور داخلہ کروانا بہت آسان ہو گیا ہے، اب کسی طالب علم کو ریاستی انتظامی پروٹوکول کی تعمیل کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ اپنے گھر بیٹھے دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے متعلقہ تعلیمی ڈگریاں حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح ڈیجیٹل تعلیمی آپشن کے متعارف ہونے کے ساتھ تعلیمی پیراڈائم میں ایک بڑی تبدیلی آئی ہے۔

فاصلاتی تعلیم کا ایک اور اہم فائدہ یہ بھی ہے اس سے وقت کی بچت ہوتی ہے۔ 21ویں صدی میں بڑے شہروں میں آبادی کی کثرت کی وجہ سے فارغ وقت کا ملنا بھی اہم انسانی وسائل میں شامل ہو گیا ہے۔ ایسے میں بہت سے وہ طلبا جو اپنے اسکول سے کئی میل دور رہتے ہیں وہ صرف اسکول جانے کے لیے روزانہ ایک یا دو گھنٹے ضائع کرتے ہیں، جو یقیناً فکرمندی کی بات ہے۔ لیکن فاصلاتی تعلیم کو رسمی تعلیم کا ایک لازمی حصہ بنا لینے کی وجہ سے جو طلبا اسکول تک پہنچنے میں کئی گھنٹے ضائع کرتے تھے، وہ اب ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعے بروقت اسباق میں شرکت کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

ایک فائدہ فاصلاتی تعلیم کا یہ بھی ہے کہ طلبا اپنی فطری رفتار سے سیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ آن لائن

خود ہندوستان کے اندر ان لوگوں کے لیے فاصلاتی تعلیم ایک نعمت ثابت ہوئی ہے جو معمر ہیں اور حصول علم کا شوق ہے مگر اسکول کالج میں داخل نہیں ہوسکتے یا روزگار اور نوکری کر رہے ہیں جس کی وجہ سے کلاس روم میں نہیں آسکتے، ایسے لوگ فاصلاتی تعلیم اور اوپن لرننگ کے ذریعے اپنی تعلیمی ترقی کا خواب بخوبی پورا کر رہے ہیں۔

سیکھنے کے جو پلیٹ فارمز ہیں ان میں ایسے آپشن دیے گئے ہیں کہ طالب علم اپنی سوچنے سمجھنے کی رفتار کے مطابق سیکھنے کا ایک طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔ یعنی ایسے طلبا جو ایسے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جہاں سیکھنے سکھانے کا ایک طے شدہ طریقہ رائج ہے جس میں وہ فٹ نہیں بیٹھتے، تو آن لائن لرننگ میں اسے آزادی ہے کہ وہ اپنے حساب سے وقت کو مینیج کر سکیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو ایسے طلبا سیکھنے کے عمل کو اپنی سوچنے سمجھنے کی رفتار اور نظام الاوقات کے مطابق ایڈجسٹ کر سکتے ہیں، اور وہ لیکچرز کو ریوائنڈ کر سکتے ہیں، انھیں دوبارہ دیکھ سکتے ہیں، اس طرح وہ اپنے مضمون پر زیادہ توجہ دے سکتے ہیں اور آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔ سیکھنے کا یہ طریقہ ان طلبا کے لیے زیادہ اچھی طرح کام کرتا ہے جو وقت کے منظم استعمال میں مہارت رکھتے ہیں اور جو اسائنمنٹس، پریزینٹیشنز اور امتحانات کی تیاریاں بالکل وقت پر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

فاصلاتی طرز تعلیم سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم ملازمت کے ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں بے شمار طلبا کے لیے سب سے مشکل چیزوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی ملازمت اور تعلیمی سرگرمیوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہیں کر پاتے کیونکہ عموماً ملازمت اور تعلیم کے اوقات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور ایسے میں وہ یا تو ملازمت کر سکتے ہیں یا تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ بہت سے طلبا کی گھریلو معاشی حالت انھیں ملازمت پر مجبور کرتی ہے مگر وہ تعلیم بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں تا کہ آئندہ مزید ترقیاں حاصل کر سکیں، تو ایسے میں فاصلاتی طرز تعلیم ان کے لیے سب سے بڑے معاون کے طور پر سامنے آتا ہے، اس نظام میں امتحانات اور اسائنمنٹس جمع کرنے کا بھی کوئی حتمی وقت نہیں ہوتا، اگر وہ ملازمت یا دوسری قسم کی مجبوریوں کی وجہ سے متعینہ وقت پر امتحان نہ دے سکیں تو بعد میں دے سکتے ہیں، اسی طرح اگر ایک مقررہ تاریخ میں اسائنمنٹ جمع نہیں کر سکتے تو بعد میں بھی جمع کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس طرح وہ کام اور تعلیم دونوں میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں۔

فاصلاتی تعلیم حقیقی زندگی میں مؤثر اور حالات کے موافق بھی ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد نوجوانوں کو باعزت شہری بنانا اور کاروباری دنیا کے تقاضوں کے مطابق انھیں تیار کرنا تھا۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، بچے اپنے تعلیمی اداروں سے باہر کی دنیا کے لیے کم سے کم تیار ہونے لگے، جس کی وجہ سے تعلیم کے شعبے میں ایک بحران پیدا ہو گیا۔ ان اچانک رونما ہونے والی تبدیلیوں کا واحد مناسب حل فاصلاتی تعلیم کو متعارف کروانا تھا، جو بہت کم وقت میں بہت مؤثر ثابت بھی ہوئی ہے۔ اس طرز تعلیم نے طلبا کو گھر سے اور خود اپنی ذمے داریوں کو انجام دینے، انھیں سیکھنے کے مواد تک رسائی فراہم کرنے، اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز کے ذریعے اپنے اساتذہ اور ساتھیوں کے ساتھ بات چیت کرنے کی بہت سی نرم مہارتوں کو جنم دیا ہے جو رسمی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کافی عرصے تک مفید ثابت ہوں گی۔

فاصلاتی تعلیم نے بنیادی طور پر طالب علموں کو تکنیکی مہارتوں کو فروغ دینے، زیادہ عملیت پسندی کے ساتھ

مسئلے کو حل کرنے اور متعلقہ و غیر متعلقہ معلومات کے درمیان فرق کرنے کے قابل بنایا ہے۔ اگر عصری مطابقت کی بات کریں تو فاصلاتی تعلیم نے بعض معنوں میں روایتی تعلیمی ڈگریوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ آج دنیا بھر میں ہر روز تمام سائنسی شعبوں میں نئے نئے اعداد و شمار اور تحقیقی مقالات ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ایسے میں فاصلاتی تعلیم سے جڑے اساتذہ تازہ ترین تحقیق کی دستیابی کی بدولت اپنے طلبا کو نئی سائنسی دریافتوں کے بارے میں بصیرت فراہم کر سکتے ہیں، جوان کی تعلیم کو مزید جدید اور روح عصر سے ہم آہنگ بنائے گی۔ خود طلبا بھی ان دریافتوں تک رسائی حاصل کرکے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

فاصلاتی تعلیم کا ایک اہم فائدہ وسیع تر نیٹ ورکنگ کے مواقع کی فراہمی بھی ہے۔ فاصلاتی تعلیم کا یہ فائدہ کسی بھی روایتی کلاس روم کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سماجی روابط کسی بھی شخص کی کاروباری و اقتصادی کامیابی کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔ آن لائن کلاس رومز میں طلبا اپنے ملک کے دوسرے حصوں کے علاوہ پوری دنیا کے اپنے ساتھیوں سے مل سکتے ہیں۔ ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعے باہمی مواصلات انھیں ایک دوسرے سے مربوط رہنے، ممکنہ طور پر دوستی قائم کرنے، مختلف حوالوں سے اس دوستی کو مضبوط کرنے کے ساتھ اس قابل بھی بناتی ہے کہ وہ آئندہ کسی اہم کاروباری پروجیکٹ میں ایک دوسرے کے طویل مدتی شراکت دار بن سکتے ہیں۔

(https://www.allisonacademy.com)

الغرض فاصلاتی تعلیم، حصول تعلیم کی ایک ایسی شکل ہے جو طلبا کو لیبر مارکیٹ کے تقاضوں کے مطابق تیار کرتی ہے۔ اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ دنیا بھر میں تکنیکی ترقی آنے والے سالوں میں بھی جاری رہے گی، تو ہمیں یہ بھی ماننا چاہیے کہ وقت کے ساتھ ساتھ فاصلاتی تعلیم ڈگری حاصل کرنے کا ایک غالب طریقہ بن جائے گا۔ لہٰذا جو لوگ کم وقت میں زیادہ سیکھنا چاہتے ہیں، ملازمت اور نوکری کے ساتھ اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنا چاہتے ہیں، کم خرچ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے، اپنے وقت کو خود مینیج کرنا چاہتے ہیں اور اپنی قوت تفہیم کے مطابق پڑھنا اور سیکھنا چاہتے ہیں، جغرافیائی حد بندیوں سے ماورا ہو کر تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، سیکھنے کے

فاصلاتی تعلیم سے جڑے اساتذہ تازہ ترین تحقیق کی دستیابی کی بدولت اپنے طلبا کو نئی سائنسی دریافتوں کے بارے میں بصیرت فراہم کر سکتے ہیں، جوان کی تعلیم کو مزید جدید اور روح عصر سے ہم آہنگ بنائے گی۔ خود طلبا بھی ان دریافتوں تک رسائی حاصل کرکے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

جدید ترین مواد تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور خود مختار بننا چاہتے ہیں، تو ایسے لوگوں کے لیے فاصلاتی تعلیم ایک بہترین آپشن ہے اور انھی مذکورہ خوبیوں کی وجہ سے آج دنیا بھر میں اس طرز تعلیم کو مقبولیت بھی حاصل ہو رہی ہے۔

اس وقت دنیا کے بیشتر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی فاصلاتی تعلیم کا مضبوط نظام قائم ہے اور خاص طور پر کووڈ کے بعد اس کی طرف لوگوں کی توجہ بڑھی ہے۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی چار ملین انرولمنٹ رکھنے والی ہندوستان ہی نہیں، دنیا کی سب سے بڑی اوپن یونیورسٹی ہے، جس کے ساتھ سے زائد علاقائی مراکز ہیں۔ (بریڈی لونڈ، Creating Accessible Online Instruction Using Universal Design Principles، صفحہ 103، مطبوعہ رامین اینڈ لٹل فیلڈ پبلشرز لندن 2020) اس کے علاوہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی بھی فاصلاتی تعلیم فراہم کرنے والی ایک اہم مرکزی یونیورسٹی ہے جس کے مختلف صوبوں میں بہت سے ریجنل سینٹرز ہیں اور وہاں سے ہزاروں بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور سیکڑوں ریاستی یونیورسٹیاں فاصلاتی تعلیم مہیا کر رہی ہیں۔

ہندوستان میں فاصلاتی تعلیم کا آغاز 1962 میں مراسلاتی کورسز کے پائلٹ پروجیکٹ کے ساتھ ہوا، جس کی وجہ سے دہلی یونیورسٹی کے اسکول آف کرسپنڈنس کورسز اور کنٹینیونگ ایجوکیشن (اب Du-SOL) کی شروعات ہوئی۔ اس منصوبے کی کامیابی کے نتیجے میں مزید یونیورسٹیوں میں مراسلاتی کورسز کے شعبے شروع کیے گئے (بعد میں ان کو ڈائریکٹوریٹ یا مرکز برائے فاصلاتی تعلیم کا نام دیا گیا)۔ 1982 میں ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا، جو ہندوستان کی پہلی اوپن یونیورسٹی ہے، اس کے بعد 1985 میں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کا قومی سطح پر قیام عمل میں آیا۔ اگرچہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی نگرانی کا قانونی اختیار یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے پاس ہے، لیکن اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی ایکٹ (1985) کے تحت اوپن اور فاصلاتی تعلیم (ODL) کے فروغ اور تعاون کی ذمے داری شروع میں اگنو کو دی گئی۔ (امریک سنگھ، Fifty Years of Higher Education in India، ص 16 مطبوعہ سیج پبلی کیشنز دہلی 2004)

اگنو نے 1991 میں ڈسٹنس ایجوکیشن کونسل (DEC) قائم کی جو 1992 سے فعال ہو گئی۔ اگنو کے وائس چانسلر ہی اس کونسل کے چیئرپرسن کے طور پر کام کرتے تھے۔ (ارونا گوئل و ایس ایل گوئل، Encyclopaedia of Higher Education in the 21st Century، 161، مطبوعہ دیپ پبلی کیشنز دہلی 2005) اگست 2010 میں وزارت برائے فروغ انسانی وسائل نے ہندوستان میں فاصلاتی تعلیم کے معیارات کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ کمیٹی نے ایک نیا ریگولیٹری ادارہ، ڈسٹنس ایجوکیشن کونسل آف انڈیا (DECI) کے قیام کی سفارش کی۔ اس نے یہ بھی سفارش کی کہ جب تک ایسی باڈی قائم نہیں ہو جاتی ڈسٹنس ایجوکیشن کونسل کو یو جی سی منتقل کیا جا سکتا ہے، چنانچہ 29 دسمبر 2012 کو وزارت نے ایک حکم نامہ جاری کرکے فاصلاتی تعلیم کی ریگولیٹری اتھارٹی کو اگنو سے یو جی سی منتقل کر دیا گیا۔ مئی 2013 میں اگنو نے ڈی ای سی کو تحلیل کرکے اس کے تمام اثاثوں اور افرادی قوت کو اپنے دائرۂ اختیار میں لے لیا، اور اس کے بعد ڈسٹنس ایجوکیشن بیورو قائم کیا گیا۔ تب سے یہی ادارہ ہندوستان میں فاصلاتی تعلیم کی نگرانی اور دیکھ ریکھ کا ذمے دار ہے۔

■

**Dr. Md. Firoz Alam**
Assistant Professor, CTE
MANUU,
Darbhanga-846001 (Bihar)
firozmimt@rediffmail.com

شکیل احمد خان

# ودربھ کا لسانی، علمی، ادبی و تہذیبی منظرنامہ

## علاقہ

ودربھ، مہاراشٹر میں کئی ضلعوں پر مشتمل اردو زبان و ادب کا ایک زرخیز علاقہ ہے۔ اس کے ضلعوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے تو پہلا امراوتی، آکولہ، بلڈانہ، ایوت محل اور ضلع واشم (باسم) امراوتی ڈویژن اور دوسرا ناگپور، وردھا، بھنڈارا اور چندر پور ہے جو ناگپور ڈویژن کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

اوّل الذکر پانچ اضلاع آج بھی برار کہلاتے ہیں۔ سنسکرت کی کتابوں میں علاقہ برار کے متعدد نام مثلاً ودربھ، مہاراشٹر اور کرتھ کیشِک ملتے ہیں۔

برار ایک مدت تک فرماں روائے دکن کی عمل داری میں رہا ہے چنانچہ ودربھ میں اردو زبان کا آغاز بھی دکن میں اردو کی تخم ریزی اور نشو ونما کے ساتھ ہوا ہے۔

ودربھ کے اضلاع (برار) 1348 سے 1902 تک براہِ راست دکن سے منسلک رہے، لہٰذا دکنی زبان وتہذیب سے ان کا متاثر ہونا یقینی تھا۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد برار میں عماد شاہی سلطنت کی بنیاد پڑی، اور یہ حکومت تقریباً سو سال تک قائم رہی۔ عماد شاہی دورِ حکومت ودربھ میں اردو کے فروغ کا زمانہ ہے اس عہد کی زبان فارسی اثرات سے محفوظ نہیں تھی لیکن علاقائی رنگ بھی اس میں پوری شد و مد کے ساتھ موجود تھا۔ ودربھ کا اولین شاعر خواجہ محمد دہدار فانی (1541 تا 1607) خالص فارسی اثرات کا شاعر تھا۔ جب کہ ہندوی روایات کے نمائندے جانم اور جگت گرو تھے اور ہندوی روایات کے ساتھ فارسی اثرات کی نمائندگی عبدل اور شہباز حسین قادر نے کی۔

1543 میں دو سندھی عالموں (شیخ قاسم اور شیخ طاہر) کی ایلچپور ضلع امراوتی میں آمد اور سکونت سے بھی یہاں کی زبان اور ادب متاثر ہوئے۔ عہدِ قطب شاہی کے دوران اردو نے ایک مشترک زبان کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں علم و ادب کا خوب چرچا ہوا۔ محمد قطب شاہ نے بھی ان ہی روایات کی پاسداری کی۔ 1680 تک دکنی روایات کا خاتمہ ہو چلا تھا اور زبان نئی تشکیل کے دور سے گذرتی ہوئی ریختہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ولی دکنی نے شمال کی زبان کو دکنی روایات سے ملا دیا تھا۔ شعرا برار میں ان کے معاصرین آقا محمد امین وفا ایلچپوری، شیخ غلام مصطفٰے انسان ایلچپور، محمد شاہ معظم خاں محرم اور ابوالحسن رسا بالاپوری تھے۔

دکن میں مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد مراٹھے بھی نمایاں ہو چلے تھے، چنانچہ برار کی اردو پر مراٹھی کے اثرات مرتب ہونے لگے تھے۔ اس دور کے اہم شاعر شاہ غلام حسین ایلچپوری، ان کی زبان پر دکنی رنگ غالب تھا اس سلسلے میں ان کی مثنوی 'اودھو نامہ' کا موضوع اور زبان قابلِ غور ہے۔ شاہ غلام حسین ایلچپوری کے شعری سرمائے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی ہند کی زبان کے اثرات دکن کی بہ نسبت برار پر زیادہ مرتب ہوئے۔ ان کی بعض نظمیں ہندی افکار اور طریقہ اظہار کی آئینہ دار ہیں۔ اس طرح یہ سلسلہ برار کے دیگر نامور شعرا نواب نامدار خان جنگی جرنیل اور ان کے ہم عصر نیر ناقص، فیض اور نفیس سے ہوتا ہوا صوفی سید امجد حسین خطیب ایلچپوری تک پہنچتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جس وقت فورٹ ولیم کالج اور تحریکِ سر سید کے تہذیبی، علمی، ادبی اور لسانی اثرات نے پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ چنانچہ اس سے علاقہ برار اور ودربھ کے اضلاع بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

انیسوی صدی کے وسط و آخر میں ودربھ کے بعض دیدہ وروں نے اپنی زبان علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کی تاریخ تذکروں کی شکل میں مرتب کر دی ہے۔ ان تصانیف میں سب سے اہم تصانیف تاریخ امجدیہ تذکرہ شعرائے دکن، تذکرہ محبوب التواریخ، تذکرہ اولیائے دکن مراۃ ابرار اور بعض دیگر مصنفین کی کتب مثلاً 'دکن میں اردو' (نصیرالدین ہاشمی)، دکنی ادب کی مختصر تاریخ (محی الدین قادری زور)، تاریخِ ادب اردو (جمیل جالبی) کے مطالعے سے ودربھ میں اردو زبان وادب کے آغاز وارتقا کے احوال آشکار ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی 'تاریخ برار' کے عنوان سے کم از کم چھ قلمی نسخے محفوظ ہیں جن کی اشاعت سے برار کی ادبی تاریخ اردو دنیا کو متحیر کر سکتی ہے۔

'خیال' کامٹی کے مدیر فیض انصاری کی 'سی پی کے موتی' کے عنوان سے ایک گراں قدر تصنیف ہے۔ انھوں نے وسطِ ہند میں اردو کا اوّل تا حال تاریخی جائزہ لیتے ہوئے صوبہ متوسط و برار کے شعرا کا تذکرہ ترتیب دیا تھا۔ یہ تصنیف چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب 'جائزہ تاریخ زبانِ اردو' دوسرا سی پی کے قدیم شعرائے

اردو جوان قدیم شعرائے اردو کو قابلِ فخر امتیازی حیثیت سے پہلی بار اجتماعی طور پر متعارف کراتا ہے جو عہد فرنگ کے استبدادی دور میں گمنامی کی غار میں چھپے رہے تھے۔ اس کے بعد کا باب پچیس سالہ ارتقائی عہدِ زریں پیش کرتا ہے جس میں گونڈوانے کی سنگلاخ زمین نے سدا بہار پھولوں سے ادب کی سونی سیج کو گلستاں بنادیا۔ صد افسوس کہ برسوں کے مطالعے اور کاوشوں سے تیار کی گئی یہ تصنیف اشاعت سے محروم رہی ورنہ ودربھ کی ادبی تاریخ کے بہت سے پوشیدہ پہلو نمایاں ہو جاتے۔

ودربھ ہمیشہ سے پرنٹنگ پریسوں سے محروم رہا یہ اس کی بدنصیبی رہی۔ کتابت و طباعت کے مسائل کے سبب بھی یہاں کا بیشتر ادبی اثاثہ ضائع ہوا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ ناگپور اور آکولہ سے چند اچھی کتابیں شائع ہوگئیں۔ ان مطبوعات میں مختلف انجمنوں کے مجلوں اور شعری مجموعوں کی تعداد زیادہ رہی۔ اس وجہ سے کم از کم عصری تخلیقات کے تحفظ کا سامان ہوگیا۔ ودربھ میں کاتبوں کی کمی کی شکایت کو رفع کرنے کی غرض سے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے ناگپور جیسے شہروں میں مرکزِ کتابت قائم کروا دیے، لیکن ناگپور کے چند ہی پریس پورے علاقے کی طباعت کا بوجھ نہیں اٹھا سکے جبکہ امراوتی، بلڈانہ، ایوت محل، بھنڈارہ، چندرپور اور وردھا میں اردو طباعت کا کوئی معقول انتظام ہی نہیں تھا۔

ودربھ کے اضلاع میں آکولہ اور ناگپور اردو آبادی کے تناسب سے بڑے شہروں میں شمار ہوتے ہیں، اردو پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ درجات کی درس گاہوں کی تعداد بھی ان ہی شہروں میں زیادہ ہے۔ امراوتی جو عہدِ قدیم سے نازِ برار کی حیثیت رکھتا تھا، اب اپنی امتیازی شان کھو چلا ہے اگرچہ یہاں بھی اردو تعلیم و تدریس کا معقول انتظام ہے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ودربھ مہا ودیالیہ جیسا عظیم الشان گورنمنٹ کالج اور ٹیچرس ٹریننگ گورنمنٹ اسکول بھی یہاں موجود ہے۔ پھر بھی امراوتی اردو تخلیق، تحقیق، صحافت اور تعلیم کے میدان میں آکولہ اور ناگپور کی ہمسری نہیں کرپایا۔

ودربھ میں ناگپور کے اضلاع بھنڈارہ، چندرپور اور وردھا کی بہ نسبت امراوتی کے سبھی اضلاع میں اردو مدارس کا جال بچھا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں اردو پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم و تدریس کا انتظام موجود ہے۔

ناگپور ڈویژن کا بھنڈارہ ضلع اردو میں تعلیمی لحاظ سے بہت ہی مفلس ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس شہر کے غیر مسلم بھی اردو کے صاحبِ دیوان شاعر ہوا کرتے تھے۔ اور زمانہ حال کا عالم یہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی اپنی مادری زبان اور تہذیبی میراث کے تحفظ کا کوئی خیال نہیں ہے۔ اس کے باوجود بھنڈارہ میں ہندو اور مسلمانوں کا اشتراک اور باہمی میل جول بے مثل ہے۔

سادھوں سنتوں، درویشوں، فقیروں اور ولیوں سے سرزمین ودربھ ہمیشہ لسانی لحاظ سے کثرت میں وحدت کی جلوہ گاہ بنا رہا ہے۔ شاہ دولہا رحمٰن غازی کا

ودربھ کے اضلاع میں آکولہ اور ناگپور اردو آبادی کے تناسب سے بڑے شہروں میں شمار ہوتے ہیں، اردو پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ درجات کی درس گاہوں کی تعداد بھی ان ہی شہروں میں زیادہ ہے۔

عرس اور میلے، بہرم کی جاترا، رام ٹیک، پنڈھرپور، لونار، اور ریتھ پور کی جاترائیں، مہاہور کا نوراتری اُتسو، تاج باغ ناگپور، سیلانی اور مور پھاٹا وغیرہ مقامات، گاڑگے مہاراج، گجانن مہاراج، سائیں بابا اور دیگر سنتوں کے مراکز، قومی تقریبات، نیز دیوالی، عیدین، ہولی، گنیش اُتسو، محرم، دسہرا، پولا اور دیگر تہواروں کے میلوں ٹھیلوں میں ہر مذہب اور ذات کے لوگوں کے باہمی میل جول کا شاندار نمونہ علاقہ ودربھ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی اتحاد کے باعث ودربھ میں مراٹھی اور اردو زبانیں ایک دوسرے کی رفیق ہیں اور ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں۔ یہاں مراٹھی طبقے میں اردو غزلوں کی بے پناہ مقبولیت ہے۔ اسی کے مدِنظر ناگپور میں دونوں زبانوں کے جانکاروں نے مل جل کر ایک 'غزل ڈکشنری' تیار کی ہیں جس میں روایتی، ترقی پسند اور جدید اردو غزل کی مخصوص اصطلاحیں، علائم، استعارات، مذہبی اشارے اور تلمیحات کی تعبیر و توضیح مراٹھی اور انگریزی زبانوں میں کی ہیں۔

اسی طرح یہاں مراٹھی کے تخلیق کار، نقاد اور محققوں نے بھی اردو ادب کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا کام کیا ہے، ستیو مادھوراؤ پاگڑی، وڈیا دھر گوکھلے، شری پاد جوشی مراٹھی کے بلند پایہ صحافی اور ادیب ہیں جنھوں نے اردو کے کلاسیکی ادب کو مراٹھی زبان میں منتقل کرنے کا کام کیا ہے۔ نوجوان ادیبوں نے بھی اردو تخلیقات کا مراٹھی میں اور مراٹھی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اندومتی شیوڑے نامی اسکالر نے غالب کی زندگی پر कथा एक शायरी کے عنوان سے ایک شاندار ناول تحریر کیا ہے جس کی پذیرائی مہاراشٹر اردو اکادمی نے بھی کی۔ علاقہ ودربھ میں جس طرح مراٹھی میں اردو تخلیقات کے ترجمے ہوئے ہیں اسی طرح اردو داں طبقے نے بھی اپنا فرض ادا کیا ہے بدیع الزماں خاور نامی اردو کے شاعر و ادیب نے مراٹھی شاعری کی کلاسک کو اردو منظوم ترجمے کا خوبصورت جامہ پہنایا۔ نورپرکار نے مراٹھی افسانوں کے تراجم کی ابتدا کی اور یونس اگاسکر نے 'مراٹھی ادب کا مطالعہ' نیر صادق نے 'نئی مراٹھی شاعری' جیسی کتابیں پیش کیں۔

اردو اور مراٹھی زبانوں کا یہ میل جول آج کا نہیں زمانہ قدیم سے ہی اہلِ ودربھ (برار) کے خمیر میں شامل ہے۔ پیشواؤں کے زمانے میں مراٹھی زبان نے درباری زبان فارسی کے اثرات سے بہت سی اصطلاحات اپنے اندر سمو لیں اور روز مرّہ کی بول چال میں بے شمار فارسی الفاظ کا استعمال روا رکھا لیکن جیسے جیسے لسانی جانب داری بیدار ہوتی گئی اور لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی شناخت قائم ہونے لگی تو مراٹھی بھی ذرا سہم گئی، یعنی ہندی کی طرح مراٹھی میں بھی بدیسی یا غیر لفظیات سے پرہیز کیا جانے لگا۔ لیکن اہلِ زبان اس بات سے واقف ہیں اور یہ لسانیات کا اصول ہے کہ ہر زندہ زبان دوسری زبانوں سے متاثر ہوتی ہے اور اپنے ذخیرہ الفاظ میں برابر اضافہ کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح مراٹھی نے بھی ایک زندہ زبان ہونے کا ثبوت دیا۔ بعد کو مراٹھی میں اردو یا فارسی کی لفظیات کا دخل زیادہ نہیں رہا لیکن مراٹھی زبان ہمیشہ اردو ادب کی عظمتوں کا اعتراف کرتی رہی۔ مراٹھی نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ اردو

**آزادیِ ہند سے پہلے تک ودربھ کا پورا علاقہ روایتی ادب کا اسیر رہا اور روایتی اردو ادب کے طے شدہ خطوط پر سرگرمِ سفر رہا۔ غزلیہ شاعری اور مذہبی شاعری کے باب میں یہاں کے بزرگ شاعروں نے اپنی فکرِ سخن اور زورِ قلم کو پابند کر رکھا تھا۔ مضامین شعر میں وہی احتیاط اور وہی حصار دکھائی دیتا ہے جو کلاسیکی اردو شاعری کی بنیاد ہیں۔**

ادب کے بیشتر سرمائے کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ جن تحریکات و رجحانات سے اردو ادب متاثر ہوا، ان تحریکات و رجحانات کی گونج مراٹھی ادب میں بھی سنائی دیتی ہے۔ مراٹھی کا اردو غزل کو اس کے اپنے فارم میں قبول کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مراٹھی اور اردو ایک دوسرے کے مدِ مقابل نہیں بلکہ دوست ہیں۔

جس طرح مہاراشٹر کے دیگر علاقوں میں خصوصاً ممبئی اور مراٹھواڑہ کی آبادیوں میں اردو داں طبقے کی زبان پر مراٹھی کے اثرات نمایاں ہیں، یہی اثر امراؤتی اور ناگپور ڈویژن کی اردو آبادی کی عام بول چال پر بھی صاف نظر آتا ہے۔

ودربھ کی اردو پر دکنی رنگ غالب ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ شمالی ہند کے اثرات سے رچا ہوا ہے۔ ودربھ کی اردو زبان پر یہ دو طرفہ اثرات اس لیے مرتب ہوئے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، کہ عہدِ قدیم میں ودربھ کے اضلاع امراؤتی، آکولہ، بلڈانہ، ایوت محل اور واشم دکنی عمل داری سے منسلک رہے اور برار کا علاقہ دہلی اور دکن کے مابین گزرگاہ بنا رہا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد جنوب کے بہت سے مسلمانوں کی ہجرت نے بھی یہاں کی بول چال کو متاثر کیا۔ اسی طرح 1857 کی تباہی میں شمالی ہند کے خاندانوں کی آمد سے ناگپور ڈویژن کے شہروں کی بول چال متاثر ہوئی۔ ودربھ کے ہر شہر میں جنوبی اور شمالی ہند کی زبانوں کے اثرات سے ایک نئی بول چال کی زبان پیدا ہوئی جس کی جھلک آج بھی یہاں کے بعض شہروں کی عوامی بولی اور عام اردو زبان میں نمایاں ہے۔ اسے مہاتما گاندھی کی 'ہندوستانی زبان' کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

مطلب یہ کہ ودربھ مختلف انقلابات کے تحت اپنی اردو زبان کو عوامی رابطہ کے لیے آسان اور مؤثر بناتا چلا گیا اور یہی وجہ ہے کہ ریاستی زبان مراٹھی کے بعد مہاراشٹر میں رابطہ کی دوسری بڑی اہم زبان اردو ہی قرار پاتی ہے۔

ودربھ کے قلمی نسخے، مخطوطات اور مطبوعات کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس علاقے میں تاریخ نویسی، تذکرہ نگاری اور شعر و شاعری سب سے آگے رہی۔ اصنافِ نثر میں ناول نویسی اور افسانہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ اسی طرح ڈاکٹر سید صفدر کے علاوہ ودربھ کی سرزمین سے کوئی قابلِ ذکر نقاد بھی نہیں۔

ودربھ میں اردو زبان کی قدیم تخلیقات و تصنیفات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو قلم کار ہمیشہ قومی دھارے کے ساتھ رہے ہیں۔ اس مقصدی ادب کے باعث ودربھ کا اردو ادب، ادبی اقدار کے معیار و میزان کے تقاضوں کو پورا نہیں کر پایا لیکن چند ایسے فنکار بھی اس سرزمین میں موجود ہیں جن کی ادبی حیثیت سے انکار ناممکن ہے۔

ودربھ کے قدیم ادیبوں کا تذکرہ کیا جائے تو مولانا سید ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی کی اکیلی شخصیت ہی ودربھ کے وقار کی ضمانت کے لیے کافی ہوگی۔ ان کے کچھ ہم عصروں کے بھی ادبی کارنامے لائقِ ستائش ہیں۔ لیکن صد افسوس کہ نشر و اشاعت کی محرومی، نقادوں کی بے مہری اور کچھ کمتری کے احساس نے یہاں کے قلم کاروں کو گمنام رکھا۔ اس بات کا اندازہ یہاں سے پاکستان جانے والے قلمکاروں کی ادبی حیثیت کو دیکھ کر بھی کیا جاسکتا ہے۔

آزادیِ ہند سے پہلے تک ودربھ کا پورا علاقہ روایتی ادب کا اسیر رہا اور روایتی اردو ادب کے طے شدہ خطوط پر سرگرمِ سفر رہا۔ غزلیہ شاعری اور مذہبی شاعری کے باب میں یہاں کے بزرگ شاعروں نے اپنی فکرِ سخن اور زورِ قلم کو پابند کر رکھا تھا۔ مضامین شعر میں وہی احتیاط اور وہی حصار دکھائی دیتا ہے جو کلاسیکی اردو شاعری کی بنیاد ہیں۔

ودربھ کی شاعری اور اکثر نثری تحریریں بین المذاہب اتحاد و اتفاق جگاتی نظر آتی ہیں۔ انسانی قدروں، اخلاقی ضابطوں، بھائی چارہ، اخوت، مساوات، ہم آہنگی، خلوص، دوستی، رفاقت اور ایسے ہی دوسرے اوصافِ حمیدہ کی بازیافت کے لیے ودربھ کے شاعروں نے قلم اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ ودربھ کے شاعر اپنی ہندوستانیت اور حب الوطنی کا ثبوت پیش کرتے رہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کی تنقیدی بصیرت، منظور حسین شور، خورشید بیگم خورشید، اور نگار صہبائی کی شعری قدر و منزلت اور شائستہ اکرام کی افسانہ نویسی نے وہاں جو مقام و مرتبہ حاصل کیا وہ ودربھ میں رہ کر ممکن نہ ہوتا۔

زمانہ حال میں مدحت الاختر، شاہد کبیر، سید صفدر سید یونس اور دوسرے جدید شاعروں کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہوا جس کے وہ مستحق ہیں۔ افسانہ نگاری میں م۔ ناگ کے افسانے باقاعدہ شائع ہو کر ودربھ کی افسانہ نگاری کی خلا کو پر کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر زرینہ ثانی نے اپنی تنقیدی و تحقیقی تصانیف سے اپنی پہچان خود بنائی ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی صاحب کے علمی مضامین اور تصانیف نے انھیں علمی حلقوں میں ممتاز مقام دلایا ہے۔ ڈاکٹر دیسائی قدیم

کتبات و مخطوطات خوانی میں ملکہ رکھتے ہیں آثار قدیمہ سے متعلق ان کی کتب اور مضامین نے انھیں اپنے شعبہ علم میں لاثانی بنا دیا۔ ان کی حسبِ ذیل تصانیف ہیں:

1 Life and Works of Faidi 1961
2 Mosques of India, 1967 &71، ہندوستان کی مسجدیں (مترجم: مالک رام)
3 Indo-Islamic Architecture, 1971
4 Center of Islamic Learning in India, 1979
5 Published Muslim Inscriptions of Rajasthan, 1979
6 آثارِ قدیمہ ہند۔ وغیرہ

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خان منشا کئی شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے میر ممنون کا دیوان ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا۔ اس کے علاوہ وہ ایک بلند پایا شاعر بھی ہیں وہ جس نوع کی شاعری کرتے ہیں اس رنگ کے بہترین شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے اور ان کے اسی شاعرانہ مرتبے کے باعث انھیں حکومتِ دہلی کی جانب سے لال قلعے پر منعقد ہونے والے سالانہ مشاعرے کے لیے مدعو کیا جا چکا ہے۔

ودربھ کے بہت سے ادیب، شاعر و فنکار ایسے ہیں جنھوں نے ادبی دنیا سے اپنا لوہا منوالیا ہے۔ جب کہ بہت سے فنکار گمنامی کے اندھیرے میں گم ہوگئے۔ 1960 کے بعد نئی حسیت سے رچے ہوئے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں نے ادبی حلقوں کو کافی متاثر کیا۔ شاہد کبیر، مدحت الاختر اور عبدالرحیم نشتر کے اشتراک سے جدید اردو غزل کا انتخاب 1968 میں 'چاروں اُور' کے نام سے شائع ہوا۔ ہندو پاک میں یہ پہلا مجموعہ ٹھہرا جس نے نئی اردو غزل کے مزاج اور تخلیقی رچاؤ کی شناخت قائم کی۔ ودربھ سے ہندو پاک کی نئی غزل کا دوسرا انتخاب 'ارتکاز' کے نام سے عبدالرحیم نشتر نے شائع کیا۔ ودربھ کے جدید طرزِ فکر کے شاعروں میں سب سے پہلا مجموعۂ کلام 'اعراف' کے نام سے ماہنامہ تحریک دہلی کے اشاعتی ادارے کی طرف سے ستمبر 1972 میں شائع ہوا۔ ودربھ میں افسانوی رپورتاژ کی پہلی کتاب 'بھوپال ایک خواب' کے عنوان سے دسمبر 1977 میں شائع ہوئی۔ ودربھ کے اردو افسانے کی پچاس سالہ تاریخ کا جائزہ اور نوجوان افسانہ نگاروں کی منی کہانیوں کا اولین تنقیدی مطالعہ و انتخاب 'نورنژاد۔ ودربھ میں اردو افسانہ' کے عنوان سے دسمبر 1980 میں شائع ہوا۔ یہ تمام تصانیف عبدالرحیم نشتر کی تھیں۔

1970 سے 1981 کے دوران کچھ قابلِ ذکر کتب جیسے مٹی کا مکان، ثبات، منافقوں کے روز و شب، سیماب کی نظمیہ شاعری، دیوان ناطق، بیان میرٹھی (حیات و شاعری)، مطالعہ میر ممنون، نصف النہار، سوکھے پیڑ کا درد، انشا کا ترکی روز نامچہ، گوبھی کے پھول (ناگپور میں مزاحیہ شاعری کا پہلا مجموعہ کلام)، 'ایلچپور کے چند قدیم شعرا، بلا عنوان (ودربھ میں مزاحیہ مضامین اور افسانوں کا پہلا مجموعہ)، طلسمِ غزل، بوڑھا درخت، صفدر آہ۔ بحیثیت شاعر، نئی اردو شاعری، رہنمائے اردو تعلیم، طلسمِ الفاظ، کفِ افسوس، اوراقِ مصور جیسی اہم مطبوعات منظرِ عام پر آئیں۔ اس

ودربھ کے تقریباً تمام ہی اضلاع کا ماضی اردو زبان و ادب سے روشن رہا ہے اسے اردو زبان و ادب کے سنہرے دور سے تعبیر کرنا کوئی قباحت نہیں۔

دوران اردو صحافت میں ایجوکیشنل ٹائمز، رقیب، نقوش، دھوپ چھاؤں، زیروزبر وغیرہ اخبار و رسائل کا دور دورہ رہا مگر یہ اخبارات و رسائل کوئی کمال نہیں کر پائے۔

آزادیٔ ہند کے بعد علاقہ ودربھ (برار) سے کئی اعلیٰ کتابیں شائع ہوئیں لیکن اکثر کتابیں دیمک کی نذر ہوگئیں۔ اس بات کا عین ثبوت یہ ہے کہ مولانا ناطق کا دیوان ہو یا حضرت شاطر حکیمی کامٹوی کا اولین مجموعہ کلام 'موت و حیات' یا قادر نیازی کے افسانے 'باغی انسانی نگار'۔ یہ صورتِ حال روایتی شعر و ادب کے دلدادوں کی ہی نہیں بلکہ بعض نئے فنکار بھی اس مسئلے سے دوچار ہوئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مہاراشٹر اردو اکادمی کے مالی تعاون سے اچھی کتابیں منظرِ عام پر آگئیں۔

ودربھ میں اردو کی معیاری تصانیف کا سلسلہ زمانہ قدیم سے موجود ہے لیکن اس کی پذیرائی نہیں ہو سکی۔ یہ اب بھی ممکن ہوسکتا ہے گرچہ ودربھ کا اردو داں طبقہ اس طرف متوجہ ہو اور اپنے علاقائی ادب کی اشاعت و ترویج میں خود حصہ لے، ورنہ ودربھ میں اردو کی معیاری تصانیف۔ سوز و گداز، گلستانِ معرفت، موت و حیات، سمن زار، حرفِ خاموش، طور رخشاں، پہلی کرن، نصف النہار، اور دیوانِ ناطق کی طرح گرد و غبار میں دب کر رہ جائیں گی یا پھر تاریخ برار، سی پی کے موتی، دیوانِ عادل، دیوانِ ظفر، کلامِ پاگل، دیوانِ غازی اور اسی طرح برار کے قابل فنکاروں کے کارنامے قلمی نسخوں اور مخطوطوں میں قید رہ جائیں گے۔

ودربھ کے کچھ جدید کار شاعر و ادیب خوش بخت ہیں کہ ان کے انتخابِ کلام اور تنقیدی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض تصانیف نے اکیڈمیوں کے انعامات بھی حاصل کیے۔ ان میں ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشا، عبدالستار فاروقی، طرفہ قریشی بھنڈاروی، ڈاکٹر زرینہ ثانی، محمد عبدالحلیم، شاہد کبیر، محبوب راہی، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، مدحت الاختر اور ظفر کلیم وغیر شامل ہیں۔ ودربھ کے ان تمام شاعروں اور ادیبوں کی جولانی طبع، فنکارانہ چابکدستی، شاعرانہ کمال، حسنِ بیان اور ندرتِ فکر نے ودربھ کے اردو ادب میں مایہ ناز تصانیف کا اضافہ کیا اور سرکاری انعامات سے بھی سرفرازی حاصل کی۔ غرض یہ کہ ودربھ کے بیشتر شاعروں، مزاح نگاروں، افسانہ نویسوں کی تخلیقات اور تحقیقی تنقیدی تصانیف کے علاوہ بے شمار قلمی نسخے اور مخطوطات بھی محفوظ ہیں، جن کی اشاعت سے ودربھ (برار) کی لسانی، علمی و ادبی تاریخ روشن ہوسکتی ہے۔

ودربھ کے تقریباً تمام ہی اضلاع کا ماضی اردو زبان و ادب سے روشن رہا ہے اسے اردو زبان و ادب کے سنہرے دور سے تعبیر کرنا کوئی قباحت نہیں۔ آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ماضی کے گم شدہ ادبی خزانوں کی تلاش کی جائیں، اور اب تک جن قلمی نسخوں اور مخطوطوں کا علم ہو چکا ہے۔ ودربھ کے دانشوروں کو ان کی اشاعت کی صورت نکال کر انھیں شائع کرنا چاہیے۔ کیونکہ ودربھ کے آج بھی چند شہروں میں ایسے اساتذہ، ادیب و شاعر حضرات موجود ہیں جو قدیم و جدید ادب کا ذوق رکھتے ہیں اس کام سے یقیناً اردو زبان و ادب کی تاریخ کا تاریک پہلو روشن ہوسکتا ہے۔

■

**Dr. Shakeel Ahmad Khan**
Dept of Urdu
Government Vidarbha Institute of
Science & Humanities
Amravati-444604 (MS)

# بہتا ہوا پانی
## ارتقا میں ایک بڑا محرک

احسان اللہ خاں

**کروڑوں** زندگیوں سے بھرا ہوا بے کل سمندر ایک ایسا تھیٹر تھا جہاں 50 کروڑ سال یا اس سے بھی پہلے انسانی ارتقا کے عظیم ڈرامہ کے اولین منظر پر سے پردہ اٹھا۔ اگر چہ یہ حیرت انگیز معلوم ہوسکتا ہے لیکن یہ یقین کرنے کی ہر وجہ موجود ہے کہ ارتقا کے اہم سنگ میل یعنی لینسلیٹ جیسی شکلوں سے مچھلیوں کا پیدا ہونا اور مچھلیوں سے خشکی وتری دونوں پر رہنے والے (جل تھل) جانداروں کا ظہور سمندر کی گہرائیوں کے بجائے تیزی سے بہتے ہوئے تازہ پانی میں جدو جہد کا نتیجہ تھا اور یہ بھی اس حقیقت کے باوجود کہ ان گروہوں کے اول ترین باحیات ارکان (نرم ہڈی والے جانداروں میں مچھلی نما کیڑے اور بلا ہڈی کی مچھلیاں) بیشتر سمندری مخلوق ہیں۔ اس نظریے کے حامی یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ ایسے جانداروں کی نسل سے ہیں جو اصلاً تازہ پانی کے مکین تھے لیکن مقابلہ اور ماحول کے دوسرے عوامل کی وجہ سے سمندر میں واپس آگئے جن شواہد پر یہ نظریات مبنی ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ہم یہاں ان کی تفصیل میں نہیں پڑ سکتے۔ بہر حال یہ بات قابل توجہ ہے کہ اولین مچھلیاں آرڈوویشین تازہ پانی کی تلچھٹ میں پائی جاتی ہیں جبکہ جل تھلی سمندری شکلوں سے نہیں بلکہ غالباً ڈیوونیئن دور میں تازہ پانی والی مچھلیوں کی بعض شکلوں سے نکلی ہیں۔

”
یہ بات قابل توجہ ہے کہ اولین مچھلیاں آرڈوویشین تازہ پانی کی تلچھٹ میں پائی جاتی ہیں جبکہ جل تھلی سمندری شکلوں سے نہیں بلکہ غالباً ڈیوونیئن دور میں تازہ پانی والی مچھلیوں کی بعض شکلوں سے نکلی ہیں۔
“

### فضائی ہوا میں سانس لینے والے پہلے جاندار

جب کہ ریڑھ دار جانداروں نے آرڈوویشین دور میں اپنا لائحہ عمل بنانا شروع کیا۔ سلورین کے خاتمے پر پہلے پہل تقریباً 32 کروڑ سال قبل ہوا میں سانس لینے والے جانوروں کو عروج ہوا۔ درحقیقت جہاں تک ہماری موجودہ معلومات کا تعلق ہے آخری سلورین دور کے بچھو فضائی ہوا میں سانس لینے والے پہلے جاندار تھے اور آج تک برائے نام تبدیلی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں۔

بہر حال بچھوؤں کا تعلق ارتھروپوڈس (Arthropods) کے عظیم گروہ (غیر ریڑھ دار جانداروں کے قدیم ترین گروہوں میں سے ایک) ہے جو کہ اغلب طور سے کیچوے جیسے کیڑوں سے پیدا ہوئے، ارتھروپوڈس براعظموں کی بے پایاں سطحوں پر قبضہ کے لیے دوڑ میں ریڑھ دار جانداروں کو شکست دیتے ہیں۔ ریڑھ دار جانداروں کے پھیپھڑا پیدا ہونے سے کافی پہلے انھوں نے ہوا کی نالی کے ذریعے خشک ہوا میں سانس لینا سیکھا۔ بہر حال ہوا کی سانس لینے والے پہلے ریڑھ دار جانور یعنی پھیپھڑے والی مچھلیاں تقریباً 28 کروڑ سال قبل وسطی ڈیوونیئن میں ظاہر ہوئیں۔

کاربونیفرس دور کے آغاز میں اور اس سے بھی پہلے آخیر ڈیوونیئن زمانے میں تقریباً 26 کروڑ سال پہلے تازہ پانی میں رہنے والے ریڑھ دار جانداروں کی ارتقائی روش میں ایک زبردست تبدیلی ہوئی۔ کچھ مچھلیوں نے اپنے ابتدائی آبی گھر کو چھوڑ کر خود کو بتدریج خشکی پر رہنے کا عادی بنایا اور اس طرح نمایاں تبدیلیوں سے گزرے۔ فی الواقع انھوں نے فضائی ہوا میں سانس لینے کے لیے اصلی پھیپھڑے پیدا کیے اور ایسی اولاد کو جنم دیا جس کے بری نقل وحرکت کے لیے موزوں اعضا تھے۔ بلاشبہ ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ان کی جسمانی بناوٹ میں اتنی ہی انقلابی تبدیلیاں ہوئیں۔ اس طرح مچھلیوں سے وہ گروہ ابھرا جو جل تھلی کے نام سے معروف ہے اور جس کے کچھ ارکان اپنی زندگی کی تاریخ کا ایک حصہ پانی میں بسر کرتے ہیں۔ مثلاً مینڈک کے بچپن کا زمانہ نشو ونما پوری ہونے پر یہ جل وتھل دونوں میں رہنے کے لائق ہوتے ہیں۔ اس صفت کی وجہ سے ان کا نام جل تھلی (Amphibian) رکھا گیا۔ یونانی زبان میں اس سے مراد وہ جاندار ہیں جو دوہری زندگی بسر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ نمایاں تبدیلی کس طرح

ہوئی اس کی وضاحت ابھی کی جائے گی۔

## جل تھلی کی مورث ہونے کی دعویدار مچھلیاں

اسٹرے کوڈرم اور پلیکو ڈرم مچھلیاں(Ostracoderns and Placoderns)

اب یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ مچھلیوں کے کون سے مخصوص گروہ سے جل تھلی پیدا ہوئے۔ اس طرح کے سوالات کے اطمینان بخش جواب کے لیے کافی تکنیکی تفصیلات درکار ہوتی ہیں۔ بہر حال ہم اس نوعیت کے کام کی پیچیدہ تکنیکی باتوں میں الجھنے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا یہاں حقائق کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

مچھلیوں کا ایک گروہ اسٹریکوڈرمس کہا جاتا ہے۔ جس کے بارے میں یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ اعلیٰ ریڑھ دار جانداروں کے سیدھے شجرے سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اسٹریکوڈرمس سے مراد ہڈی دار کھال والی مچھلیاں ہیں (شکل 11) بعض باتوں میں یہ سطحی طور سے ارتھرو پوڈس سے مشابہ ہوتی ہیں اور دوسری باتوں میں زیادہ ترقی یافتہ مچھلیوں سے۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہوتا ہے اسٹریکوڈرمس کا بیرونی حصہ پلیٹوں سے بنے ہوئے ہڈی والے کیس پر مشتمل ہوتا ہے لیکن ان کا کوئی اندرونی ہڈی دار ڈھانچہ نہیں ہوتا۔ نہ ہی اسٹریکوڈرمس کے اچھی طرح نشو ونما پائے ہوئے دونوں تیرنے والے اعضا ہوتے ہیں اور بعض صورتوں میں یہ سرے سے ہی غائب تھے۔ یہ مچھلیاں اب بالکل معدوم ہوچکی ہیں لیکن بالائی آرڈوویشین زمانے سے لے کر بالائی ڈیونیئن زمانے تک ان کی بالادستی رہی۔ دس کروڑ سال سے زیادہ کے اس طویل وقفے میں یہی زمین پر اصلی ریڑھ دار جانور تھے۔

**تصویر (1)**

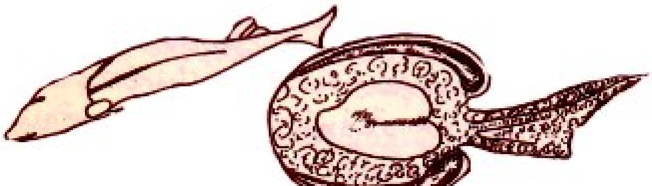

شکل 11: اسٹریکوڈرمس کے نام سے معروف ابتدائی مچھلیاں جن کے باہری حصے میں ہڈی دار ڈھانچے تھے اور جو آرڈوویشین زمانوں میں پیدا ہوئیں۔

a دبی ہوئی سلورین زمانے کی شکل۔

b زیریں ڈیونیئن دور کی ڈریپنیس پس (Drepanaspis) ساری اسٹریکوڈرمس بلا جبڑے والی ہیں۔ انھوں نے پلیکوڈرمس مچھلیوں کو جنم دیا۔ یقین کیا جاتا ہے کہ انھیں سے بعد میں جل تھلی پیدا ہوئے۔

کیا اسٹریکوڈرمس مچھلیوں میں سب سے ابتدائی تھیں؟ اس کے بارے میں شواہد آسانی سے سامنے نہیں آرہے ہیں۔ بہر حال یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ ایسا رہا ہو کیونکہ بجا طور سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ پہلی مچھلیاں مکمل طور سے سخت حصوں سے محروم تھیں جیسا کہ آج کل بلا جبڑے والی بام کی شکل کی قدیمی تنبو Lanpreys مچھلیاں ہیں۔ لیکن آرڈوویشئن سے قبل کے پانیوں میں رہنے والے ان بلا ہڈی کے جانداروں کے محفوظ رہ سکنے کا امکان زیادہ نہیں ہوسکتا۔ بلا ہڈی والے جموئیٹس کروڑی کے پائے جانے کی طرح ان کے اھوری حالت میں پائے جانے کا موقع شاذونادر ہی آسکتا ہے۔

صوریاتی شواہد بظاہر اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اسٹریکوڈرمس سے زیادہ ترقی یافتہ مچھلیاں مثلاً پلیکوڈرمس نکلیں جن سے مراد پلیٹوں والی کھال کی مچھلیاں ہیں۔ اگرچہ ابھی تک کوئی ایسی شکل منظر عام پر نہیں آسکی ہے جسے قطعی طور سے پلیکوڈرمس کا مورث سمجھا جاسکتا ہو۔ بہر حال ان گروہوں کے مفصل تقابلی مطالعے کے علاوہ یہ حقیقت کہ بحیثیت مجموعی اسٹریکوڈرمس ارضیاتی طور سے پہلے کی ہیں اس کی طرف اشارہ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ ان سے پلیکوڈرمس ابھریں۔ انھیں پلیکوڈرمس بالخصوص زیریں ڈیوونین میں پائی جانے والی ان کی ایک شاخ ارتھروڈائرز (Arthrodires) میں کبھی کبھی جل تھلی کا شجرہ تلاش کیا جاتا ہے۔

صوریاتی شواہد بظاہر اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اسٹریکوڈرمس سے زیادہ ترقی یافتہ مچھلیاں مثلاً پلیکوڈرمس نکلیں جن سے مراد پلیٹوں والی کھال کی مچھلیاں ہیں۔ اگرچہ ابھی تک کوئی ایسی شکل منظر عام پر نہیں آسکی ہے جسے قطعی طور سے پلیکوڈرمس کا مورث سمجھا جاسکتا ہو۔

ارتھروڈائرز تازہ پانی کی مچھلیاں تھیں جو کہ خاص طور سے زیریں ڈیوونمن میں تھیں اور ڈیوونمن کے ختم ہوتے ہوتے معدوم ہوگئیں۔ انھیں یہ نام ان کی جڑی ہوئی گردنوں کی وجہ سے دیا گیا۔ ان کے ایک اندرونی ہڈی دار ڈھانچہ اور جبڑے کے عناصر تھے جو کہ زیادہ تر کرکری ہڈے جیسے تھے۔ یعنی یہ کہ وہ ہڈی کے بجائے کان جیسی نرم ہڈی کے بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ مچھلیاں کافی بڑے سائز کی ہوئیں جیسے ڈن اتھیس (Dinichthys) جس کی لمبائی 30 فیٹ تھی۔ انھوں نے بحیثیت مجموعی تازہ پانی سے سمندری حالات اور چھوٹے کے بجائے بڑے سائز کو اختیار کرنے کا رجحان ظاہر کیا۔

**کراسوپٹری جنگس (Crossopterygians) اور ڈپنوئی (Dipnoi) یا دوہری سانس لینے والی مچھلیاں**

مچھلیوں کا ایک اور گروہ جن سے ریڑھ والے بڑے جانداروں کی شروعات کا امکان ہے۔ کراسوپٹری جنگس (Crosspterygians) یا تیرنے والے جھالردار اعضا کی مچھلیاں ہیں۔ ان کے پہلے سے سینے اور پیٹ کے پاس تیرنے والے اعضا کے ایک جوڑے تھے۔ یہی وہ اعضا ہیں جن سے خشکی پر رہنے والے جانداروں کے ہاتھ پیر کی نشوونما ہوئی۔ ان کے کچھ ابتدائی وارثوں میں تنفس کا ایک نیا ڈھانچہ بننے لگا تھا۔ ان میں ڈپنوئن مچھلیاں بھی شامل ہیں۔ جن کے خشکی پر رہنے والے جانداروں کی طرح پھیپھڑے ہوتے ہیں۔ جن گڑھوں میں یہ مچھلیاں رہتی تھیں ان کے سوکھ جانے پر یہ آزادی کے ساتھ فضائی ہوا میں سانس لے سکتی تھیں۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے

یہ جل تھلی کے ارتقا کی طرف ایک بڑا قدم ہے۔ علاوہ ازیں ان کے زیادہ ترقی یافتہ ریڑھ دار جانداروں کی طرح منھ میں کھلنے والے نتھنے تھے اور اس طرح وہ گلپھڑے اور پھیپھڑے دونوں سے بیک وقت سانس لے سکتی تھیں۔ اتفاقاً اسی وجہ سے انھیں ڈپنوئی نام ملا جس سے مراد دوہری سانس لینے والے جاندار ہیں۔

ان ڈپنوئن مچھلیوں کی زندہ نمائندہ افریقہ میں پائی جانے والی پروٹوپٹرس ہے (دیکھیے شکل 12)

یہ جن دلدلوں میں رہتی ہے ان کے سوکھ جانے پر یہ خود بخود نرم کیچڑ میں گڑ جاتی ہے اور اس طرح اس وقت تک کے لیے خشک موسم کو جھیل جاتی ہے جب تک کہ اس کا گھر بارش سے دوبارہ نہ بھر جائے اتنی ہی دلچسپی کا ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ اس کے لمبے پتلے اور بیچ میں مڑے ہوئے تیرنے والے

**تصویر (2)**

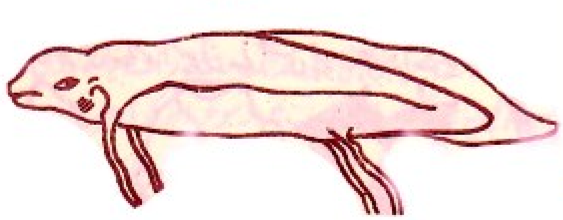

شکل 12: افریقہ میں پایا جانے والا موجودہ ڈپنوئن پروٹوپٹرس (Protopterous) یہ جن دلدلوں میں رہتا ہے ان کے خشک ہو جانے پر یہ خود نرم کیچڑ میں گڑ جاتا ہے۔ یہ خشکی پر کی زندگی اختیار کرنے کی سمت میں پہلا قدم ہے (خیال کے مطابق)

اعضا ہوتے ہیں جو اعلیٰ ریڑھ دار جانداروں کے اعضا کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ کبھی کبھی ا ن اعضا کے اوپر پانی میں چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایک اور دلچسپ ڈپنوئن لیپڈوسرین (Lepidosiren) ہے۔ یہ جنوبی امریکہ میں پائی جانے والی ایک ایسی پھیپھڑے دار مچھلی ہے جس کے قدرے لمبے و پتلے تیرنے والے اعضا ہوتے ہیں۔ (دیکھیے شکل 13) یہ تیرنے والے اعضا گڈھے کی تہہ میں مچھلی کو سہارا دینے کے لیے استعمال ہوتے ہیں جیسے

**تصویر (3)**

شکل 13: لیپڈوسرین ایک دوہری سانس لینے والی مچھلی جو جنوبی امریکہ میں پائی جاتی ہے۔ اس مچھلی کے پچھلے اعضا میں دوہرا اعصب (حصہ جسم کو جھکانے والا) اعلیٰ ریڑھ دار جانداروں کے ٹخنہ اور گھٹنوں کے جوڑ سے مطابقت رکھتا ہے اور ان کے اعصاب کے ارتقا میں ایک مرحلے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگلے اعضا زوال پذیر ہیں (گراہم کے مطابق)

کہ وہ پروٹوپٹرس کی طرح جس کا تذکرہ ابھی کیا جا چکا ہے پیروں کے ایک جوڑے پر کھڑی ہوں۔ بعض باتوں میں سب سے اہم شکل ڈپنوئن سراٹوڈس ہے (دیکھیے شکل 14) جو کہ اب استوائی اسٹریلیا کے علاقوں میں رہتی ہیں۔ یہ ٹرائسک دور سے باقی ہے جسے پندرہ

**تصویر (4)**

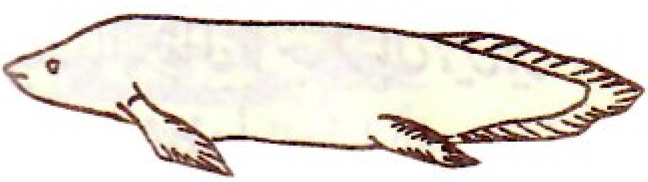

شکل 14: آسٹریلیا کا سراٹوڈس۔ یہ نوع ٹرائسک زمانہ سے یعنی 15 کروڑ سال سے زیادہ عرصہ سے موجود ہے۔ (گراہم کے مطابق)

کروڑ سال ہو چکے ہیں۔ اس طرح اسے بجا طور سے ایک 'زندہ احفوز' کہا جا سکتا ہے۔

یہ مشاہدہ کیا جائے گا کہ بعض مچھلیوں نے مختلف مرحلوں میں اعلیٰ ریڑھ دار جانداروں کے اعضا سے ملتے جلتے ڈھانچوں کی نشو ونما کا رجحان اختیار کر لیا۔ جن خطوط پر یہ حاصل کیا گیا ان کی نشاندہی شکل 15 میں کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے خشکی پر رہنے والے جانداروں کی طرح کھلی فضا میں سانس لینے کی صلاحیت

**تصویر (5)**

شکل 15: ریڑھ دار جانداروں کے اعضا کے ارتقا کے عمومی خطوط کو ظاہر کرتی ہے۔

a بالائی ڈیوونین مچھلی سورپٹرس کے تیرنے والے اعضا کی ہڈیاں (گریگوری سے ماخوذ)

b پرمین زمانے میں خشکی پر رہنے والے جل تھلی ایریاپس (Eryops) کے دائیں عضو کا استخوانی ڈھانچہ (گریگوری کے مطابق)

c وہیل کے بازو (تیرنے والے اعضا) کا ڈھانچہ اور % انسانی ہاتھ کا ڈھانچہ (بیڈل کے مطابق)

مچھلی: جل تھلی۔ آبی تھن دار جانوروں اور انسان کی ہڈیوں کے انداز میں عمومی یکسانیت پر دھیان دیجیے۔

H اوپری بازو کی ہڈی R کلائی ہار یا کلائی کی دو ہڈیوں میں سے اوپر کی ہڈی U زند اسفل (کلائی کی دو ہڈیوں میں سے نیچے کی ہڈی)

میں سانس لینے کی صلاحیت پیدا کی۔ یہ صفات مچھلیوں اور جل تھلیوں کے درمیانی قدموں یعنی مراحل کی طرف دھیان دلاتی ہیں۔ ایسی اقسام میں معدوم سورپٹرس (جن کی عضویاتی ہڈیاں کافی نمایاں یا ممیز ہو چکی تھیں) اور موجودہ ٹیلیوسٹین پیریوپتھامس جو پیڑوں پر چڑھتی ہے اس کی بہترین مثال ہیں۔

■

**ماخذ:** انسانی ارتقا، **مصنف:** ڈاکٹر ایم آر ساہنی، **مترجمہ:** ڈاکٹر احسان اللہ خاں، **دوسرا ایڈیشن:** 1998، **سنہ اشاعت:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

یادِ رفتگاں

شہپر شریف

# سادگی میں گہرائی
# فہمی بدایونی کی شاعری

فہمی بدایونی کی شاعری واقعی اپنی سادگی اور روانی کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔ انھوں نے معاشرتی مسائل کو نہایت مہارت سے اپنے اشعار میں پیش کیا، جس نے انھیں عوامی شاعر کا درجہ عطا کیا۔ ان کی عام فہم زبان اور منفرد اندازِ بیان نے نہ صرف ان کے کلام کو آسانی سے سمجھنے کی صلاحیت فراہم کی بلکہ ان کے اشعار میں گہرائی بھی پیدا کی جو قاری کو متاثر کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں معاشرتی حقیقتوں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور احساسات کی بھی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں سادگی، روانی اور معاشرتی مسائل کے گہرے شعور کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ ہر طبقۂ فکر کے لوگ ان کے کلام سے جڑ جاتے تھے۔ ان کا منفرد اندازِ بیان اور عام فہم زبان میں بڑے مسائل کی عکاسی کرنا ان کی شاعری کی پہچان بن گئی۔ وہ صرف ادب کے خواص میں نہیں، بلکہ عوامی حلقوں میں بھی مقبول تھے۔

> فہمی بدایونی نے اپنی غزلوں کے ذریعے محبت کی خاموشی اور دوری کی شدت کو بیان کیا ہے۔ محبت میں اکثر خاموشی اور عدم توجہی سے دلوں میں فاصلے بڑھ جاتے ہیں، حالانکہ بعض اوقات ایک چھوٹا سا سوال یا خیال اس فاصلے کو کم کرسکتا ہے۔

4 جنوری 1952 کو بدایوں کے بسولی قصبے میں پٹھان ٹولہ میں پیدا ہونے والے زماں شیر خان عرف پتن خان نے شاعری کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد 'فہمی بدایونی' کا تخلص اختیار کیا اور اسی نام سے ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کی۔ خاندانی ذمے داریوں کے سبب انھوں نے کم عمری میں لیکھ پال کی ملازمت اختیار کی، مگر دل کا لگاؤ ہمیشہ ادب اور علم سے رہا۔ بعد میں ملازمت چھوڑ کر ریاضی اور سائنس کی کوچنگ کو ذریعۂ معاش بنایا۔

ان کے تین شعری مجموعے، 'پانچویں سمت'، 'دستکیں نگاہوں کی' اور 'ہجر کی دوسری دوا' ان کی فنی مہارت اور تخلیقی قابلیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان مجموعوں میں موجود موضوعات زندگی کی تلخیوں، محبت، جدائی، اور انسانی احساسات کی گہرائی کو بڑی مہارت سے پیش کرتے ہیں۔

فہمی بدایونی نے اپنی غزلوں کے ذریعے محبت کی خاموشی اور دوری کی شدت کو بیان کیا ہے۔ محبت میں اکثر خاموشی اور عدم توجہی سے دلوں میں فاصلے بڑھ جاتے ہیں، حالانکہ بعض اوقات ایک چھوٹا سا سوال یا خیال اس فاصلے کو کم کرسکتا ہے۔ محبت میں اعتماد، خفگی اور توقعات کے جھگڑے کی گہرائی کو بیان کرتا ہے، محبت میں کچھ نہ کچھ خفگی بھی ضروری ہوتی ہے، تاکہ تعلقات میں گہرائی اور معنویت برقرار رہے اور اس میں ایک طرح کی چاہت بھی موجود ہو کہ ناراضگی کی کیفیت کم از کم برقرار رہے تاکہ محبت کی چنگاری جلی رہے۔ جیسا کہ فہمی بدایونی صاحب کے اِن اشعار سے بھی ظاہر ہے۔

مری وعدہ خلافی پر وہ چپ ہے — اسے ناراض ہونا چاہیے تھا
ہمارا حال تم بھی پوچھتے ہو — تمھیں معلوم ہونا چاہیے تھا

پوچھ لیتے وہ بس مزاج مرا — کتنا آسان تھا علاج مرا
تم نے ناراض ہونا چھوڑ دیا — اتنی ناراضگی بھی ٹھیک نہیں

محبت کے اندر موجود خواہش اور افسوس جہاں محبت کی شدت کے باوجود، ملاقات کا لمحہ بھی گزر جاتا ہے۔ محبت کی ادھوری خواہشات اور دل کی حالت کی عکاسی اور انسانی جذبات کی گہرائی اور محبت کے احساسات کو فہمی بدایونی کس طرح خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔

کاش وہ راستے میں مل جائے — مجھ کو منہ پھیر کر گزرنا ہے

محبت کی انفرادیت اور خاص تعلق جو محبت کی گہرائی اور اس کی انفرادیت کو اجاگر کرتا ہے۔ انسانی تعلقات کی نازکیوں اور محبت کی پیچیدگیوں کو فہمی بدایونی اس طرح بیان کرتے ہیں۔

تیرے جیسا کوئی ملا ہی نہیں
کیسے ملتا کہیں پہ تھا ہی نہیں

فہمی بدایونی کی شاعری میں محبوب کے دیدار کی شدت اور اس کی عدم موجودگی کے احساس کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ محبوب کا دیدار محض بصری احساس نہیں بلکہ اس کے لیے دل اور روح کی گہرائی میں اترنے کی ضرورت ہے۔ محبت میں ملاقاتیں صرف جسمانی نہیں ہوتیں بلکہ یہ ایک جذباتی اور روحانی تعلق بھی ہوتا ہے۔ جب کسی کی محبت کی شدت بڑھ جاتی ہے، تو اس کا ملنا ایک خواب سا لگتا ہے، محبت کی شدت میں فاصلوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اور ایک فون کال بھی محبوب کی قربت کا احساس دلا سکتی ہے۔ محبت کی شدت میں اکثر انسان اپنی زندگی کی دوسری چیزوں کو بھول جاتا ہے اور محبوب کی موجودگی میں خوش رہتا ہے۔ یہ احساس ایک طرح کی خود کو محدود کر لینے کی علامت ہے، جس کا اظہار فہمی بدایونی صاحب نے واضح طور پر اس طرح کیا ہے۔

ایسا لگتا ہے اب ترا دیدار
صرف آنکھوں کے بس کی بات نہیں

وہ جہاں تک دکھائی دیتا ہے
اس سے آگے میں دیکھتا ہی نہیں

رات بھی جب تمہارا فون آیا
تم ہمارے ہی پاس بیٹھے تھے

آپ تشریف لائے تھے اک روز
دوسرے روز اعتبار ہوا

فہمی بدایونی کے اشعار محبت کی کوششوں اور امیدوں کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ محبت کے راستے میں مشکلات آتی ہیں، لیکن پھر بھی ہم اپنی کوششیں جاری رکھتے ہیں۔ ان کے ایک شعر میں پتنگ کی پرواز کو محبت کی راہ میں کی جانے والی کوششوں کی علامت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

ڈور کم پڑ رہی ہے اور ہمیں
اس کے گھر تک پتنگ اڑانی ہے

فہمی بدایونی کے اشعار محبت اور تعلق کی گہرائی کو بیان کرتے ہیں۔ محبت کی شدت اور اس جگہ کی قدر و قیمت کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے جسے دل میں بسا رکھا ہے۔ اس کے ساتھ جڑی ہوئی تمام خوبیاں، یادیں، اور دنیا کی خوبصورتی بھی نظر آتی ہے۔ یہ ایک خوبصورت تصور ہے جس میں کسی کی محبت اور اس کا مکان اس کی ذات میں موجود ہے اور اس کے مقام کی مٹی زندگی میں کیسے گہرائی سے شامل ہو جاتی ہے، جیسا کہ فہمی بدایونی کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

نجانے کس طرح میری جبیں پر
ترے آنگن کی مٹی لگ گئی ہے

بس تمہارا مکاں دکھائی دیا
جس میں سارا جہاں دکھائی دی

وہ وہیں تھا جہاں دکھائی دیا
عشق میں یہ کہاں دکھائی دیا

محبت کی عجیب و غریب نوعیت کہ جہاں انسان اپنے محبوب کی رائے، خیالات اور احساسات کے بارے میں بے حد حساس ہوتا ہے۔ محبت کے درد، خواہش، دوسرے کی رائے اور احساسات کتنے اہم ہوتے ہیں، کس طرح ان کے خیالات زندگی کے ہر گوشے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ فہمی بدایونی محبت میں دوری، خواہش، اور احساس کی گہرائی اور اس کی شدت کی اس طرح عکاسی کرتے ہیں۔

کٹی ہے عمر بس یہ سوچنے میں
مرے بارے میں وہ کیا سوچتا ہے

جس کو ہر وقت دیکھتا ہوں میں
اس کو بس ایک بار دیکھا ہے

فہمی بدایونی کی شاعری اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ محبت میں خوشیوں کے ساتھ ساتھ ناکامیاں، افسوس اور ملال بھی ہوتے ہیں۔ محبت یا کسی خاص شخص کی یاد کے ساتھ خوشی کی شدت کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

فہمی بدایونی محبت کی لطافت اور چہرے کے تاثرات کی طاقت کو بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ چہرے کے تاثرات یا اس کی موجودگی اتنی اثر انگیز ہوتی ہے کہ وہ خود ایک زبان بن جاتی ہے۔ خاموشی میں کئی خیالات، احساسات، یا پیغامات موجود ہوتے ہیں جو کبھی کبھی الفاظ سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ خاموشی میں بھی بہت کچھ کہنے کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ یہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ کبھی اپنی باتوں کو کہے بغیر بھی اپنی موجودگی، جذبات، یا خیالات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

میں چپ رہتا ہوں اتنا بول کر بھی
تو چپ رہ کر بھی کتنا بولتا ہے

نگاہیں کرتی رہ جاتی ہیں ہجے
وہ جب چہرہ سے املا بولتا ہے

دھمک ہو رہی ہے خیالوں کی چھت پر
بہت زور سے خامشی چل رہی ہے

فہمی بدایونی کی شاعری انسانی تعلقات میں رابطے کی اہمیت، بات چیت کی ضرورت اور خاموشی کے ممکنہ منفی اثرات کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ اگر خاموشی اختیار کی جائے تو لوگ اپنی مرضی سے باتیں بنا سکتے ہیں یا پھر اس خاموشی کا مطلب نکال سکتے ہیں۔ یہ خاموشی اکثر غلط فہمیاں پیدا کر سکتی ہے، اس لیے محبوب یا دوست سے بات چیت ضروری ہے چاہے وہ باتیں معمولی ہی کیوں نہ ہوں۔ فہمی بدایونی نے محبت، خواہش اور تعلق کی مضبوطی کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے۔

کچھ نہ کچھ بولتے رہو ہم سے
چپ رہو گے تو لوگ سن لیں گے

فہمی بدایونی کی شاعری اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ محبت میں خوشیوں کے ساتھ ساتھ ناکامیاں، افسوس اور ملال بھی ہوتے ہیں۔ محبت یا کسی خاص شخص کی یاد کے ساتھ خوشی کی شدت کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جہاں خوشی کے لمحے میں ایک شخص کو کھو دینا یا اس کی یادوں کو محفوظ نہ کر پانا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک طرح کی محبت میں گزرے وقت کی قدر کو ظاہر کرتا ہے، جہاں ایک لمحے کی خوشی دوسری طرف غم کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس کا اظہار فہمی بدایونی صاحب نے کچھ اس طرح کیا ہے۔

خوشی سے کانپ رہی تھیں یہ انگلیاں اتنی
ڈلیٹ ہو گیا اک شخص سیو کرنے میں

فہمی بدایونی کی شاعری محبت کی قربانی اور زندگی کی حقیقتوں کو بھی بیان کرتی ہے۔ یہ محبت کے تقاضے اور ان کے ساتھ آنے والی مشکلات کی عکاسی بھی کرتی ہے، جہاں خوب صورتی حاصل کرنے کے لیے قربانی دینی پڑی ہے۔ وہ محبت کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ اس کی قیمت بھی بیان کر رہے ہیں۔ ہر خوب صورت چیز کے پیچھے کچھ کڑوی حقیقتیں چھپی ہوتی ہیں اور فہمی بدایونی صاحب کا یہ شعر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کبھی کبھار خوشیوں کے لیے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔

پھولوں کو سرخی دینے میں
پتے پیلے ہو جاتے ہیں

فہمی بدایونی کے اشعار محبت کی پختگی، وفاداری اور قربانی کو ظاہر کرتے ہیں کہ چاہے دنیا کیسی بھی ہو، وہ محبت میں ثابت قدم ہے۔ دنیا بھر کی رونقیں اور واقعات اس کے گرد گھومتے رہے، مگر وہ ہمیشہ اپنی محبت کی راہ پر قائم رہے۔ فہمی بدایونی کا یہ شعر محبت کے لیے ہمیشہ ثابت قدمی، وفاداری اور عشق کی قوت کو واضح کرتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

مجھ پہ ہو کر گزر گئی دنیا　　میں تری راہ سے ہٹا ہی نہیں

محبت کے احساسات اور یادوں کو سمیٹنا ایک خوب صورت احساس ہے کہ محبوب کی موجودگی اس کی زندگی میں ہمیشہ برقرار رہے، تاکہ وہ اپنے دل کے کونے میں اس کی یادوں کو جگہ دے سکے۔ محبت کے ان احساسات اور یادوں کو سمیٹنے کو فہمی بدایونی اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ابھی خالی نہ کر خود کو ٹھہر جا　　میں اپنی روح میں خانے بنا لوں

فہمی بدایونی محبت کی دردناک حقیقتوں اور احساسات کی شدت کو بھی بیان کرتے ہیں کہ کبھی کبھار ہم اپنی مشکلات اور دکھوں کا سامنا کرتے ہیں حالانکہ یہ عمل دردناک ہوتا ہے۔ ان کی یادہمیں مسلسل ستاتی رہتی ہے انسان اپنی محبت کے زخموں کو پالنے کی کوشش کرتا ہے، جیسا کہ فہمی بدایونی کے اس شعر سے بھی ظاہر ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

نمک کی روز مالش کر رہے ہیں　　ہمارے زخم ورزش کر رہے ہیں

فہمی بدایونی کے اشعار انسانی رشتوں کی حساسیت، محبت، اور سرپرستی کی اہمیت کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ وہ سرپرست والد، استاد یا کوئی ایسا بڑا ہو سکتا ہے جو زندگی میں رہنمائی کرتا تھا۔ اس شخص کی موجودگی میں جو شرارتیں وہ کیا کرتے تھے، اب ان میں کوئی مزہ نہیں رہا۔ یہ ایک طرح کا دکھ اور خالی پن ہے جہاں وہ احساس کراتے ہیں کہ کسی کی سرپرستی اور محبت کی غیر موجودگی میں زندگی کی مٹھاس ختم ہو جاتی ہے۔ بطور مثال پیشِ نظر ہے ان کا یہ شعر۔

مر گیا ہم کو ڈانٹنے والا　　اب شرارت میں جی نہیں لگتا

فہمی بدایونی کے اشعار علامتی انداز میں انسانی زندگی کے حالات کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ جہاں ایک چھوٹے سے نشان سے بڑی بڑی باتیں سمجھی جا سکتی ہیں۔ اس میں ایک نازک توازن ہے کہ کیسے زندگی کی سچائیاں چاہے وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہوں، ہمیں بڑی بڑی حقیقتوں کی خبر دیتی ہیں۔ فہمی بدایونی کا یہ شعر انسانی تجربات اور مشاہدات کی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے۔

چھت کا حال بتا دیتا ہے　　پرنالے سے گرتا پانی

جب شیشے ٹوٹتے ہیں تو ان کے نوکیلے کنارے بن جاتے ہیں جو خطرناک اور تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ جب محبت یا تعلقات میں درار آتی ہے تو وہ تکلیف دہ بن جاتے ہیں اور بکھر جانے کے بعد انسان کے جذبات بھی اسی طرح نوکیلے ہو جاتے ہیں جو دوسروں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ شیشے کی علامت اس کی نازکی، حساسیت، اور دل کے جذبات کو ظاہر کرتی ہے۔ جب کسی چیز کو توڑا جاتا ہے، تو اس کی حالت بدل جاتی ہے اور وہ ایک نئے روپ میں سامنے آتی ہے۔ جس کا اظہار فہمی بدایونی صاحب نے واضح طور پر اس طرح کیا ہے۔

توڑے جاتے ہیں جو شیشے　　وہ نوکیلے ہو جاتے ہیں

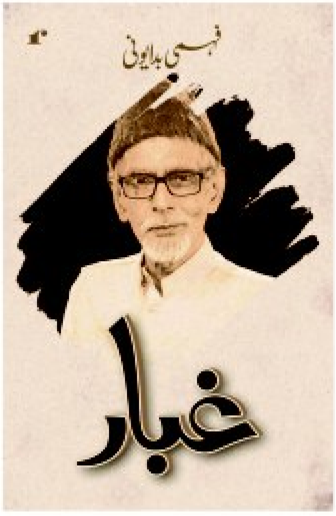


کبوتر جو عام طور پر سکون اور آزادی کی علامت سمجھے جاتے ہیں، اب بے چینی اور بے یقینی میں اڑ رہے ہیں۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ خطرے سے آگاہ ہیں اور اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فہمی بدایونی نے انسانی زندگی کی نازکی، خطرات اور ان کے سامنے آنے والی مشکلات کی اپنی شاعری میں کس طرح بہترین عکاسی کی ہے کہ۔

خوشی سے کب یہ تنکے اڑ رہے ہیں　　ہوا کے ڈر کے مارے اڑ رہے ہیں
کہیں کوئی کماں تانے ہوئے ہے　　کبوتر آڑے ترچھے اڑ رہے ہیں

فہمی بدایونی کی شاعری عزم و ہمت، خود انحصاری، اور نئی راہوں کی تلاش کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ بہادروں یا عظیم لوگوں نے روشنی یعنی رہنمائی یا امید کی تلاش کی ہے۔ وہ اپنے راستے میں مشکلات کا سامنا کرتے رہے ہیں انھوں نے اپنی کمزوریوں، خوف یا مدد کی ضرورت کو چھوڑ دیا ہے۔ بیساکھیاں عام طور پر ان چیزوں کی علامت ہوتی ہیں جو انسان کی مدد کرتی ہیں یا اس کی کمزوری کو چھپاتی ہیں۔ انھیں جلا دینا اس بات کی علامت ہے کہ خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا ہے اور اب وہ کسی مدد یا سہارے کے بغیر خود کو سنبھالنے کے لیے تیار ہیں۔ جس کا اظہار فہمی بدایونی صاحب نے واضح طور پر اس طرح کیا ہے۔

شہسواروں نے روشنی مانگی　　میں نے بیساکھیاں جلا ڈالیں

فہمی بدایونی کی غزلوں اور اشعار کی عوامی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے ویڈیوز کا وائرل ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ انھوں نے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے فن کو پیش کیا اور ہر دل میں جگہ بنائی۔ ان کی آواز، اندازِ بیان اور اشعار کی سچائی نے انھیں ایک منفرد مقام عطا کیا، جہاں وہ نہ صرف اردو کے شائقین بلکہ عام لوگوں کے دلوں میں بھی زندہ رہیں گے۔ 20 اکتوبر 2024 کو ان کے انتقال سے اردو دنیا ایک ایسے شاعر سے محروم ہوگئی جس نے نہ صرف شاعری کے میدان میں اپنی چھاپ چھوڑی بلکہ سماجی شعور اور حقیقت نگاری کا خوب صورت امتزاج بھی پیش کیا۔

■

**Dr. Shahpar Shareef**
Dept of Urdu, School of Humanities
Uttarakhand Open University
Haldwani- 263139 (Uttarakhand)
Mob.:9027699292
sshareef@uou.ac.in

# جمال گیاوی
# شخص و شاعر

آفتاب عالم

**شعری** اصناف میں غزل کے بعد نظم مقبول عام ہے۔ نظم میں ایک موضوع کی اتنی وضاحت ہوتی ہے کہ شاعر اور سامع دونوں سیر ہو جاتے ہیں اور موضوع بھی تشنہ نہیں رہتا۔ 'نظم' اہتمام وانصرام، ترتیب و تنظیم اور ربط و تسلسل کی متقاضی ہوتی ہے۔ انسانی حیات میں بھی ایک تسلسل ہوتا ہے، گہرا مربوط اور مضبوط بھی۔ ایک بہتا ہوا سیال اور امواج دریا، جس میں طغیانی بھی آتی ہے اور تلاطم بھی ہوتا ہے۔ انسان کی ہر سانس اہم اور قیمتی ہوتی ہے، مگر یہ نفس جب مسلسل چلنے لگتا ہے تو حیات کسی حد تک معتبر اور اہم ہو جاتی ہے۔ بے یقینی میں بھی ایک یقین پیدا ہوتا جاتا ہے۔

نظم بھی اسی طرح کا تسلسل، نظم اور ضبط چاہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ عمدہ اور کامیاب نظمیں دل و دماغ کو آسودگی، فرحت بخش، اطمینان اور ایک انبساط انگیز کیف عطا کرتی ہیں۔ غزل کا مفرد شعر اپنے آپ میں ہزار جامع و مانع سہی، مگر بادلوں کے ہجوم میں ایک تڑپتی ہوئی بجلی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ غزل کے اشعار اگر شبنم کے حسین قطرات ہیں تو نظم زمین کو سیراب اور دلِ دہقاں کو شاداں و فرحاں کر دینے والی موسلا دھار بارش ہے۔

نظم کے تمام اشعار موضوع سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، اس کے اندر تدریجی ارتقا پایا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ شاعر کے تجربات و تصورات کی انسانی حیات کی طرح نشو و نما ہوتی رہتی ہے۔ لیکن تمام خیالات و تصورات، جذبات و احساسات کا ہم آہنگ ہونا ایک کامیاب نظم کے لیے ضروری ہے۔ 'نظم' کی ابتدا نہایت دلکش اور حسین لہجے میں ہوتی ہے۔ اس کا عروج اپنے اندر شباب کا جوش و خروش رکھتا ہے اور انجام و اختتام کی حسن کاری بھی قابل توجہ اور نتیجہ خیز ہوتی ہے، کثرت میں یہی وحدت نظم کو کامیاب بناتی ہے۔

اردو شاعری کے اندر اگرچہ نظیر اکبر آبادی نے نظم نگاری کی ابتدا کی تھی مگر صحیح معنوں میں اس کی ترقی آزاد، حالی، اسماعیل اور درگا سہائے سرور کے ہاتھوں ہوئی اور اسے اوجِ کمال تک اقبال نے پہنچایا لیکن جمال گیاوی کو بھی انھیں متذکرہ شعراء کرام کی صف میں شمار کرنے کی وکالت کروں گا۔ جمال گیاوی کی پیدائش

> ”جمال گیاوی کی پیدائش 4 جنوری 1945 کو آبائی وطن رفیع گنج احمد پور جھکٹیا اورنگ آباد میں ہوئی اور خطاطی میں خوب شہرت پائی۔ میرے نزدیک شاعری وہ چیز ہے جو ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔“

4 جنوری 1945 کو آبائی وطن رفیع گنج احمد پور جھکٹیا اورنگ آباد میں ہوئی اور خطاطی میں خوب شہرت پائی۔ میرے نزدیک شاعری وہ چیز ہے جو ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ پہلے تو اظہار کی خاطر اپنے خالق کو تصوراتی کائنات کے خوبصورت دیدہ زیب مناظر سے آشنا کراتی ہے اور پھر اس کی تصوراتی کائنات کو ایک پل میں سمیٹ کو مصرع کی صورت میں غم کائنات کی ایک ایسی تصویر بناتی ہے، جو خالق، باری کی ذات و وحدانیت کا اقرار کراتی ہے۔

شاعری کے فنی لوازمات میں جن چیزوں کا عمل دخل ہے انھیں عروض داں پہلے ہی بیان کر چکے ہیں، اس لیے کسی کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے شعری اصول و ضوابط کا دہرانا تضیع اوقات سمجھتا ہوں۔ البتہ احتیاط اور شعور و تدبر کو بروئے کار لانا ان امور لازمیہ میں سے ایک ہے، جن کی پاسداری بہ ہر حال کی جاتی ہے۔ جمال گیاوی بھی ایک ایسے ہی شاعر ہیں جنھوں نے یہ مشکل کام اپنے لیے سہل بنا لیا ہے۔ جمال گیاوی نے اپنے مجموعہ نغمات جنوں کے سرورق اور بیک کور پر جو شعر جلی رسم الخط میں پیش کیے ہیں انھیں دیکھیں۔

غور سے دیکھو جمال ہوں میں
ایک ہستی باکمال ہوں میں

———

خوش بختیوں پہ اپنی نہ کیوں ناز ہو جمال
شاگرد شمس کا ہوں مقلد ہوں جوش کا

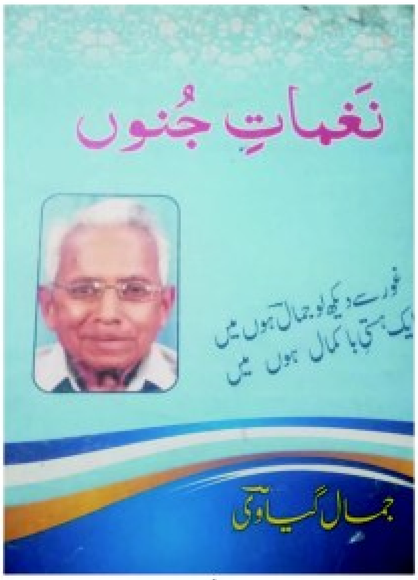


'نغماتِ جنوں' کے جیسا نظموں کا شعری مجموعہ بخدا میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ اوپر درج کیے ناموں کے بعد کے بعض شعرا نے نظم نگاری کے موضوع کو اپنے فکری خیال کا ذریعہ بنایا اور موضوع کے علاوہ نظم کی ہیت میں بھی انقلاب پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔ نظم معریٰ اور آزاد نظمیں بھی کثرت سے لکھی گئیں، مگر میں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ جمال گیاوی صاحب نے کمال کی نظمیں لکھی ہیں۔ نغمات جنوں میں اپنے فنی وفکری شعری کمال سے وہ مجھے بے مثال معلوم ہوتے ہیں۔ کتابت کے فن میں مہارت حاصل کرنے کے بعد 'تاج پریس' گیا کے مسودے، ہفتہ وار نورش (گیا) مورچہ (گیا) ماہنامہ سہیل (گیا) وغیرہ کی کتابت کرتے رہے۔ اردو زبان کی لفظیات کے حسن سے مرعوب ہوئے جمال گیاوی نے اردو کی خدمت اور اپنے روزگار کے لیے کتابت کو موزوں جانا اور یہ کام عرصہ دراز تک کیا لیکن پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے زیر نگرانی جن دنوں آپ نے کام کیا وہ جمال گیاوی کا سنہری دور تھا۔ آپ نے گیارہ سال کتابت کی۔ 24 جولائی 2004 میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے دنیا سے گزر جانے کے بعد یہ کام توقف کی نذر ہوا، اور کچھ دنوں کے بعد جموں یونیورسٹی میں آپ کتابت کے کام پر لگا دیے گئے۔ فن کتاب میں مہارت کی بنیاد پر آپ کے رابطوں میں ملک کی قد آور شخصیات آنے لگیں، متعدد ارباب علم وادب سے مستحکم تعلقات کی مثالیں ان کے شعری مجموعوں کے پس منظر میں لکھی تحریروں سے ملتی ہیں۔ لوگوں سے اچھے اور مضبوط مراسم ہوتے چلے گئے۔

آغاز شاعری سے قبل کسی شعری مجموعے کا منظوم دیباچہ خود طبیعت کو تحیر آمیز بنا دینے جیسا ہے۔ 'نغمات جنوں' میں مالک سنگھ وفا جموں (جموں توی) نے حق ربط وانبساط اور تعلقات کی ایسی مثال دی ہے، جس کی نظیر پانے سے آج تک میں قاصر ہوں۔ نظموں پر مشتمل مجموعے کے تناظر میں 12 مصرعوں کا مکمل دیباچہ منظوم لکھ دینا میں سمجھتا ہوں حیرت میں ڈال دینے سے کم نہیں۔ مالک سنگھ وفا لکھتے ہیں۔

دل فریب و دلنشیں ہے سوزِ نغمات جنوں
دل کو میرے بھا گئی آواز نغمات جنوں
ہے یہی میری تمنا اے جمال ہم نشیں
میں بھی دیکھوں ایک دن پرواز نغمات جنوں
ہوں گے انگشت بدنداں دشمن اردو ادب
ایک دن دیکھیں گے جب اعجاز نغمات جنوں

تین اشعار اور بھی ہیں منظوم دیباچہ میں، جنھیں طوالت کے پیش نظر نقل نہیں کر رہا ہوں۔ اپنی بات مصنف جمال گیاوی نے ثابت قدمی کے ساتھ لکھی ہے، اپنی خامیوں اور خوبیوں کے بارے میں اگلے وقتوں کے ادیبوں کی رائے من وعن کتاب میں نقل کر دیا جانا رہ مستقیم کے سفیر کی نشانی ہے۔ غور کیجیے جس شاعر کا پہلا شعری مجموعہ 'سوزِ دروں' کے نام سے 1967 میں شائع ہوا ہو اس کی شاعری میں کس بلا کی پختگی در آئی ہوگی، یہ سوچنے کا مقام ضرور ہے۔ اس مجموعے کے پیش لفظ میں علی سردار جعفری (مرحوم) نے فرمایا تھا کہ ''بمبئی میں میں جن شاعروں سے متاثر ہوا ہوں ان میں جمال گیاوی بھی ہیں۔ ان کی نظموں میں جوش ملیح آبادی کا رنگ نظر آتا ہے اور غزلوں میں جمیل مظہری کا، یہ کمسن اور ہونہار شاعر ایک دن آسمان ادب پر آفتاب بن کر چمکے گا۔''

''جمال گیاوی کے تعلق سے ظہیر غازیپوری، نے بھی اپنے تاثرات دیے ہیں، بقول ظہیر غازی پوری جمال گیاوی کی شاعری میں خوبیاں کم اور خامیاں زیادہ ہیں۔ ان کو ابھی اپنی شاعری پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے''۔ اس تاثر کے بعد جمال گیاوی اپنی کتاب نغماتِ جنوں میں رقمطراز ہیں ''بہر کیف پچاس سال کا یہ طویل سفر طے کرنے کے بعد میری شاعری کس مقام پر پہنچی ہے۔ اس کا فیصلہ قارئین کرام کے اوپر چھوڑتا ہوں''۔ جمال گیاوی 1970 میں گیا سے پٹنہ چلے گئے تھے مگر فن کتابت اور شاعری میں جمال گیاوی کا جمال دیکھتے ہی بنتا ہے۔ جمال گیاوی کی شعروادب سے غیر معمولی دلچسپی ان کے تعمیری ذہن اور مثبت افکار وخیالات کی دین ہے، لیکن جسے ہم اور آپ جمال کا نام دیتے ہیں یہ جمال اس وقت مزید نکھرتا اور اپنی جانب متوجہ کرتا ہے جب توصیف اردو زبان پر جمال گیاوی قلم اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

ہم داستانِ غالب و اقبال کیا کہیں
کیسے گزر گئے ہیں مہ وسال کیا کہیں
سازش کے بُن رہے ہیں عدو جال کیا کہیں
اردو زباں کا آج جو ہے حال کیا کہیں
پھٹتا ہے غم سے میرا کلیجہ یہ دیکھ کر
دل رو رہا ہے میرا تماشہ یہ دیکھ کر

شعروں میں ایطا ہے کہیں املا کی غلطیاں
اڑنے لگیں ہیں خوب تلفظ کی دھجیاں
جملوں کی ساخت ٹھیک نہ بحروں کی سختیاں
جو غیر اردو داں ہیں وہ کستے ہیں پھبتیاں
جن کو شعور ہی نہیں لفظ وبیان کا
کیا ہوگا اب زمانے میں اردو زبان کا

نغماتِ جنوں شعری مجموعے میں یہ وہ نظم اُردو ہے جس کے بہت سے بند میں سے صرف دو بند یہاں حسب

'نغماتِ جنوں' میں مالک سنگھ وفا جموں (جموں توی) نے حق ربط وانبساط اور تعلقات کی ایسی مثال دی ہے، جس کی نظیر پانے سے آج تک میں قاصر ہوں۔ نظموں پر مشتمل مجموعے کے تناظر میں 12 مصرعوں کا مکمل دیباچہ منظوم لکھ دینا میں سمجھتا ہوں حیرت میں ڈال دینے سے کم نہیں۔

ضرورت شامل کیے، آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ جمال گیاوی کی نظر زبان استعمال کرنے اور زبان کا دم بھرنے والے زبان دانوں کے ساتھ زبان پر تر چھے وار کرنے والوں پر بھی ہے۔اس کے باوجود آپ کی نظموں میں منفی پہلوؤں کے لیے میں سمجھتا ہوں کسی قسم کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ ویسے بھی ہندوستانی معاشرے میں ہر تیسرا فرد ذہنی تناؤ کا شکار ہے تو وہ منفی تناؤ کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اردو زبان کے ساتھ بھی ایسا ہی اکثر و بیشتر جمال گیاوی کو دیکھنے کو ملا۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ منفی جذبات پر تناؤ ہوتے ہیں، ایسے لوگوں میں ہر وقت فکر مندی، غصہ، مزاج میں مستقل خوف اور وسوسوں میں گھرا ہونا ایسوں کا مقدر ہو جایا کرتا ہے۔ یہ امر باعث اطمینان اور مسرت خیز ہے کہ بیشتر نظموں میں جمال گیاوی کی احکام الٰہی سے کامل وابستگی کا احساس ہوتا ہے۔جبکہ کچھ نظموں میں ان کی سوچ اور تعمیری و اصلاحی مزاج کے مظہر ہونے کی بھی شہادتیں ملتی ہیں۔

آیئے بلا کسی تاخیر جمال گیاوی کی شاعری سے محظوظ ہوا جائے، اور دیکھیں کہ وہ کس طرح کے نظم گو ہیں۔ سرزمین کرگل کے حوالے سے ملک کے جانباز محافظوں اور اس جنگ میں فتح کا پرچم لہرانے والے قومی سپوتوں کے لیے جن عزائم کا اظہار کیا ہے اس نے جمال گیاوی کی نظموں میں انفراد پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ قابل مطالعہ بنانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ سرزمین کرگل کا یہ دو بند ملاحظہ کریں۔

تم غم نہ کرو اے مرے جانباز سپاہی
تم حق کے پرستار ہو انصاف کے راہی
پیدا صف دشمن میں کرو زور تباہی
گو دن بھی تمہارے لیے ہے شب کی سیاہی
منھ کھولے یہاں موت بھی سرگرداں ہے کل سے
ڈرنا نہیں سیکھا ہے مگر تم نے اجل سے

———

جس قوم کے دل میں بسا ابلیس لعیں ہے
اس قوم کی تقدیر میں دنیا ہے نہ دیں ہے
سر ہے کہیں انسان کا تو جسم کہیں ہے
ہاں خون سے لت پت یہی کرگل کی زمیں ہے
قربان کیا جس نے زمیں کے لیے تن کو
کرتا ہوں سلام ایسے شہیدان وطن کو

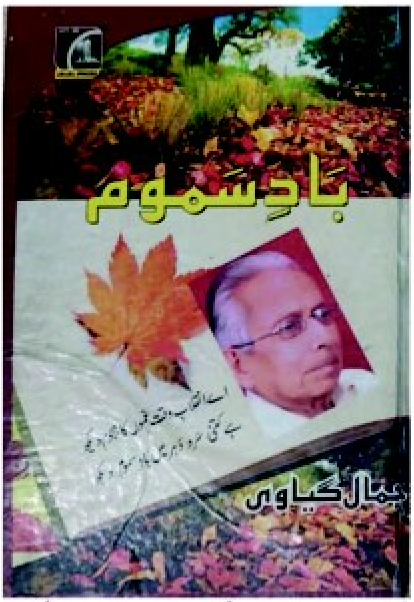

نظموں کے عنوانات دیکھنے کے قابل ہیں، مثلاً اپنی والدہ کی یاد میں، جوش ملیح آبادی کے سانحہ ارتحال پر، میرا وطن، داستانِ ماضی، عورت، میرے بھارت کی شان، گاؤں کی ایک دوشیزہ، تاج محل، وادیٔ کشمیر، حالات حاضرہ سے متاثر ہوکر، سوال، علامہ اقبال، ساقی نامہ، جگن ناتھ آزاد، فرنگی اور ہم، نئی نسلوں کے نام، خانہ بدوش، وزیر اعلیٰ بہار نتیش کمار جی کے نام، ماتم آزادی، اردو زبان، طوائف، ریاض گیاوی کے نام، ماں باپ، وقت، جموں کی شام، سرزمین کرگل،

**نظم کا بنیادی اصول جمال گیاوی کے مزاج پر اس قدر اپنا غلبہ طاری کر چکا ہے کہ اب وہ سوچتے یا کہتے ہیں وہ بھی ایک نظم کے پیکر میں ڈھلنے کو بیتاب نظر آتا ہے۔**

جشن آزادی، روداد عید، اکیسویں صدی، تغیرات جنوں، شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ، تہنیت نامہ، جشن عید، شاہ جہانِ ثانی، سچے موتی، بھول جا، رفیقۂ حیات کے انتقال پر، رشک چمن، سرشک خول، پرستاران ادب سے معذرت کے ساتھ، مسلمانوں سے خطاب، اور دعا نظم شامل ہے۔

نظم تاج محل کا ایک بند پیش خاطر ہے۔

دنیائے عاشقی میں ترا اونچا ہے مقام
دلچسپی رکھتے ہیں تری شہرت سے خاص و عام
اب ذہن سے اترتا نہیں تاج تیرا نام
اس خوش نما محل میں ہے ممتاز کا قیام

تاعمر جس نے اپنی وفاؤں کی چاہ کی
اک یادگار ہے یہ اسی بادشاہ کی

جمال گیاوی کے یہاں جہاں لطافتِ شعر ہے، نزاکت اور بانکپن ہے وہاں برمحل تراکیب اور شوخی کی بھی کوئی کمی نہیں نظر آتی۔ نظم رشکِ چمن اس کی بین مثال ہے ایک بند پر اکتفا کریں۔

پلکیں ہیں تری جیسے کوئی نوک سناں ہو
جھک جائیں تو خاموش نگاہوں کا بیاں ہو
اٹھ جائیں تو اس دہر کا ہر راز عیاں ہو
بیمار جو دیکھے اسے وہ تاب وتواں ہو
بے خود ہر اک انسان ہو وہ تجھ میں پھبن ہے
تو رشکِ چمن، رشکِ چمن، رشکِ چمن ہے

نظم میں زندگی کے تجربات کبھی آہوں میں بکھرتے نظر آتے ہیں تو کبھی چہرے میں کائنات کے حسن کی رنگینیاں جھلکتی ہیں۔ پلکوں کو نوک سناں سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو کبھی جھکی ہوئی خاموش نگاہ کے بیانیے کی بات ہوتی ہے، نگاہ اٹھنے پر دہر (دنیا) کا ہر راز افشا ہو جانے کی بات کہی جا رہی ہے، بیمار اگر اٹھتی ہوئی نگاہ دیکھ لے تو توانائی پالے، غرض کہ جمال گیاوی کی جولانیٔ طبیعت شوخیٔ گفتار اس نظم میں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

نغمات جنوں، ہی نہیں، سوز دروں میں جتنی بھی نظمیں ہیں ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ شروع کی ایک نظم ''مناجات'' تو ہے، اس کے بعد جو بھی نظم آپ نے لکھی ہے ایک ایسی موتیوں کی مالا ہے جس کے داخل میں سے کسی ایک مصرع یا سطر کے نکالنے کی بھول میں نظم کی مالا توڑ نا صنف نظم کو فوت کر دینے کے مترادف ہوگا۔ نظم کا بنیادی اصول جمال گیاوی کے مزاج پر اس قدر اپنا غلبہ طاری کر چکا ہے کہ اب وہ سوچتے یا کہتے ہیں وہ بھی ایک نظم کے پیکر میں ڈھلنے کو بیتاب نظر آتا ہے۔ افسوس جس وقت یہ مضمون لکھا گیا اس کے فوراً بعد جمال گیاوی کے انتقال کی خبر آ گئی، اللہ غریق رحمت کرے۔ آمین۔ ان کا انتقال 25 مئی 2024 پٹنہ عالم گنج بہار میں ہوا۔

■

**Dr. Aftab Alam**
Haji Jamaluddin Library
At +Post: Nauranga
Distt: Gaya -823003 (Bihar)
Mob.: 9162669393
E-mail: aftabalam898608@gmail.com

# ہمارا تمدن

ایس کے سنگھ

”میں یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ میرے مکان کے چاروں طرف دیواریں کھینچ دی جائیں اور کھڑکیاں بند کردی جائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمام دنیا کا تمدن ہوا کی طرح لہراتا ہوا زیادہ سے زیادہ میرے مکان میں داخل ہو۔“ (مہاتما گاندھی)

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان کا سماج ان تمام اثرات کو لیے ہوئے ہے جو وقتاً فوقتاً ہندوستان میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ ان اثرات کی گہرائی اس کے ادب، موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ میں پائی جاتی ہے، جو یہاں کے باشندوں کی تخلیقی قوت کی مظہر اور علمبردار ہے۔ یہ تمام فنون حال تک بطور خود ہندوستانی سماج کے مذہب کے زیر اثر رہے ہیں اور اس کا دوسرا پہلو جو ان تمام میں پایا جاتا ہے یہ ہے کہ ان کا اتار چڑھاؤ شاہانِ وقت یا شاہی دربار کی سرپرستی کا مرہون منت رہا ہے۔ بالخصوص فن تعمیر اور فن سنگتراشی کیونکہ یہ لامحدود اخراجات کے حامل ہوتے ہیں۔ مصوری، موسیقی اور ادب اپنی قدرتی شکل میں بذات خود ترقی کرسکتے ہیں اور یہ عوام کی امداد اور جوش کی وساطت سے نشو ونما پالیتے ہیں۔ یہ دو صورتیں یعنی ان کا مذہب کے ساتھ گہرا تعلق اور حکومت کی سرپرستی پر انحصار دوسرے ملکوں کے فنون میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان اور یورپین ملکوں میں ایک زبردست فرق بھی رہا ہے کہ ہندوستان میں ذات پات کے باعث تعلیم ایسی عام اور وسیع نہیں ہوئی ہے جیسی موجودہ یورپ میں۔ اب بھی سیکڑوں ہندوستانی تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے تمدنی ورثہ سے عام لوگوں کو اتنا فائدہ نہیں ہوا جیسا کہ اب ہو رہا ہے۔

ہندوستان کا ادب متعدد نظریوں کے امتزاج کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ جس طرح آج ہم کسی ایک شخص کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی رگوں میں خالص آریہ یا خالص دراوڑ خون ہے اسی طرح ہم کسی ہندوستانی زبان کے متعلق بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ قطعی طور پر خالص زبان ہے کیونکہ یہ تمام کئی ایک تاثرات کی تخلیق ہیں۔ ہندوستانی ادب میں تین ملکی اور ایک غیر ملکی زبان کی آمیزش صاف دکھائی دیتی ہے اور یہ ہیں دراوڑ، سنسکرت، فارسی اور انگریزی زبانیں۔

زمانہ قدیم کا ادب جو کچھ بھی ہم تک پہنچا ہے وہ سب سنسکرت میں ہے۔ وید دنیا بھر میں تسلیم شدہ سب سے پرانی کتاب ہے۔ لفظ وید جو سنسکرت کے فعل 'وِدْ' سے نکلا ہے کا ارتھ 'جاننا' ہے۔ یہ ایک مناسب نام ہے کیونکہ شروع کے آریہ لوگوں کی زبان میں ہندوستان کا راز بیان کرتے ہیں اور جب فن تحریر کمال کو پہنچا تو سنسکرت ادب بھی نشو ونما پانے لگا۔ یہاں تک کہ دنیا کو کلاسیکی زبانوں میں سنسکرت کا رتبہ نہایت بلند ہوگیا۔ اس زبان میں کتنے ہی مختلف مضامین پر کتابیں تصنیف ہوئی ہیں۔ نہایت دقیق فلسفہ، رزمیہ نظموں، راج نیتی یعنی ریاستی نظام سے لے کر گرامر، ڈرامہ اور خوش الحان شاعری ان تمام مضامین پر نہایت کارآمد کتابیں ملتی ہیں۔ مسلمانوں کے آجانے سے یا فارسی کے سرکاری زبان ہوجانے کی وجہ سے سنسکر کا رتبہ کسی طرح کم نہیں ہوا۔ بلکہ اکثر مسلمان حکمرانوں نے سنسکرت کے مطالعے میں دلچسپی لی اور سرپرستی کی۔ اس کا زوال دیگر ہندوستانی زبانوں کی وجہ سے ہوا جو کہ اس سے زیادہ آسان تھیں۔ شمال میں سنسکرت کا دور دورہ تھا تو جنوب میں درواڑ زبانیں نشو ونما پا رہی تھیں۔ جنوب کا سب سے پرانا علم و ادب تامل سنگم ہے جو صدیوں پرانا یعنی مسیح کی پہلی دوسری صدی کا ہے۔ یہ خالص تامل زبان میں ہے۔ جنوب کی دیگر زبانیں کنڑی، تلگو اور ملیالم ہیں اور ان میں سنسکرت کے الفاظ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ زبانیں خاص طور پر نویں صدی کے بعد زیادہ رائج ہوئیں۔ آندھرا پردیش میں تیلگو، میسور کے جینیوں کی زبان کنڑی اور کیرل میں ان دونوں سے بھی پہلے کی زبان ملیالم۔ یادو بادشاہوں کے زمانے میں مراٹھی نے جو سنسکرت اور پراکت دونوں کی ملی جلی زبان ہے، کافی ترقی کی، اور مشرق میں سین بادشاہوں کی سرپرستی میں بنگالی زبان پھلی پھولی۔ اسی طرح گجرات میں جین منیوں کی زبان گجراتی اور پندرہویں صدی میں شنکر دیو کی وجہ سے آسامی اور اسی وقت بہار میں میتھلی اور راجستھان میں راجستھانی زبان نے ترقی کی۔

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے ہمراہ فارسی زبان کو دخل ہوا۔ یہ نہ صرف سرکاری زبان رہی بلکہ ہند میں اس نے اپنی خصوصیت کی وجہ سے ایک بلند پایہ علم و ادب پیدا کیا۔ امیر خسرو ہند کا ایک بلند مرتبہ فارسی داں ہوا ہے۔ فارسی زبان کی وجہ سے شمالی ہند کی زبانوں کی لغت میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ دو اور ہندوستانی زبانیں

تیرہویں صدی میں پیدا ہوئیں۔ ایک ہندی اور دوسری اسی سے اخذ کی ہوئی اردو جس میں عربی اور فارسی کے کافی الفاظ کی ملاوٹ ہے۔ یہ تمام زبانیں نہ صرف عام بول چال میں مستعمل ہوتی تھیں بلکہ ان میں لوک گیت اور بھجن بھی گائے جاتے تھے۔

گذشتہ صدی میں ہندوستان میں ایک اور زبان سرکاری زبان کی صورت میں نمودار ہوئی۔ یہ تھی انگریزی۔ جو تمام زبانوں سے مختلف تھی۔ لیکن چونکہ انگریزی عملداری مقابلتاً کم عرصہ ہندوستان میں قائم رہی، اس لیے یہ زبان اتنی نہیں پھیلی جتنی کہ فارسی۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ انگریزی زبان نے ہندوستانی علم وادب میں کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ انگریزی زبان نے اور اس کے ساتھ ہی یورپ کی دیگر زبانوں نے بھی جن کا انگریزی زبان میں کافی ترجمہ ملتا ہے، ہندوستان کے علم و ادب کو غیر معمولی وسعت دی ہے۔ ان زبانوں میں کئی ایسے مضامین پر بحث ملتی ہے جن کی طرف ہمارے ملک میں کبھی توجہ ہی نہیں دی گئی تھی۔ مثلاً سائنس اور پولیٹکل فلاسفی۔ انگریزی کی وجہ سے ناول نویسی کا آغاز ہوا۔ آج کل بھی اگرچہ اب انگریزی حکومت چلی گئی ہے انگریزی زبان کا کافی رواج ہے اور اس سے ہمیں باہر کی دنیا کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ فنونِ لطیفہ کی مصنوعات کے تلف ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ بہ نسبت ادبی شہ پاروں کے۔ اسی لیے زمانہ قدیم کی مصوری ہم تک بہت کم پہنچی ہے۔ ہاں وہ چند نمونے جو ہمیں دستیاب ہوئے ہیں اور جن میں اجنتا کے غاروں، باگھ اور سیتانواسل کی تصاویر شامل ہیں ان میں سے اول الذکر دو تو گپتا بادشاہوں کے زمانے کی ہیں اور موخر الذکر پالول بادشاہوں کے وقتوں کی ہیں اور یہ ظاہر کرتی ہیں کہ مصوری نے اس ملک میں کتنی شاندار ترقی کی تھی۔ ان مجسموں کے نمایاں خدوخال اور شوخ رنگوں کا نہایت خوب صورت اور متناسب استعمال اعلیٰ پیمانے کی مصوری کا مظہر ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں صدیوں علم مصوری پر تاریکی غالب رہی ہے اور اس دوران غیر ملکی حملہ آوروں کی لوٹ کھسوٹ سے ہمارا فن مصوری نیست و نابود ہو گیا ہے۔ مگر بایں ہمہ ان غاروں کی مصوری ہندوستانی فن مصوری کی تابناک مثال ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی وقت میں مصوری کس قدر بلند پایہ فن تھا۔

مندرجہ بالا فن کے بعد مصوری کا جو ایک نیا انداز اس ملک میں آیا وہ ایک دوسری قسم کا تھا۔ اس نے شمالی ہند میں عہد مغلیہ میں نشو و نما پائی۔ اسے فن تصویر چہ کہا جاتا ہے۔ اجنتا کی تصاویر تو حجم میں بہت بڑی تھیں۔ ان کے بڑے بڑے نقش تھے۔ مگر یہ چھوٹی چھوٹی

**ہندوستان کا ادب متعدد نظریوں کے امتزاج کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ جس طرح آج ہم کسی ایک شخص کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی رگوں میں خالص آریہ یا خالص دراوڑ خون ہے اسی طرح ہم کسی ہندوستانی زبان کے متعلق بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ قطعی طور پر خالص زبان ہے کیونکہ یہ تمام کئی ایک تاثرات کی تخلیق ہیں۔**

تصاویر جیسا کہ نام سے عیاں ہے۔ بہت چھوٹی چھوٹی اور باریک خطوط پر مشتمل تھیں۔ اجنتا کے رنگ کافی جگہ گھیرے ہوئے ہیں۔ مگر یہ تصویر چے چھوٹے چھوٹے جواہرات کی مانند کئی مختلف اور خوب صورت دلکش رنگوں میں چمکتے ہیں۔ اجنتا کی تصویروں کے مضامین بودھوں کی کتھاؤں سے لیے گئے تھے مگر تصویر چوں کی مصوری بادشاہوں اور ان کے درباریوں کی سوانح کو پیش کرتے ہیں۔ یہ تصویر چے کی مصوری مغل بادشاہوں کے دربار میں ایران اور وسطی ایشیا سے آئی تھی۔ اگرچہ بعد میں یہ فن کئی جگہ مروج ہو گیا۔ اٹھارہویں صدی میں کانگڑہ، راجستھان، اور ٹیڑھی گڑھوال میں بھی مقبول ہو گیا۔ ان کا موضوع ہر قسم کے مذہبی، غیر مذہبی، قدرتی نظاروں اور موسیقی کے راگوں پر مشتمل تھا۔

گذشتہ صدی میں اسی طرح بنگالی آرٹ نے جنم لیا۔ اس نے اپنا تاثر ہندوستانی نیز مغربی طرز فن سے لیا۔ اس کے ماہرین نے پانی کے نہایت لطیف رنگوں میں حقیقت نگار اور تاثر پذیر شکلوں میں تصویر کشی کی ہے۔

گذشتہ سو برسوں میں مغربی آرٹ نے مختلف شکلوں میں ہندوستانی آرٹ پر بڑا زبردست اثر ڈالا ہے اور ہندوستانی مصوروں کے لیے دنیا میں ایک نیا دروازہ کھل گیا ہے اور ہر ایک مصور اپنا حسب پسند طرز فن ان متعدد مغربی فنون سے یا روایتی ہندوستانی فن میں سے منتخب کر سکتا ہے۔ اب ہم اسے ہندوستانی آرٹ کے نام سے منسوب نہیں کر سکتے کیونکہ اب یہ ہندوستانی آرٹ دنیا کے آرٹ کا جز بن گیا ہے۔

سنگ تراشی اور فن تعمیر مصوری سے بھی زیادہ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ مختلف اوقات پر مختلف طریقے فن کی آپس میں آمیزش ہوتی رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ پتھر بھی بولتے ہیں اور یہ درست ہے۔ سنگ تراشی اور عمارات قدیمہ کے بکھرے ہوئے کھنڈرات سے ہم پرانے زمانے کی کہانی پڑھ سکتے ہیں۔ عمارتی کھنڈرات پر نگاہ دوڑائیے اور ان دنوں یہاں آنے والے سیاحوں کے بیانات کا مطالعہ کیجیے اور ذرا اپنی قوتِ تخیل کو وسعت دیجیے تو ان آثار قدیمہ کی واضح تصویر آپ کے دماغ میں آجائے گی کہ وہ عمارات جس وقت ان کی تعمیر ہوئی تھی کس انداز کی ہوں گی اور ساتھ ہی آپ وہ مشابہت بھی دیکھ پائیں گے جو ہندوستانی اور غیر ملکوں کی سنگ تراشی اور تعمیرات میں پائی جاتی ہے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ ہمارے اجداد نے تعمیر کے کام میں یا حقیقت نگاری میں جو کچھ بھی مسالہ ان کے ہاتھ لگا مثلاً لکڑی، اینٹ، پتھر یا دھات۔ اسی سے کام لیا۔ دھات اور پتھر کی اشیا تو زمانے کی دست برد سے بچ گئی ہیں مگر لکڑی اور اینٹ کی مصنوعات نابود ہو گئیں۔ ہاں جو کچھ بھی انھوں نے بنایا اتنے وسیع پیمانے پر بنایا کہ خرچ، مسالہ اور مزدوری کی انتہا کر دی۔ خاص کر جب کوئی مندر یا محل کسی بادشاہِ وقت کے فرمان سے بنایا گیا اور بارہا ایسے کاموں کی تخلیق اور تکمیل مذہبی موضوع پر ہی مبنی ہوتی تھی۔ آرٹ کے خیال سے ایسا نہیں کیا جاتا تھا اور اگرچہ ان کی تخلیق ہندوستانی مذہب اور ہندوستانی تعمیر اور ہندوستانی رنگ تراشی کی بنیاد پر تھی تاہم اس میں کئی دیگر ملکوں کے نمونوں کو پیش نظر رکھا گیا اور اس کے عوض میں اپنا انداز دوسرے ملکوں کو عطا کیا گیا۔

■

**ماخذ:** ہندوستان سرزمین اور عوام، **مصنفہ:** نارائن گپتا، **مترجمہ:** ایس کے سنگھ، **دوسرا ایڈیشن:** 2004، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

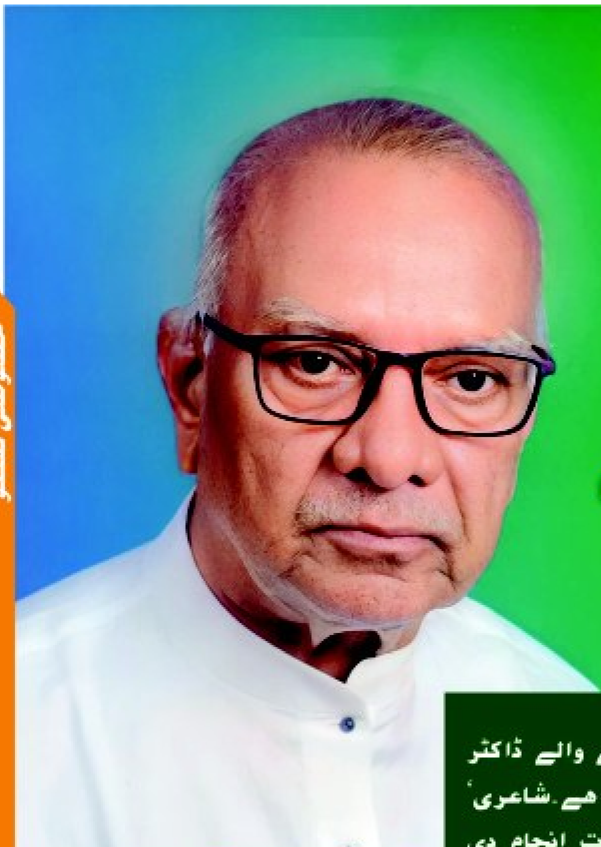

ظہیر فیصل

# نئی نسل اپنی تخلیق کو تخلیقیت کے دم پر زندہ رکھنا چاہتی ہے

## ڈاکٹر معصوم شرقی

شہر نشاط کلکتہ کے نواحی علاقہ کانکی نارہ سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر معصوم شرقی کو عصری منظر نامہ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔شاعری' تحقیق اور انتقادیات کے شعبوں میں انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔نظیر ثانی کی بازیافت ان کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ موصوف نے اشک امرتسری کی ادبی قدرومنزلت کی بازیافت کی ہے' بیسویں صدی کے ایک نئے نظیر کو ادبی منظر نامے پر پیش کیا اور اشک شناسی کی راہ ہموار کی' ان کی ادبی شخصیت کی تعمیر میں اس کتاب نے بڑا کام کیا۔ اس کے علاوہ ان کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کے مجموعے 'ادب جہاں'، 'ادب و احتساب'، 'تراوش قلم'، 'کلکتے کا ادبی ماحول : بیسویں صدی میں'، 'تنقید و تحلیل' اور 'ادب و عصر' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ مجموعے علمی و ادبی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ تعلیمی نصاب کی متعدد کتابوں کے مولف کی حیثیت سے طلبا میں بھی بہت مقبول بلکہ محبوب ہیں۔ابتدا تا حال ملک کے مقتدر ادبی رسائل میں ان کے لکھنے پڑھنے اور چھپنے کی رفتار تیز رہی ہے' بہار، اترپردیش اور مغربی بنگال کی اردو اکادمیوں کے انعامات سے متعدد بار نوازے جاچکے ہیں۔ موصوف اپنی ذات سے علم و فن کی ایک انجمن ہیں۔ پیش ہے اس انٹرویو سے چند اقتباسات:

روشنی ڈالیں۔

**معصوم شرقی** : شہر نشاط کلکتہ سے 35 کیلومیٹر دور باری پاڑہ (کانکی نارہ) کے ایک متوسط گھرانے میں 4رنومبر 1948 میں آنکھیں کھولیں۔ نام عبدالغفار انصاری رکھا گیا۔ میرے والد محمد شفقت علی انصاری تقسیم سے قبل ملازمت کے سلسلے میں بہار سے نقل مکانی کر کے کلکتہ آگئے اور کانکی نارہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

مدرسے کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد چشمۂ رحمت ہائی اسکول سے اسکول فائنل' آر۔ بی۔ سی کالج سے پری یونیورسٹی آرٹس' مولانا آزاد کالج' کلکتہ سے بی اے آنرز (اردو)' کلکتہ یونیورسٹی سے اردو و فارسی ادبیات میں ایم اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور حاصل کی۔ حمایت الغربا ہائر سکنڈری اسکول (کانکی نارہ) کے شعبۂ اردو و فارسی سے بحیثیت استاذ وابستہ رہا اور 4نومبر 2008 کو سبکدوش ہوا۔

**ظ ف:** وہ کیا محرکات تھے جنھوں نے آپ کو شعرو ادب کی طرف راغب کیا؟

**م ش:** کلاسیکی ادب، رسائل اور شعرائے اردو و فارسی کے کلام کے مطالعے نے شعروادب کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ ادبی صلاحیت میری فطرت کا جزو ہے لیکن اسے صیقل کرنے میں استاذی محترم حشم الرمضان (مرحوم) کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ ان کے وجود کی شعاعوں سے میری فکر روشن ہوئی۔ خارجی محرکات میں وہ مشاعرے ہیں جو ہمارے علاقے میں برپا ہوا کرتے تھے۔ پھر بھی

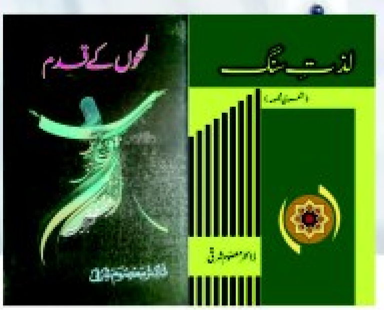


فطری امنگ اور ذہنی اپج نے ہی اپنے اظہار کے لیے شعر کا پیرایہ اختیار کیا۔ اس طرح میرے اندر چھپا ہوا جو شاعر تھا اس نے معصوم شرقی کا روپ دھار لیا۔ زمانہ طالب علمی میں شعرگوئی کی ابتدا ہوئی لیکن باقاعدہ شاعری کا آغاز 1966 سے ہوا۔ 1970 تا 1980 میری ادبی زندگی کا اہم دور رہا ہے۔ میری تخلیقات ملک کے ہر قابل ذکر اخبار و رسائل میں شائع ہوئیں۔

شہر نشاط کلکتہ سے میرا تعلق گھر آنگن سا رہا ہے۔ یہیں میرا شعور پروان چڑھا اور یہیں میری ادبی زندگی کا ارتقا ہوا۔ اس شہر کے تعلق سے میری دو رباعیاں سن لیجیے۔

آماج گہہِ علم و ہنر کلکتہ
ہے وحشت و پرویز کا گھر کلکتہ
اس شہر سے ہے نسبتِ قلبی مجھ کو
رکھتا ہے مجھے محوِ سفر کلکتہ

———

پروان یہیں رہ کے چڑھا فن میرا
کیا خوب کھِلا فکر کا گلشن میرا

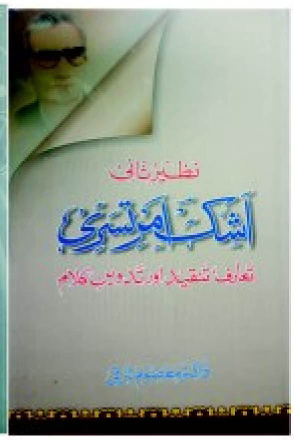


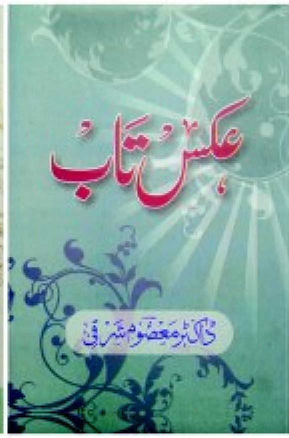


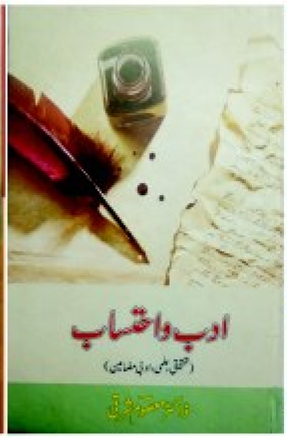


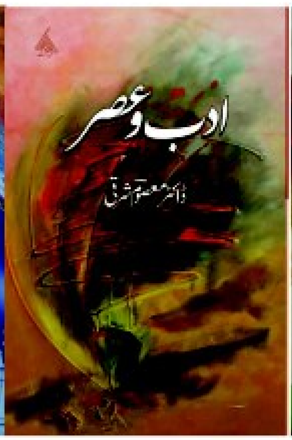


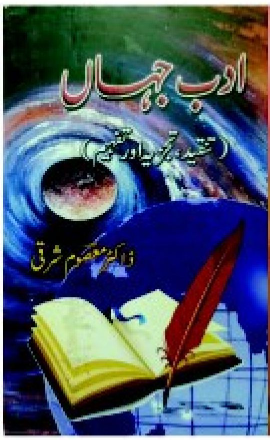


معصوم یہ میرا وطنِ ثانی ہے
بنگال سے وابستہ ہے بچپن میرا

**ظ ف:** تنقید و تحقیق سے وابستگی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

**م ش:** یہ شروع سے ہی مزاج کا حصہ تھا لیکن میرے تحقیقی مقالۂ امتحانیہ کا موضوع بہت سخت تھا۔ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ہفت خواں طے کرنا پڑا۔ سات برس کی محنت شاقہ اور جدوجہد کے بعد میرے بے چین ذوق کو تسکین میسر ہوئی۔ اس کے ضمنی اثرات یہ ہوئے کہ میرے اندر تنقیدی و تحقیقی شعور پیدا ہوا جو 1990 تا حال میری تحریر کا جزو ہے۔ میری تنقید کا اصل مدعا ادب کا معروضی مطالعہ اور ادبی معیار و اقدار کا تعین ہے۔ لیکن شاعری مجھ سے ترک بھی نہ ہو سکی۔ یہ کسی صورت میں اب بھی میرے ادبی مشاغل میں شامل ہے۔ میری بنیادی پہچان میری شاعری کے وسیلے سے ہے تاہم تنقید و تحقیق، تبصرہ، ترجمہ اور سفر نامہ کے میدانوں میں بھی میرے کام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

**ظ ف:** آپ کا کوئی اہم ادبی کارنامہ ؟

**م ش:** ''نظیر ثانی اشک امرتسری : تعارف، تنقید اور تدوین کلام'' ایک تحقیقی کتاب ہے جو اپنے موضوع کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہ ایک قیمتی دریافت اور انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملک کے متعدد سربرآوردہ ناقدین اور محققین نے میری اس کاوش کو نہ صرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا بلکہ بڑی فراخدلی سے سراہا اور رفتار قلم کو جاری رکھنے کا حوصلہ بخشا۔ میری ادبی شخصیت کی تعمیر میں اس کتاب نے بڑا کام کیا۔

**ظ ف:** آپ کے لائحہ عمل میں نوشت و خواند کا تناسب کیا ہے؟

**م ش:** ذوق مطالعہ مجھے طبعی طور پر ملا ہے۔ جو کتاب یا رسالہ ہاتھ لگا بس شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ میں 80 فیصد پڑھتا ہوں اور 20 فیصد لکھنے پر عمل پیرا ہوں۔ میری شادمانی کا سرچشمہ 'نشاط بخش ادب' کا مطالعہ رہا ہے۔ مطالعۂ کتب مجھے ذہنی طور پر پُر نشاط اور احساس و جذبے کی سطح پر تازہ دم، خرم اور شادماں رکھتا ہے۔

**ظ ف:** شاعری اور نثر نگاری دونوں میں آپ کس کو فوقیت دیتے ہیں؟

**م ش:** فوقیت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دونوں کی اپنی اہمیت ہے۔

**ظ ف:** آپ نثر و نظم دونوں میں بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اپنے خیالات و احساسات کے اظہار کے لیے کس میں آسانی یا سہولت محسوس کرتے ہیں؟

**م ش:** اس کے لیے میں نظم کو ترجیح دیتا ہوں۔

> ادب میں ضرورت کے مطابق تحریک کا آغاز ہوا جیسا کہ ترقی پسند تحریک تھی۔ میں نے اس تحریک کو خوش آمدید کہا لیکن ادب میں کسی تحریک کے زیر اثر نعرہ بازی کو میں پسند نہیں کرتا بلکہ میں زمانے میں وقوع پذیر حالات کی ترجمانی کرنا پسند کرتا ہوں، جبکہ ادب میں تصوف کی عکاسی بھی میرا پسندیدہ عمل ہے۔

**ظ ف:** کوئی ایسی تخلیق جسے آپ تحریر کرنا چاہتے ہوں اور ابھی تک تحریر نہیں کر پائے ہوں؟

**م ش:** مرشدِ فن، مشہور صوفی شاعر محمد سعید سرمدؒ میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ میں ان پر بھرپور کام کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ایک بڑا پروجیکٹ ہے۔ ایک باب لکھ چکا ہوں، مزید مطالعہ جاری ہے۔

**ظ ف:** پی ایچ ڈی کی تحقیق کے بارے میں کچھ بتائیں۔

**م ش:** پی ایچ ڈی کی تحقیق کا معیار دن بہ دن گرتا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ اسے کیریئر سے جوڑ دیا گیا ہے۔ ہر کوئی جلدی میں ہے کہ اسے ملازمت حاصل کرنی ہے، ایسے میں معیار کا خراب ہونا فطری بات ہے۔

**ظ ف:** آپ کا خود نوشت سوانح عمری لکھنے کا ارادہ؟

**م ش:** زندگی کے اہم واقعات اور ادب کے نشیب و فراز کو 'ماضی کے تعاقب میں' کے نام سے خود نوشت سوانح عمری جستہ جستہ لکھ رہا ہوں۔

**ظ ف:** عزت، شہرت، محبت یعنی خدا کی اتنی ساری نعمتوں کے میسر آ جانے کے بعد بھی آپ کو اپنی زندگی میں کسی کمی کا احساس ہوتا ہے؟

**م ش:** بشر کو کمی کا احساس دمِ آخر تک رہتا ہے۔ 'قرآن کہتا ہے "اے لوگو! حبِ ذات، حبِ اقتدار، حبِ شہرت، حبِ ستائش اور حبِ زن و زر کی شدت اتنی نہ بڑھالو کہ تمھارے لیے باعث رسوائی ہو جائے۔" عزت اور شہرت اللہ کی دین ہے۔ بشر کو چاہیے کہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرے۔ جب ہم شاکر ہو جائیں گے تو ہمارے اندر حلیمی پیدا ہوگی، دلوں میں اداسی اور کسی کمی کا احساس نہیں ہوگا۔

**ظ ف:** ماشاء اللہ آپ نے طویل عمر پائی ہے۔ آپ نے کئی ادبی تحاریک دیکھیں۔ آپ نے کس تحریک کو خوش آمدید کہا؟

**م ش:** ادب میں ضرورت کے مطابق تحریک کا آغاز ہوا

جیسا کہ ترقی پسند تحریک تھی۔ میں نے اس تحریک کو خوش آمدید کہا لیکن ادب میں کسی تحریک کے زیر اثر نعرہ بازی کو میں پسند نہیں کرتا بلکہ میں زمانے میں وقوع پذیر حالات کی ترجمانی کرنا پسند کرتا ہوں' جبکہ ادب میں تصوف کی عکاسی بھی میرا پسندیدہ عمل ہے۔

**ظ ف:** آپ کے خیال میں کیا ادب کے ذریعے لوگوں میں سماجی آگہی پیدا کی جاسکتی ہے؟

**م ش:** ضرور کی جاسکتی ہے' اگر ادیب وشاعر اس امر کی جانب توجہ دیں۔ صرف تفننِ طبع اور داد وتحسین بٹورنے کے لیے ادب تخلیق کرنے سے گریز کریں۔

**ظ ف:** آپ 'ادب برائے ادب' کے قائل ہیں یا 'ادب برائے زندگی' کے؟

**م ش:** 'ادب برائے ادب' کی مخالفت کیے بغیر میں 'ادب برائے زندگی' کو ترجیح دیتا ہوں۔

**ظ ف:** یہ بات عام ہے کہ رباعی کے اوزان 24 ہیں لیکن بعض عروض داں کی رائے ہے کہ رباعی کے اوزان 34 ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

**م ش:** قدما نے رباعی کے 24 اوزان مقرر کیے ہیں جن پر مدتِ مدید سے شعرائے متقدمین' متوسطین اور متاخرین نے طبع آزمائی کے عمدہ نمونے پیش کیے۔ بیسویں صدی کے نصف کے بعد زار علامی اور دیگر عروض دانوں نے بحر رباعی میں اضافہ کیا اور خود ان کے نمونے پیش کیے۔ لیکن ان نئی بحروں کو بعض شعرا نے قبول کیا اور بعض نے نہیں قبول کیا لیکن 24 بحریں مستند ہیں۔

**ظ ف:** کیا نئی نسل کو نقاد کی عدم موجودگی کا احساس ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟

**م ش:** نئی نسل اپنی تخلیق کو تخلیقیت کے دم پر زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ نئی نسل اس بات کو محسوس کرنے لگی ہے کہ اگر تخلیقات میں متوجہ کرنے کی صلاحیت ہے تو از خود نقاد حضرات فن پارے کی طرف رجوع کریں گے۔

**ظ ف:** آپ کے بعد کی نئی نسل کے قلمکاروں سے آپ کی کیا توقعات ہیں؟

**م ش:** میں اپنے بعد کی نئی نسل کے قلمکاروں سے بہت پرامید ہوں۔ ان میں تخلیقی اعتبار سے آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ اچھے شاعر' افسانہ نگار' ناول نگار اور دوسری اصناف میں اچھے لکھنے والے متعارف ہورہے ہیں لیکن وہ عجلت پسند ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وقت سے پہلے ان کو وہ سب کچھ مل جائے جس کے لیے ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ انھیں سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔

**ظ ف:** مشاعرے کی اہمیت وافادیت سے کم وبیش ہر کوئی واقف ہے۔ ادبی نشستوں کی اہمیت پر کچھ اظہار خیال کریں۔

**م ش:** ادبی نشستوں میں حصہ لینے والے لوگ معیاری ہوں تو شاعر اور سامع دونوں کی تخلیقی اور تنقیدی قوتوں میں اضافہ ہوتا ہے' تازہ گویوں کی قابل لحاظ جماعت سامنے آتی ہے۔ ادبی نشستوں کی افادیت اس وقت بہت مستحکم ہوجاتی ہے جب ان میں شرکاء اعلیٰ معیار کے ہوں اور اعلیٰ ظرف بھی رکھتے ہوں یعنی ان میں تنقید اور نکتہ چینی کی صلاحیت ہو۔ ایک زمانہ یہ آیا ہے کہ سخن

شناس مفقود ہیں اور ناشناس خود کو بحر ادب کا شناور' دریائے معانی کا غواص سمجھتے ہیں۔

**ظ ف:** کیا اردو کے موجودہ منظر نامے سے آپ مطمئن ہیں؟

**م ش:** مطمئن تو نہیں ہوں مگر مایوس بھی نہیں ہوں۔ ہر صنف میں باصلاحیت لکھنے والوں کی کمی نہیں مگر سستی شہرت اور انعام کی رقم کے لیے کچھ لوگ اپنی سطح سے نیچے اتر رہے ہیں۔ میں نے ایک شعر میں اس خیال کو اس طرح باندھا ہے۔

ضمیر بیچ کے حاصل جسے کیا تو نے
ترے گلے میں وہی تمغۂ ادب تو نہیں

**ظ ف:** آپ اپنے ہم عصر ادبا وشعرا کے بارے میں کچھ بتائیں۔

**م ش:** دیکھیے جناب! 'ہم عصر' اور 'ہم عمر' میں بڑا فرق ہے۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اول الذکر میں وہ ادبا وشعرا شامل ہیں جن کی طبعی اور تخلیقی عمر بھی ہم سے بہت زیادہ ہے لیکن ایک ہی عہد میں ساتھ ساتھ تخلیقی سفر جاری رہا۔ ایسے قابل احترام بزرگ ہم عصر شعرا وادبا میں جرم محمد آبادی' نواب دہلوی' احمد سعید ملیح آبادی' سالک لکھنوی' ابراہیم ہوش' علقمہ شبلی' نصر غزالی' ناظم سلطان پوری' مظفر حیدری' قیصر شمیم' احسان دربھنگوی' مظہر امام' رونق نعیم' حشم الرمضان' عابد ضمیر' فیروز عابد' اویس احمد دوراں وغیرہ۔

'ہم عمر' معاصرین میں نصرت جمیل' احمد رئیس' انیس رفیع' صدیق عالم' ف س اعجاز' ایم اے نصر' خورشید اختر فرازی' ڈاکٹر خواجہ نسیم اختر' شہناز نبی' شہیرہ مسرور' زار غازی پوری' ایم نصر اللہ نصر' انور حسین انجم وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام قلمکاروں سے میرے خوشگوار تعلقات رہے ہیں۔

**ظ ف:** شہر نشاط کلکتہ کے ادبی منظر نامے پر کچھ روشنی ڈالیں؟

**م ش:** کلکتے میں تحقیقی' تنقیدی اور تخلیقی سرگرمیاں دوسری ریاستوں سے کم تیز نہیں ہیں۔ دور حاضر میں جن قلمکاروں سے کلکتے کا ادبی مستقبل وابستہ ہے اُن کی موجودگی یہاں کے ادبی منظر نامے کے روشن مستقبل کی ضمانت سمجھی جاتی ہے۔ رواں صدی میں کلکتہ ومضافات کے شعر وادب کا جو منظر نامہ ابھرتا ہے وہ قابل قدر اور خوش آئند ہے۔ میں ان تمام قلمکاروں کو تہنیت پیش کرتا ہوں۔

**ظ ف:** خدمت ادب میں آپ نے نصف صدی گزار دی' آپ کا جو کچھ بھی ادبی سرمایہ ہے کیا اس سے آپ مطمئن ہیں؟

**م ش:** کمی کا احساس فنکار کی زندگی کی علامت ہوتی ہے۔ اگر فنکار زندگی سے پوری طرح مطمئن نہیں ہے' اس نے جو کچھ کیا ہے اس سے اگر وہ مطمئن نہیں ہے تو وہ زندہ ہے اور اگر مطمئن ہوگیا تو گویا وہ مرگیا۔

**ظ ف:** نئی نسل کے لیے کوئی پیغام؟

**م ش:** نئی نسل کے لیے مرزا بیدل کا ایک شعر نذر ہے۔

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدستِ تو از شاخِ تازہ تر ماند

(بہار کا یہ تمام سرمایہ مجھ سے لے لو کہ پھول تمہارے ہاتھ میں شاخ سے زیادہ تر وتازہ رہتا ہے)

■

**Md Zahiruddin (Zahir Faisal)**
Research Scholar, Dept of Urdu
Aliah University
Kolkata- 700014 (West Bengal)
Mob.:9681548062
md.zahiruddin428@gmail.com

مصنف: شیام سنگھ ششی
مترجم: محبوب الرحمٰن فاروقی

# بھیل عورتیں

**بھیل** راجستھان، گجرات، مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے مغربی حصے میں بھیل دوسرا سب سے بڑا درج فہرست قبیلہ ہے۔ ان میں زیادہ تر مغربی راجستھان کے اودے پور، بانسواڑہ، درگاپور، بھیلواڑہ اور چتوڑگڑھ کے ضلعوں میں رہتے ہیں۔ راجستھان کے ہر پانچ درج فہرست ذات کے ارکان میں سے دو بھیل ہیں۔

ہندوستانی قبائلیوں میں بھیل اعلیٰ نشانے باز مانے جاتے ہیں۔ مہابھارت کے زمانے میں درونا چاریہ کا شاگرد ایکلپیہ بھیل تھا وہ اپنے وقت کا مثالی نشانے باز تھا۔ رام کو بیر نذر کرنے والی شبری بھی بھیل مانی جاتی ہے۔

'بھیل' دروڑ لفظ سے نکلا ہے جس کا مطلب 'دھنش' ہے اور یہ اس قبیلے کا خاص ہتھیار ہے۔ قدیم سنسکرت ادب میں اس لفظ کا استعمال دوسرے جنگلی قبیلوں جیسے نشاد، شبر کے لیے بھی کیا گیا ہے۔ نشاد کا مطلب ہے۔ برہمن باپ سے شودر ماں کی اولاد، حقیقت میں بھیل نام ان قبائلیوں کو دیا گیا جو تیر کمان کا استعمال کرتے ہیں۔

بھیل اپنی ابتدا ایک راجپوت قبیلے سے مانتے ہیں جن کی شاخیں درج ذیل ہیں:

| | |
|---|---|
| ہیرات | تیجات |
| نوات | کھیتات |
| رتنات | امرات |
| بھیتات | جگات |
| رنگات | نکیات |

ناڈ نے بھیلوں کا تذکرہ کالے اور بھدے، سب سے لمبے، پورا جسم ڈھک لینے والی لمبی داڑھیوں اور بالوں والے لوگوں کی شکل کا کیا ہے، بھیلوں کے لیے بھلا اور بھیڑا ناموں کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

بھیل گاؤں کو پال کہا جاتا ہے، جس میں مختلف 'پھل' ہوتے ہیں۔ پھل میں ایک ہی باپ کے خاندان کے مختلف افراد رہتے ہیں۔ لیکن پال، لفظ کا استعمال تبھی کیا جاتا ہے۔ جب وہاں 2000 سے زیادہ آبادی ہو ورنہ وہ گاؤں ہی کہلاتا ہے۔

ڈاکٹر ایل ایل دوشی کا قول ہے کہ خاندان کی عورتوں پر مردوں کی فوقیت ایک مسلمہ خاندانی روایت ہے۔ خاندان کی عورتوں سے ان کی حیثیت کے مطابق سلوک کی امید کی جاتی ہے۔ مرد اکثر و بیشتر فحش گالیوں کے استعمال سے اپنی فوقیت جتاتے ہیں، لیکن عورتوں کی طرف اس طرح کی زبان کے استعمال کی امید نہیں کی جاتی۔ اس کے برعکس ان سے امید کی جاتی ہے کہ وہ خاموش رہیں۔ یہ ان کے کمزور ہونے کی علامت ہے۔ اگر بیوی شوہر کا حکم نہیں مانتی تو اس کو مارا جاتا ہے جس کے شور و شغب سے پورا گاؤں یہ جان لیتا ہے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

لیکن گھنتالی کے بھیلوں کا سلوک اس سے مختلف ہوتا ہے۔ وہاں عورتیں مردوں کے لیے اتنے لحاظ کا جذبہ نہیں رکھتیں اور نہ ہی مردانہ فوقیت کا خیال کرتی ہیں۔ اگر شوہر بیوی سے گالی گلوج یا فحش کلامی کرتا ہے تو بیوی بھی شوہر کے لیے ویسے ہی الفاظ کا استعمال کرتی ہے۔ بیویوں کے ذریعے شوہروں کو مارنے پیٹنے کے واقعات بھی بعید نہیں ہیں۔ یہاں عورتیں جنسی اخلاقیات کی بندشوں کا بھی اتنا لحاظ نہیں کرتیں۔ جتنا کہ میدانی علاقوں کی عورتیں کرتی ہیں۔ اگر شوہر جنسی طور پر مطمئن نہیں کر سکتا تو بیوی اسے گالیاں دیتی ہوئی علی الاعلان نامرد کہہ کر اسے ہمیشہ کے چلے چھوڑ سکتی ہے۔ دوسری طرف جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کاوریا اور منبلا میں عورتوں کا خاندان کے مردوں کی مرضی کو مقدم ماننا بہتر سمجھا جاتا ہے۔

بھیل پدری خاندان ماننے والی، ایک ہی نسل اور ایک شادی کرنے والی برادری ہے۔ شادی کے بعد

> بھیل عورتیں گھر پر بھی کام کرتی ہیں اور شوہر کے ساتھ کھیت میں بھی، وہ جنگلوں سے ایندھن جمع کرتی ہیں اور جانوروں کو چراتی ہیں۔ وہ مردوں سے زیادہ محنتی ہوتی ہیں۔

دلہن اپنے شوہر کے گھر آجاتی ہے صرف 'گھر داماد' اس سے مستثنیٰ ہے۔ جو شادی کے بعد اپنی بیوی کے ماں باپ کے گھر رہتا ہے۔ ایسی حالت میں خسر کی جائداد کا وہ وارث ہوتا ہے۔ بھیلوں میں شادی ایک سماجی بندھن مانا جاتا ہے۔

بھیل عورتیں گھر پر بھی کام کرتی ہیں اور شوہر کے ساتھ کھیت میں بھی، وہ جنگلوں سے ایندھن جمع کرتی ہیں اور جانوروں کو چراتی ہیں۔ وہ مردوں سے زیادہ

محنتی ہوتی ہیں۔ جناب این این ویاس کا قول ہے کہ بھیل عورت کسی بھی قبیلے یا برادری کی عورت کی طرح زندگی کے تین اہم مراحل سے گزرتی ہے۔ کنوارا پن۔ ازدواج اور ماں کی حیثیت۔ شادی سے قبل وہ اپنے باپ کے گھر رہتی ہے، جہاں بھیل تہذیب کے مطابق اسے سماجی اخلاق و اطوار کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بچپن سے ہی لڑکی گھریلو کاموں میں اپنی ماں کی مدد کرتی ہے۔ سات آٹھ برس کی عمر میں وہ ماں کی غیر موجودگی میں چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ بارہ تیرہ سال کی ہوتے ہوتے وہ اپنے گھر کا ہر کام کرنے کے لائق ہوجاتی ہے۔

ڈاکٹر دوشی کے مطابق بہو کے خاندان میں ضم ہوجانے (گھل مل جانے) کے سلسلے میں کچھ دقتیں پیدا ہوتی ہیں کیونکہ خاندان سے باہر شادی کے رواج نیز گاؤں کے دو تین خاندانوں میں منقسم ہونے کی وجہ سے بہو ہمیشہ دوسرے گاؤں کی ہوتی ہے جس کی وجہ سے شوہر کے خاندان میں اسے ایک الگ سماجی انداز و عمل ملتا ہے مگر اعلیٰ ذات کے ہندو، جو مشترکہ خاندانوں کے رکن ہوتے ہیں، کے مقابلے میں ان کے سامنے کم دقتیں پیش آتی ہیں کیونکہ اپنے سسر کے گھر میں صرف چند سال ہی رہتی ہیں اور جیسے ہی ان کا خاوند اپنے کھیتوں کے تعلق سے آزاد ہوجاتا ہے۔ وہ شوہر کے بنائے ہوئے نئے گھر میں چلی جاتی ہیں۔ سسر کے گھر میں بسر کیے گئے وقت کو وہ نئے تعلقات استوار کرنے میں صرف کرتی ہیں۔

کنواری لڑکی کو پاک مانا جاتا ہے کیونکہ وہ پیدائش کی علامت ہوتی ہیں اور اسی علامت کی وجہ سے اسے مختلف طاقتوں کا سرچشمہ مانا جاتا ہے۔ کٹائی کے وقت اسے اناج کا پہلا دانہ دیا جاتا ہے کیونکہ یہ عقیدہ ہے کہ اس سے فصل اچھی ہوتی ہے۔ شادی کے موقعے پر وہ دولہا کو خوش آمدید کہتی ہے۔ اس موقعے پر وہ سر پر مٹی کا گھڑا رکھتی ہے۔ وہی شادی کی رسم کے موقعے پر نوشادی شدہ جوڑے کے کپڑوں میں گرہ بھی لگاتی ہیں اور اسے کھولتی بھی ہیں۔ اگر کوئی مرد کسی کام سے باہر جارہا ہو اور غیر شادی شدہ لڑکی اس کا راستہ کاٹ دے تو یہ اچھا شگن سمجھا جاتا ہے۔

> بھیلوں کی عورتیں بیوہ نہیں رہتیں کیونکہ سوگ کی مدت ختم ہوتے ہی وہ دوسری شادی کرلیتی ہیں۔ صرف بوڑھی عورتیں ہی جو دوبارہ شادی نہیں کرتیں بیوہ رہتی ہیں۔ اس صورت میں بھی اسے خاندان کے دوسرے ارکان عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

بیوی کا مقام اس پر منحصر ہے کہ شادی کس طرح ہوئی ہے۔ ان گاؤں میں جہاں بہت سی بیویوں کا رواج ہے۔ بیوی کو اعلیٰ مقام حاصل نہیں ہوتا۔ جس خاندان میں دو یا تین بیویاں ہوتی ہیں ان خاندانوں میں شوہر کی طرف سے دی گئی اہمیت پر اس کا انحصار ہے۔ پھر بھی بڑی بیوی کی حیثیت بہتر ہوتی ہے اور جشن و تیوہار کے معاملوں میں اور سماجی تعلقات کے سلسلے میں اس کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے ورنہ شوہر اور سوتن میں جھگڑوں کے امکانات ہیں۔ سوکنوں کے آپسی تعلقات زیادہ تر جذباتی ہوتے ہیں کیونکہ جس بیوی کو شوہر کی محبت زیادہ ملتی ہے وہ خاندانی معاملوں میں اپنا حق زیادہ جتاتی ہے۔

بھیلوں کی عورتیں بیوہ نہیں رہتیں کیونکہ سوگ کی مدت ختم ہوتے ہی وہ دوسری شادی کرلیتی ہیں۔ صرف بوڑھی عورتیں ہی جو دوبارہ شادی نہیں کرتیں بیوہ رہتی ہیں۔ اس صورت میں بھی اسے خاندان کے دوسرے ارکان عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

بھیلوں کی عورتوں کا روایتی لباس ٹخنوں تک لمبا گھاگھرا، چوٹی اور زیور ہوتا ہے۔ آج کل بھیل عورتیں ساڑی بھی پہنتی ہی۔ ایک شادی اور بہت سی شادی دونوں کا رواج ملتا ہے۔ مگر نمائش یا صرف دکھاوے کے لیے شادی کا رواج نہیں ہے۔

بھیل عورتیں ہندو دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتی ہیں۔ جیسے گنیش، ہنومان، کالی، چنڈی، وہ دیوالی، ہولی، دسہرا وغیرہ تیوہاروں کو مانتی ہیں۔

راجستھان کی بھیل عورتیں کھیتوں میں مزدوروں کی حیثیت میں بھی کام کرتی ہیں۔ درحقیقت وہ سخت محنت اور لگن کی ایک علامت ہیں۔

■

**ماخذ:** ہندوستان کی قبائلی عورتیں:، **مصنف:** شیام سنگھ ششی، **مترجم:** محبوب الرحمٰن فاروقی، سنہ اشاعت:

# آنکھ

قیصر سرمست

**آنکھ** آپ کے جسم کا صرف ایک حصہ ہی نہیں جو آپ کی خوبصورتی کا مظہر، آپ کی ذہانت کا آئینہ دار آپ کی ہوشیاری کا نقیب اور آپ کی بصارت کا ذریعہ ہے بلکہ بہت کچھ ہے۔ ان دو معمولی سے ڈھیلوں Eye Balls میں قدرت کی بڑی کاریگری پوشیدہ ہے۔ آپ اگر توجہ دیں تو آپ کے لیے معلومات اور بھلائی کے خزانے ہیں ورنہ بینائی کھو دینے کے مواقع بہتیرے ہیں۔ تو آیئے ان دو آب گینوں کے اندر جھانک کر دیکھیں۔

جب روشنی آنکھ میں داخل ہوتی ہے تو عضلات کے سرے Nerve Endings پر اثر انداز ہوتی ہے جو آنکھ کے ڈھیلے Eye Ball کے پچھلے حصے پر واقع ہوتے ہیں جسے Retina کہتے ہیں — یہاں سے روشنی کی شعاعیں عضلاتی خلیوں کے ذریعے دماغ کے مخصوص حصے میں پہنچتی ہیں جسے مرکز بصارت Optical Center کہتے ہیں۔ یہیں سے دماغ دیکھنے کے عمل کا آغاز کرتا ہے۔ اگر کسی شخص کا مرکز بصارت کسی وجہ سے مجروح ہو جائے تو (حالانکہ اس کی بینائی ہر طرح سے اچھی ہے) مکمل طور پر بینائی سے محروم ہو سکتا ہے۔

ہماری آنکھ کا ڈھیلا Eyeball بہت زیادہ پیچیدہ بناوٹ کا حامل ہوتا ہے۔ آنکھ کے ڈھیلے پر شفاف اور مہین سی جھلی قرنیہ Cornea چڑھی رہتی ہے۔

روشنی کی شعاعیں اسی قرنیہ کے ذریعے پانی جیسے محلول (Aqueous Humour Aqueous) بہ معنی پانی جیسا اور (Humour بہ مائع) میں سے گزرتی ہیں یہی آنکھ کا رنگین حصہ Iris کہلاتا ہے۔ آنکھ کی پتلی (پردہ غیبیہ Iris عموماً نیلی، بھوری اور ہری مائل ہوتی ہے) اس کی غرض و غایت روشنی کی مقدار کو کنٹرول کرنا ہوتا ہے جو آنکھ میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے بیچ میں ایک بہت ہی چھوٹا سوراخ ہوتا ہے اور یہی روشنی کو کنٹرول کرتا ہے۔ کھلنے والا حصہ Pupil کہلاتا ہے۔ جب ہمارا سامنا تیز اور چکا چوند کر دینے والی روشنی سے ہوتا ہے تو پیوپل چھوٹی ہو جاتی ہے تا کہ کم روشنی داخل ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ آئرس Iris پیوپل کے گرد قریب ہو جاتی ہے اور جب مدھم روشنی داخل ہوتی ہے تو آئرس سٹ کر پیچھے چلی جاتی اور پیوپل پھیل جاتی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ روشنی آنکھ میں داخل ہو سکے۔ پیوپل کے پیچھے آنکھ کا عدسہ Crystal Line Lens ہوتا ہے۔ تمام روشنی جو آنکھ میں داخل ہوتی ہے وہ عدسہ کے ذریعے سے ہوتی ہے۔

بعض لوگ انسانی آنکھ کو عکس گیر یعنی کیمرہ Camera سے تشبیہ دیتے ہیں۔ دونوں میں روشنی ایک ایسے کھلے حصے سے داخل ہوتی ہے جو بہت چھوٹا ہوتا ہے اور روشنی کی شعاعیں عدسوں سے گزر کر مڑ جاتی ہیں اور تصویر اس حصے پر مرتسم ہو جاتی ہے جو کیمیائی طور پر روشنی کے معاملے میں بہت حساس ہوتا ہے۔ یہ حساس حصہ عکس گیر کی فلم ہے اور آنکھ کا پردہ Retina ہے۔ آنکھ بہ نسبت کیمرے کے بہت زیادہ عظیم تر ہے کیونکہ آنکھ غیر محدود تصاویر، ذخائر کی صورت میں ذہن میں محفوظ کر لیتی ہے اور آئندہ جب کبھی ضرورت پڑے ذہن کے پردے پر آویزاں کر دیتی ہے۔

آنکھ ایک کرہ ہے جو ملائم انسجہ Fabby Tissue کی ملائم گدیوں اور کھوپڑی کی ہڈیوں سے بنے چشم خانے میں رہتا ہے۔ آنکھ کا ڈھیلا اپنی شکل اس طبقے کی وجہ سے برقرار رکھتا ہے جسے صلبیہ Sclera کہتے ہیں۔ آنکھ کا دوسرا طبقہ جو بہت سی عروق دمویہ (خون کی نالیوں) پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسے مشیمیہ کہتے ہیں۔

آنکھ ہمارے جسم کے باقی اعضا کی طرح زندہ عضو ہے اور اسے بھی غذا اور آکسیجن، خون کے ذریعے پہنچتے رہنا چاہیے۔

آنکھ کا انتہائی اندرونی طبقہ Layer شبکیہ Retina بہت سے انتہائی نازک عضلاتی خلیوں Nervecell سے بنا ہے۔ یہ کوئی تصویر حاصل کر کے دماغ کے مرکز بصارت Sightcentre تک عصب بصری Optical Nerve کے ذریعے پہنچاتا ہے۔

آنکھ کے ڈھیلے کا بیرونی طبقہ صلبیہ Sclera آگے آنے کے بعد شفاف قرنیہ Cornea ہو جاتا ہے۔ آنکھ کو زخمی ہونے سے بچاتا ہے۔ قرنیہ Cornea کے پیچھے کا خانہ ایک قسم کے مائع Aqueous Humour سے بھرا رہتا ہے۔

عدسہ آنکھ کا وہ حصہ ہے جہاں سے روشنی کی شعاعیں مڑ جاتی ہیں تا کہ شبکیہ Retina کے نقطۂ ماسکہ پر مرکوز ہو سکیں۔

عدسے میں Folus خود اتنی قوت و صلاحیت ہوتی ہے کہ شکل و صورت بدل سکے۔ یہ موٹے اور تقریباً گول ہو جاتے ہیں۔ جب ہم نزدیک کا معروض Objects دیکھتے ہیں اور جب دور کی چیز دیکھتے ہیں تو عدسہ پتلا اور لانبا ہو جاتا ہے۔ یہ موقتی تبدیلی ان اعصاب و عضلات Muscles کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے جو آنکھ کے ڈھیلے کے اندرونی حصے سے منسلک ہوتے ہیں۔

عدسہ (لینس) کے پیچھے گاڑھا اور جیلی جیسا مائع رطوبت زجاجیہ Vitreous Humour ہوتی ہے اور یہ مائع تقریباً آنکھ کے تمام ڈھیلے میں بھرا رہتا ہے۔ یہ گاڑھا ہونے کے باوجود شفاف ہوتا ہے اور روشنی کو لینس سے آنکھ کے پردے Retina تک گزرنے دیتا ہے۔ آنکھ کا پردہ کروڑ ہا عضلاتی خلیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ اپنی شکل و صورت کی وجہ عصا اور مخروط Rod

And Cone کہلاتا ہے۔ یہی عضلاتی خلیے بصارت کا پیام دماغ تک پہنچاتے ہیں۔

بعض لوگوں کی بصارت میں خرابی کا تعلق Rod سے ہوتا ہے۔ ایسے بدنصیب افراد سرخ اور سبز Red and Green رنگوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ اسی قبیل کے لوگوں کو رنگندھے Colour Blind کہتے ہیں۔

کبھی آپ نے ٹرافک کے سگنلوں Traffic Signal پر غور کیا؟ سرخ روشنی ہمیشہ اوپر کیوں رہتی ہے؟ یہ رنگندھے لوگوں کو سمجھنے کے لیے ہے۔ چونکہ وہ سرخ اور سبز میں فرق محسوس نہیں کر سکتے اس لیے اوپر کی جلتی ہوئی روشنی کو دیکھ کر وہ سمجھ جاتے ہیں کہ رکنے کا اشارہ کیا جارہا ہے— یہ ٹرافک کی عالمی زبان ہے کیونکہ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں چلے جائیں گے تو یہی اصول پائیں گے۔

**آنکھوں کی بعض خرابیاں:** آنکھوں کی اکثر خرابیاں ایسی ہیں جن کے دور کرنے کے لیے عینکوں کا استعمال ضروری ہوجاتا ہے۔ ایک تو نزدیک کی بصارت کی کمزوری یا خرابی ہے۔ عموماً یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جب آنکھ کا ڈھیلا Eyeball بہت زیادہ لانبا ہوجاتا ہے۔ آنکھ کے ڈھیلے کے لانبا ہونے سے یہ ہوتا ہے کہ جب روشنی کی شعاعیں لینس میں داخل ہوتی ہیں تو وہ ٹھیک طریقے پر شبکیہ Ratina پر فوکس نہیں کر سکتا جیسا کہ ہونا چاہیے— یہ خرابی یا تو پیدائشی ہوتی ہے یا پھر خراب طبع کی ہوئی کتابوں یا ناکافی روشنی میں پڑھنے سے ہوتی ہے۔

جس آدمی کی نزدیک کی بصارت کمزور ہو اس میں عموماً ہوتا یہ ہے کہ Retina تک روشنی کی شعاعیں پھیل کر پہنچتی ہیں۔ عینک ان پھیلی ہوئی شعاعوں کو پھیلنے نہیں دیتی اور Retina پر ایک مرکز بناتی ہوئی پہنچتی ہیں جس سے تصویر واضح اور صاف طور پر نظر آتی ہے۔

ایسی بصری کمزوری اکثر ہمیشہ قائم رہنے والی ہوتی ہے لیکن ایسے بچے جن کی آنکھیں کمزور ہوں صحیح نمبر کی عینک استعمال کر کے اس کمزوری سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں اور ایک عام خرابی دور کی نظر Farsightedness کی خرابی ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ جب روشنی کی شعاعیں Focus کے پیچھے Retina کرتی ہیں تو آنکھ کا ڈھیلا بہت زیادہ چھوٹا ہوجاتا ہے۔ اس کا علاج بھی ایسی عینک لگانا ہے جو روشنی کی شعاعوں کو ایک دوسرے کے قریب کر کے Retina پر صحیح اور ٹھیک ٹھیک Focus کر سکے زیادہ عمر کے لوگوں میں یہ خرابی بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔

جب Cornea یا آنکھ کے ڈھیلے کی اگلی تہہ ناہموار، غیر مسطح اور مڑی ہوئی ہوتی ہے تو ایسے لوگ نظر کی لامرکزیت (Astigmatism) میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ غیر ہموار مڑا ہوا پن روشنی کی شعاعوں کو Retina تک ایک نقطے پر پہنچانے سے رکتا ہے۔ اس لیے معروض Object دھندلا نظر آتا ہے۔ ٹھیک عدسے اس لامرکزیت Astigmatism کو ٹھیک کرتے ہیں۔

چنانچہ ایسے لوگ اچھی طرح سے دیکھنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ ہم کو اپنے اطراف چوتھی خامی جو نظر آتی ہے وہ ترچھا پن Crosseyeness ہے۔ ایسے اشخاص کی آنکھوں کے اندرونی عضلات جو آنکھ کی حرکت کو قابو میں رکھتے ہیں اپنا کام مناسب طریقے پر نہیں کر سکتے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی دونوں آنکھیں ایک ہی وقت میں ایک معروض Object پر فوکس کرتی ہیں۔ چنانچہ ایسے خامی والے لوگوں کی آنکھیں اندر کی طرف مڑ جاتی ہیں یا باہر کی جانب—

مناسب عدسے Lenses اور مناسب ورزش جو ڈاکٹر بتائے ترچھے پن کو دور کر سکتے ہیں اور بعض حالتوں میں خاص قسم کا آپریشن بھی ترچھے پن کو دور کر دیتا ہے۔ خصوصاً چھوٹے بچوں میں۔

## ہلکے رنگ اور آپ کی بصارت

مختلف رنگوں کی وجہ سے روشنی کی شعاعوں کی تعداد میں زبردست فرق آجاتا ہے۔ گہرے رنگ، میلی اور گندی دیواریں اور چھتیں روشنی کی شعاعوں کے لیے کمزور منعکس ہوتے ہیں۔ ہر اس کمرے کی چھتیں اور دیواریں سفید یا قریب قریب سفید ہونی چاہیے جہاں پڑھنے، لکھنے کا کام کیا جاتا ہے۔ یہ بظاہر معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن بصارت کے لیے بہت ضروری اور اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

ہلکے رنگ جیسے سفید، ہلکے زرد Cream، گلابی Pnk، روشنی کی شعاعوں کے لیے اچھے منعکس ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ہلکے سبز اور ہلکے نیلے ہوتے ہیں۔ گہرا بھورا Dark Brown رنگ روشنی کی شعاعوں کا دسواں حصہ منعکس کرتے ہیں۔ اس لیے اچھی بصارت کے لیے ہلکے رنگ بے حد ضروری ہیں۔

زرد yellow اور نیلا Blue رنگندھا ایسا ہے جو صرف سرخ Red Shades اور سبز رنگ ہی دیکھ سکتا ہے۔ لیکن رنگندھوں کی اکثریت سرخ اور سبز دیکھنے سے محروم ہوتی ہے۔ ایسے رنگندھے لوگ ان دونوں رنگوں میں تمیز نہیں کر سکتے اور یہ دونوں ہی رنگ انھیں بھورے معلوم ہوتے ہیں۔ سو میں اگر آٹھ مرد رنگندھے پائے جائیں تو ان میں صرف آدھا فیصد عورتیں ہوتی ہیں۔

ہم اپنے اطراف کی چیزوں سے اپنی حسیات Sense سے اتنی معلومات حاصل نہیں کر سکتے جتنا کہ دیکھنے سے۔

کسی بھی چیز کو دیکھنے کے لیے ہمیشہ کسی بھی طرح کی روشنی کا ہونا ضروری ہے۔ جب تک کہ معروض Object سے روشنی کی شعاعیں ٹکرا کر ہماری آنکھوں تک نہ پہنچیں ہم اسے دیکھنے سے قاصر ہیں۔

آپ تو جانتے ہیں کہ روشنی کی شعاعیں ہوا کے واسطہ میں سے خط مستقیم میں چلتی ہیں اور جب کسی کثیف واسطہ سے گزرتی ہیں تو وہ اپنا رخ تھوڑا سا موڑ لیتی ہیں۔ یا ان کے راستے میں فرق آجاتا ہے۔ اس وقت ہماری آنکھ روشنی کی منعطف شعاعوں سے معروض Object سے وصول کر کے نقطہ ماسکہ Focus پر مرکوز کر کے Retina تک پہنچاتی ہیں۔

ہم آہنگی یعنی Accomodation نزدیک اور دور کی نظر کو ہم آہنگی بنانے کو Accommodation کہتے ہیں اور یہ اس طریقے کو کنٹرول کرتی ہے بلورین عدسہ Crystallinelens کی حرکت۔ آنکھ کا عدسہ ایک خمیدہ عدسے کے مشابہ ہوتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ آنکھ کا عدسہ، کانچ کے عدسے کی طرح یکساں اور ہموار بناوٹ نہیں رکھتا بلکہ خلیوں کی دو ہزار تہوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ چنانچہ روشنی کی شعاعیں جب ان طبقات میں سے گزرتی ہیں تو ہر طبقے میں نامعلوم طور پر منعطف ہوتی ہیں۔ ایک اور قابل لحاظ فرق کانچ کے عدسے اور ہماری آنکھ کے عدسے میں پایا جاتا ہے۔ یہ انتہائی لچکیلا ہوتا ہے اور وہ سخت۔ ہماری آنکھ کا عدسہ ایک طرح سے کیمرے کے لینس سے اس حد تک ملتا جلتا ہے کہ جب تک فوکس نہ ہو اسے آگے پیچھے کیا جاتا ہے اسی طرح ہماری آنکھ کا عدسہ بھی اپنی وضع بدلتا رہتا ہے۔ ■

**ماخذ:** ہمارے جسم کا معجزاتی نظام، **مصنف:** قیصر سرمست، **پہلا ایڈیشن:** 1999، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

# تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

## جراحیات عمومی

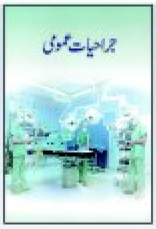


صفحات 322، قیمت 180 روپے، سنہ اشاعت 2024
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: احتشام الحق آفاقی، ہاؤس نمبر 310، کنڈا–2
نزد ہول مین اسکول، شاہ آباد گیٹ، رامپور۔ 244901

جراحت (سرجری) ایک قدیم یونانی فن ہے۔ جس میں امراض یا چوٹوں کا علاج کرنے کے لیے عالجہ یعنی آپریشن کا طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔ طب یونانی میں جراحت کو ہر دور میں اہمیت حاصل رہی اور اسی کے پیش نظر کتاب 'جراحیات عمومی' مرتب کی گئی۔ کتاب کے مضامین 'علم الجراحت کا تاریخی خاکہ' میں ڈاکٹر منہاج احمد لکھتے ہیں:

''طب یونانی میں سرجری کو ہر دور میں مستقل فن کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ طب یونانی میں جراحت مسلسل اور بتدریج ارتقائی مراحل طے کرتی رہی ہے۔ عرب اطبا نے نہ صرف اپنے ایرانی ہندوستانی اور یونانی اسلاف کے سرمائے کے ترجمہ وتدوین کا کام کیا، بلکہ میڈیکل سائنس بالخصوص سرجری میں گراں قدر اضافات بھی کیے۔ انھوں نے نہ صرف نئے جرحی طریقوں کو روشناس کرایا بلکہ آلات جراحی بھی اختراع کیے۔''

'جراحیات عمومی' چوبیس ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول: علم الجراحت کا تاریخی خاکہ، باب دوم: علاج بالتدبیر اور اس کی سائنسی بنیادیں، باب سوم: جرح، زخم، باب چہارم: عدوی: تعدیہ/ چھوت، باب پنجم: جراحی کے طریقہ کار میں تعدیہ، باب ششم: سیالات بدن و برقیروں کا توازن، باب ہفتم: نمکیات و ایسڈ–بیس توازن، باب ہشتم: جراحت کے مریض کا تغذیہ، باب نہم: صدمہ، باب دہم: حرق وسلق، عمل ترقیع وجلدی پیوندکاری، باب یازدہم: جریان الدم وانتقال الدم، باب دوازدہم: مجرئ و ناصور اور اکیس، باب سیزدہم: سلعات حمیدہ، باب چہاردہم: طرف اعلیٰ، باب پانزدہم: طرف اسفل، باب شانزدہم: عضوی پیوندکاری اور جسمانی رد عمل، باب ہفدہم: امراض شریان، باب ہجدہم: امراض عروق، باب نوزدہم: عمومی استوائی جراحی امراض، باب بیستم: عنق وفک، غدہ لعابیہ، جوف دہن، بشرہ، باب بیست یکم: صدر، باب بیست ودوم: یونانی ادویہ اور امراض جراحت، باب بیست وسوم: تشخیصی شعاعی عکاسی، باب بیست و چہارم: طریقۂ کار برائے حجرہ جراحت اور عمل تطہیر۔

'جراحیات عمومی' کے ہر باب میں جراحت کے اقسام وعلاج پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جراحیات عمومی طبی خصوصیات میں سے ایک ہے جو جراحی کے طریقوں سے انسانی جسم کی بیماریوں کے علاج سے متعلق ہے۔ اس کا مقصد صدمے، نظام انہضام کی بیماریوں، معدہ، گردن، اینڈوکرائن گلینڈز، پردی وریدوں اور چھاتی وغیرہ کے امراض میں جراحت کے ذریعے علاج کیا جانا ہے۔ جراحیات عمومی کا دائرہ صرف آپریشن تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ خصوصیت ایک جراحی کی ہے جو پیٹ کے اعضا جیسے آنتوں پر مرکوز ہے، جس میں معدہ، چھوٹی آنت، بڑی آنت، جگر، گرہنی کالسر، پتاشی، اور اکثر تائرواڈ غدود شامل ہیں۔ اسی طرح جراحی میں سر اور گردن کی سرجری کے ماہرین بھی شامل ہیں۔ جنرل سرجن جلد، چھاتی اور کنڈرا کی بیماریوں سے بھی نمٹتے ہیں۔ اسی طرح جنرل سرجری کے ماہرین، دنیا کے بہت سے مراکز میں، جان لیوا حادثات اور ہنگامی حالات میں مبتلا مریضوں کو ابتدائی طبی امداد فراہم کرتے ہیں۔ اسپیشلسٹ سرجری کو جنرل سرجری کہا جاتا ہے کیونکہ یہ جسم کے تمام حصوں کی سرجری کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور سرجری کے مخصوص شعبوں میں یہ واحد ڈسپلن ہے جس میں سرجری کے اصول سکھائے جاتے ہیں۔

مذکورہ کتاب نہ صرف فن جراحت اور علاج ومعالجے کے لیے اہم ہے بلکہ طب یونانی کے فن پر بھی خاصا مواد کتاب میں موجود ہے، جو نہ صرف طب کے طلبا کے لیے کارآمد ہے بلکہ ادب وفنون سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے بھی کتاب کا مطالعہ کام کی چیز ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے جہاں لسانیات وفنون لطیفہ سے متعلق سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں وہیں یہ کتاب 'جراحیات عمومی' اپنی پیشکش اور مواد کے اعتبار سے قومی کونسل کے عزم کو حوصلہ بخشے گی اور قارئین کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

## تحقیق و تنقید

# برادرِ شبلی مہدی حسن اور ان کے مکاتیب لندن

مصنف: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

صفحات:176، قیمت:300، سنہ اشاعت: نومبر 2023

پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد شاہنواز خان

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

برادرِ شبلی مہدی حسن اور ان کے مکاتیب لندن، مطالعۂ شبلی کی ایک تازہ کڑی ہے، جسے ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی نے نہایت ہی تحقیق و تدقیق کے ساتھ ادبی منظرنامے پر پیش کیا ہے۔ شبلی کے باب میں آپ کی شخصیت ایک حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب شبلی کے برادرِ خرد مہدی حسن کے احوال و آثار اور ان کے مکاتیب لندن پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر منقسم ہے۔ پہلا حصہ 'مہدی حسن بیرسٹر احوال و آثار'۔ دوسرا حصہ 'مکاتیب مہدی حسن (نادر اور غیر مطبوعہ)'۔ تیسرا حصہ ''تعلیقات وحواشی' پر مشتمل ہے۔

کتاب کی ابتدا میں 'حرف آغاز' کے عنوان کے تحت تقریباً نو صفحات پر مشتمل ایک دیباچہ ہے، جس میں مصنف نے مہدی حسن کے خطوط کی اہمیت و افادیت اور اس کی کمیت و کیفیت پر پُرمغز گفتگو کی ہے، نیز ان قلم کاروں کی بھی نشاندہی کی ہے، جنھوں نے اس سے قبل مہدی حسن کے خطوط پر خامہ فرسائی کی ہے۔ جیسے ڈاکٹر ابن فرید، ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی اور شیخ محمد اکرام۔ ڈاکٹر ابن فرید پہلے شخص ہیں جنھوں نے مہدی حسن کے مکاتیب لندن کو 'محمد مہدی کے مکاتیب لندن' کے نام سے جون 1963 ماہنامہ 'آجکل' دہلی سے شائع کیا تھا۔ پھر اسی مضمون کو جولائی اور اگست 1963 میں ماہنامہ 'ادیب' علی گڑھ میں شائع کرایا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی نے بھی مہدی حسن کے مکاتیب پر ایک مفصل مقالہ لکھا۔ کچھ سالوں بعد مکاتیب مہدی کا غیر مطبوعہ مجموعہ جلی ہوئی صورت میں ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی کو ملا، انھوں نے یہ مجموعہ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی کے سپرد کیا اور انھوں نے بڑی دقت نظر اور مسلسل محنت شاقہ کے بعد ان اوراق پریشاں کو ترتیب دینے میں کامیابی حاصل کی۔

کتاب کے پہلے حصے میں مہدی حسن کے احوال و آثار پر تقریباً 38 صفحے لکھے گئے ہیں۔ جن میں پیدائش، تعلیم و تربیت، حفظ قرآن، انگریزی تعلیم علی گڑھ اور لندن کے تعلیمی مراحل، علی گڑھ اور تحریک سرسید سے وابستگی، سیاسی اور سماجی نظریات، ملازمت، شادی، بیوی، بچے اور علالت و وفات کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ علامہ شبلی اور مہدی حسن کے آپسی تعلقات پر دلائل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ علامہ شبلی کے وہ خطوط بھی درج ہیں، جن سے دونوں کے مابین خوشگوار تعلق کا احساس ہوتا ہے۔ مہدی حسن کی مکتوب نگاری کی خصوصیات اور مضامین کو واضح کیا گیا ہے۔ مہدی حسن کی مکتوب نگاری کی خصوصیات کے حوالے سے ڈاکٹر ابن فرید کے بیانات درج ہیں۔ لندن کی خوبیوں اور خامیوں کے حوالے سے مہدی حسن کے نظریات پر بحث کی گئی ہے۔

دوسرے حصے میں مہدی حسن کے نادر اور غیر مطبوعہ مکاتیب ہیں، جو انھوں نے قیام لندن کے دوران لکھے تھے۔ یہ مکاتیب تاریخی اعتبار سے درج ہیں۔ کل مکاتیب کی تعداد 60 ہے، جن میں سے 55 والد شیخ حبیب اللہ کے نام، تین برادر مکرم علامہ شبلی کے نام اور دو چچا شیخ مجیب اللہ کے نام ہیں۔ مذکورہ مکاتیب میں سے چند مکاتیب ناقص اور نامکمل بھی ہیں، جس کا اعتراف صاحب کتاب نے 'حرف آغاز' میں کیا ہے۔ مہدی حسن کے یہ خطوط یقیناً اردو ادب میں بیش بہا اور قیمتی اضافہ ہیں۔ ان خطوط میں دونوں ملکوں کی تہذیب و ثقافت کے موازنے بھی جا بجا ملتے ہیں۔ کہیں یورپین تہذیب کی تعریف و توصیف نظر آتی ہے، تو کہیں ہندوستانی رسم و رواج کو بہتر قرار دیا گیا ہے۔ خطوط کے مطالعے سے مہدی حسن کی انشاپردازی، بذلہ سنجی، ظرافت اور حاضر جوابی بھی نمایاں ہوتی ہے۔ مہدی حسن کے خطوط کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ مہدی حسن کو خطوط لکھنے کا شوق تھا اور بڑے ہی اہتمام سے اپنے خاندان کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی خطوط لکھا کرتے تھے، جو شاید منظر عام پر آنے سے پہلے ہی ضائع ہو گئے۔ اگر وہ خطوط بھی منظر عام پر آ جاتے تو بہت سی نامعلوم پرتیں بھی وا ہو جاتیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ 'تعلیقات و حواشی' ہے۔ کتاب کا یہ حصہ خاصا اہم ہے۔ کتاب میں موجود اشخاص، مقامات اور کتابیں وغیرہ کی تفصیل درج کی گئی ہے۔ کتاب میں موجود اشخاص اکثر و بیشتر وہ انگریز ہیں، جن سے قیام لندن کے دوران مہدی حسن کے تعلقات تھے، جن میں سے اکثر و بیشتر اردو ادب کے قارئین کے لیے غیر معروف ہیں، جن کی تفاصیل فراہم کرنا کچھ آسان کام نہیں، لیکن الیاس اعظمی نے ان تمام کے حالات و کوائف اردو دنیا کے سامنے پیش کیے، جن سے مصنف کی محنت شاقہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کس قدر محنت اور تحقیق و تدقیق سے یہ کام بحسن خوبی انجام دیا ہے۔

خاندانِ شبلی اور خود مہدی حسن کے احوال و آثار پر مشتمل یہ ایک گراں مایہ کتاب ہے۔ مکتوب نگاری کے باب میں بھی یہ کتاب بیش قیمتی اضافہ ہے۔ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں، اگر وہ ان مکاتیب کو مرتب نہ کرتے تو یہ مکاتیب دنیائے اردو ادب سے اوجھل ہو جاتے اور اردو دنیا مکاتیب مہدی کی ادبی اہمیت و افادیت اور ان کی ادبی چاشنی سے محروم رہ جاتی، نیز خاندان شبلی کے ایک اہم فرد کے احوال و آثار سے بھی ناآشنا رہتی۔

# صحرا میں گلزار (راجستھان کا ادب)

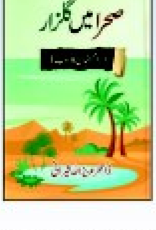


مصنف/ ناشر: ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی

فرحت منزل، نزد دیوان جی کا کنواں

کالی پلٹن، ٹونک۔ 304001 (راجستھان)

صفحات: 352، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2024

مبصر: ابراہیم افسر

وارڈ نمبر 1، مہپا چوراہا، نگر پنچایت سوال خاص، میرٹھ 250501

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے زیر تبصرہ کتاب 'صحرا میں گلزار' میں راجستھان سے تعلق رکھنے والے ادبا و شعرا کے علمی و ادبی کارناموں کے علاوہ راجستھان کے مختلف شہروں میں منعقدہ ادبی سمیناروں کی روداد کو پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں موصوف

نے راجستھان کی سرزمین میں اُردو کی آبیاری کرنے والے کم معروف ادبا کی خدمات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ کتاب کے آخر میں 'یادِ رفتگاں' کے تحت کورونا وبا میں اس دنیا سے رخصت ہونے والے راجستھانی ادبا و شعرا کا تذکرہ شامل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے 'صحرا میں گلزار' میں 16 مضامین کو شامل کیا ہے۔ ان مضامین میں موصوف نے ادبی تنوع کا خاص خیال رکھا ہے۔ مضامین کی قرأت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تحقیق، تنقید، شاعری، ترجمہ نگاری، تذکرہ نگاری، سمپوزیم، سمیناروں، شہروں کی سماجی، تہذیبی و تاریخی اہمیت اور کثیر الانواع بیماریوں میں مبتلا شعرا و ادبا کی وفات کو موضوع بنایا ہے۔ کتاب کا سب سے طویل مضمون 'حافظ محمود شیرانی کے خطوط کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ' ہے۔ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے اس مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں حافظ محمود خاں شیرانی کی سوانح و شخصیت، تعلیم و تربیت، ملازمت کے علاوہ ان کی ادبی و لسانی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں حافظ محمود خاں شیرانی کے خطوط، جن میں ادبی و نجی باتیں شامل ہیں، کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ عزیز اللہ شیرانی نے اس مضمون میں اس بات کی وضاحت کی کہ محمود خاں شیرانی کا تعلق ٹونک سے ہونے کے سبب ان پر ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان کے علمی و ادبی کارناموں سے طالب علموں کو روشناس کرائیں۔ بلا شبہ اُردو ادب میں حافظ محمود خاں شیرانی کو تحقیق کا سالارِ کارواں تسلیم کیا گیا ہے۔ 'پنجاب میں اُردو' اور 'تنقید شعر العجم' ان کی شاہکار کتابیں ہیں۔

مضمون 'پتھروں کے شہر میں آئینوں کا شاعر طرب میرٹھی' میں انھوں نے حسین احمد طرب میرٹھی کی شعری، صحافتی اور متفرق ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ طرب میرٹھی نے دیوبند میں اپنے پھوپھی زاد بھائی عامر عثمانی کے مجلّہ 'تجلی' میں کام کیا تھا۔ یہیں سے ان کے اندر شعری ذوق اور شعور میں بالیدگی پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے جودھپور کا رُخ کیا اور اسے اپنا مسکن بنایا۔

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے سیفی سرونجی کی ادبی خدمات کا احاطہ مضمون 'سابق ریاست ٹونک کا منفرد ادیب و شاعر اور صحافی سیفی سرونجی' میں کیا ہے۔ سیفی سرونجی کو ریاست ٹونک سے اس وجہ سے منسوب کیا جاتا ہے کہ سرونج 1817 سے 1947 تک ریاست ٹونک کا حصہ تھا۔ آزادی کے بعد سرونج کو مدھیہ پردیش کے ضلع وِدیشہ میں شامل کیا گیا۔ سیفی سرونجی کی شخصیت ہشت پہلو ہے۔ دورِ حاضر میں ان کی شناخت رسالہ 'عالمی انتساب' کے مدیرِ اعلیٰ کی ہے۔

'ترجمہ کا فن اور راجستھان میں تصنیفات سعدی کے اُردو تراجم' میں ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے ترجمے کی روایت، فورٹ ولیم کالج، دہلی ورنا کولر ٹرانسلیشن سوسائٹی، دارالترجمہ کشمیر، دارالترجمہ عثمانیہ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی وغیرہ میں کیے گئے اُردو تراجم پر تفصیلی و تنقیدی بحث کرنے کے بعد تصنیفاتِ سعدی کے اُردو تراجم پر گفتگو کی ہے۔ انھوں نے سعدی کی تصنیفات 'گلستانِ سعدی' (اُردو ترجمہ چمنستان)، 'بوستان' (اُردو ترجمہ دلآرام راضی، گلدستۂ خرد، کریمائے سعدی) پر تنقیدی و تحقیقی گفتگو کی ہے:

''ٹونک میں ادب و سخن کے آفتاب و ماہتاب، مرتب امداد علی خاں شمیم ٹونکی'' مضمون میں ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے اس تذکرے کی اہمیت و افادیت پر اپنا مطمح نظر واضح کیا ہے۔ اس کتاب میں شمیم ٹونکی نے 'انیسویں صدی کے ادبا و شعرا'، بیسویں صدی کے ادبا و شعرا' اور 'دورِ حاضر کے ادبا و شعرا' میں تقسیم کیا ہے۔ شمیم ٹونکی نے اپنی کتاب میں شعرا کے حالاتِ زندگی، معاملات اور فنی خدمات کے ساتھ نمونۂ کلام اور نثری کارناموں کو مستند حوالوں کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی اس کتاب کی اہمیت و افادیت کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شمیم صاحب کی اس کتاب کو بنیاد بنا کر ناقدین و محققین ادب اور ریسرچ اسکالرس ضرور استفادہ کریں گے۔ (ص 133)

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے پریم شنکر سریواستو کے ہندی رسم الخط میں لکھے تذکرہ 'راجستھان کے موجودہ اُردو شاعر' کو اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس کی روداد کو انھوں نے 'صحرا میں گلزار' میں بیان کیا ہے۔ شنکر سری واستو کی دلی خواہش تھی کہ اس تذکرے کا ترجمہ اُردو میں ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کے مطابق اس تذکرے میں جے پور کے 25، ٹونک کے 17، دھولپور کے 4، بھرتپور کے 2، سیکر کے 2، اجمیر کے 18، بیکانیر کے 9، چورو کے 1، کوٹہ کے 16، جھالاواڑ کے 6، بونڈی کے 3، باراں کے 4، چھپا بڑود کا 1، مانگرول کا 1، ادے پور کے 8، بھیل واڑہ کے 2 جھنجھنو کے 10 شعرا کے کوائف اور نمونۂ کلام کو شامل کیا گیا ہے (ص 158)۔

بہر کیف! ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے راجستھان کے ادبی صحرا میں انواع و اقسام کے گلزار قارئین کے سامنے پیش کیے ہیں۔ موصوف نے راجستھان کے ادبی و شعری حوالے سے جو کام کیا ہے وہ لائق تحسین و تقلید ہے۔ راجستھان کے علاقائی ادب کو سمجھنے میں ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ زیر تبصرہ کتاب پر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے تقدیم، پروفیسر قطب سرشار نے حرفے چند، اور پیش گفتار قاضی انیس الدین صدیقی نے تحریر کیا ہے۔ کتاب معنی و صوری اعتبار سے مفید و لائق مطالعہ ہے۔

## خاکے / انشائیے

### مزید شگفتگی

مصنف: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 205، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2024
ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی
ایم 109 گلمرگ اپارٹمنٹ، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

پروفیسر ابن کنول کی تصنیف 'مزید شگفتگی' ان کے خاکے، انشائیے اور رپورتاژ کا مجموعہ ہے، جن کی تعداد 24 ہے، ان کی یہ تحریریں انھیں افراد یا عنوانات سے متعلق ہیں جن سے وہ مکمل طور پر آشنا رہے ہیں، شخصیات پر ان کی تحریریں جن لوگوں کے متعلق ہیں ان سے وہ بہت قریب رہے، بے تکلفی رہی، شب و روز کا سابقہ رہا ہے، معاملات و مسائل میں ایک دوسرے کے شامل رہے، خامہ بہ ہدف شخصیات کے نظام الاوقات، ان کے عادات و اطوار سے کما حقہ واقف رہے، تاہم کسی خاکے میں فرد سے متعلق ایسا اسلوب یا ایسی لفظیات کا استعمال نہیں کیا جس سے مبنی بر خاکہ شخصیت کو ایذا پہنچے۔

پروفیسر ابن کنول مرحوم اردو ادب کی تمام اصناف سے بخوبی واقف تھے، فکشن

پر مکمل گرفت تھی، داستانی انداز و لفظیات کے برتنے کا ہنر انھیں خوب آتا تھا، اپنی تصنیف 'مزید شگفتگی' میں انھوں نے وہی داستانی اسلوب اختیار کیا ہے اور قدرے لفظیات بھی کام میں لائے ہیں۔

جن جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے ان کے مزاج و منہاج کے موافق عناوین طے کیے ہیں، اول خاکہ پروفیسر شریف حسین قاسمی پر تحریر کیا گیا ہے، یہ قدرے طویل ہے اور گیارہ صفحات پر مشتمل تحریر ہے، جس کا عنوان ان کی خوش مذاقی کو مدنظر رکھتے ہوئے 'خوش مذاق: پروفیسر شریف حسین قاسمی' رکھا ہے، ان کے انتخاب عنوان میں خود پروفیسر ابن کنول کی وضع داری کا علم ہوتا ہے کہ انسان کتنا رکھ رکھاؤ اور عزت نفس کا خیال کرنے والا تھا، صدیق الرحمٰن قدوائی پر تحریر کردہ خاکہ بھی ان کے انداز گفتگو کو محیط ہے، مذکورہ شخصیات کو محفلوں میں سمیناروں میں ان کے معروف و متداول طرز تکلم کی مناسبت سے عنوان کا انتخاب کیا ہے، سید محمد اشرف چونکہ فکشن نگار ہیں اس لیے ابن کنول صاحب نے ان کے اس فن فکشن نگاری کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے 'قصہ گو سید محمد اشرف' سے مخاطب کیا ہے، سید محمد اشرف صاحب پر ابن کنول صاحب کا خاکہ محض پانچ صفحات پر مشتمل ہے اس میں انھوں نے ان کی بیشتر افسانوی تحریروں پر گفتگو کی ہے اور انھیں شہرت و ناموری میں اقبال، فیض اور قرۃ العین حیدر کی صف میں کھڑا کر دیا ہے، جاوید دانش ایک ایسے سدابہار فنکار ہیں جن کی فنکاری انھیں ملکوں ملکوں لیے پھرتی ہے، وہ ایک اچھے شاعر، ڈرامہ نویس اور اداکار ہیں، ان کا تعلق اسٹیج شو سے بھی ہے، ان کے مزاج کے مطابق ابن کنول صاحب نے سرخی 'آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی' لگائی ہے، ایک اچھے قلم کار کی یہی خوبی ہے کہ وہ عنوان میں شخصیت کا عکس ابھار دیتا ہے، ابن کنول صاحب نے شخصیات پر قلم اٹھاتے ہوئے شخصیت اور عنوان کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔

پروفیسر ابن کنول اردو ادب کے استاد تھے اس لیے جب ولی اختر ندوی پر خاکہ لکھنا چاہا تو اردو کے کئی ولیوں کی زندگی کی سیر کرادی، ولی دکنی، ولی محمد نظیر اکبرآبادی سے ہوتے ولی اختر تک پہنچے اور ولی اختر ندوی کو ولی صفت کا خطاب دیا، 'مزید شگفتگی' میں ایک خاکہ سید شاہد مہدی سابق شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ پر ہے، اس خاکے کے ضمن میں انھوں نے غازی پور کی تاریخی شخصیات کا ذکر بھی کیا ہے، 1956 کی علی گڑھ میگزین کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کیٹس پر سید شاہد مہدی کے حوالے سے بات کی کہ وہ ادیب و شاعر نہیں تھے تاہم انھوں نے کیٹس جیسی شخصیت پر اس وقت مضمون لکھ کر اپنی موجودگی اور صلاحیت کا اعتراف کرایا ہے، پروفیسر اختر الواسع پر ان کا خاکہ واسع صاحب کے تحرک و فعالیت کی تصویر کشی کرتا ہے، پروفیسر ابن کنول کی خاکہ نگاری کی ایک خصوصیت ہے کہ جب وہ کسی شخصیت پر خاکہ لکھتے ہیں تو اس عہد کی ادبی فضا کے ساتھ کئی اہم شخصیات کو بھی اپنی تحریر کا حصہ بناتے ہیں، مجتبیٰ حسین پر لکھتے وقت بھی انھوں نے اس طرز کو برتا ہے اور مجتبیٰ حسین کے مزاج کے مطابق عنوان کا انتخاب 'خاک پوش خاکہ نگار مجتبیٰ حسین' لکھا ہے۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ کے مصداق پروفیسر ابن کنول نے 'مزید شگفتگی' میں جس قدر لفظی تصویریں اور خاکے کھینچے ہیں اس میں مزید رنگ بھر نے کے لیے پروفیسر شمیم نکہت کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کے حوالے سے دلی لکھنؤ اور شارب ردولوی کے خاندان کو اجاگر کیا ہے، شمیم نکہت صاحبہ کے بعد فوراً شارب ردولوی صاحب کا خاکہ پیش کیا ہے اور عنوان کا انتخاب 'انتہائی شریف ترقی پسند شارب ردولوی' کیا ہے، شارب صاحب پر لکھا خاکہ قدرے طویل ہے، بعد ازاں دلی یونیورسٹی کے سبکدوش پروفیسر عبدالحق صاحب پر ان کا خاکہ بے حد عمدہ ہے، ان کی ذہنی مناسبت کے سبب خاکہ نگار نے عنوان دیا ہے 'ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق' اس میں ابن کنول صاحب نے پروفیسر عبدالحق کی علمی و ادبی زندگی کے ساتھ ان کے گاؤں اور دیہات کا نقشہ بھی کھینچا ہے، مکتبہ جامعہ سے منسلک شاہد علی خان صاحب کے لیے خاکے کا عنوان 'ہر دیے کی مٹی میں روشنی تمھاری ہے' لگایا ہے۔ ابن کنول صاحب نے جن جن پر خاکہ نگاری کی ہے ان سے نہایت محبت و عقیدت اور لگاؤ کا ثبوت دیا ہے، ان کے خاکوں کے عناوین سے اپنائیت جھلکتی ہے، جیسے عتیق اللہ صاحب کی زندگی کو جب آئینہ کرتے ہیں تو عنوان لگاتے ہیں 'اردو کا خوش پوش ناقد: ڈاکٹر عتیق اللہ' ڈاکٹر پرویز شہریار کا خاکہ کھینچتے ہیں تو 'پرویز سے شہریار تک' لکھتے ہیں، ڈاکٹر خلیق انجم کے لیے 'ڈاکٹر خلیق انجم روہیلہ' اور پروفیسر خالد محمود صاحب کو 'خاقانی جامعہ پروفیسر خالد محمود' سے مخاطب کرتے ہیں۔

مذکورہ شخصیات کے علاوہ پروفیسر ابن کنول نے 'عالمی یوم اردو، اعزازیہ جمع زادراہ، ایوارڈ، رسم اجرا، آدم گھر' کے عناوین سے انشائیہ اور رپورتاژ 'سفر حیدرآباد اور غالب کا سفر کلکتہ: غالب کی زبانی' تحریر کیے ہیں، موقع بہ موقع منعقد ہونے والے ان پروگراموں پر موصوف کی تحریریں نہایت جاذب دل ہیں، ان میں ہونے والے واقعات و سانحات کی منظر نگاری کی ہے، اور ان پروگراموں سے منسلک شخصیات و افراد کی نفسیاتی تصویر کشی کی ہے۔

## تذکرہ

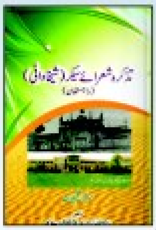

### تذکرہ شعرائے سیکر (شیخاواٹی)

مرتب: نذیر فتح پوری

صفحات: 144، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: راجپوتانہ اردو ریسرچ اکادمی، جے پوری

مبصر: عمران عاکف خان، 3، باغ، ڈیگ روڈ گل پارہ، ڈیگ۔ راجستھان

کلیم راجستھان، حضرت سالک عزیزی جھن جھنوی نے فرمایا تھا

جن کی تابانی مہ و انجم سے لیتی ہے خراج
اب بھی وہ ذرے غبار خاک راجستھاں میں ہیں

یہ شعر راجستھان کی ادبی و شعری روایت و تاریخ کا ترجمان اور آئینہ نما ہے۔ یقیناً یہی وہ فردوسِ ادب ہے جہاں دہلی، آگرہ، لکھنؤ اور دیگر اردو شاعری کے دبستانوں سے وابستہ شعرا و ادبا پناہ گزیں ہوئے اور سرکاری، عدالتی، محکمہ جاتی، انتظامی، عسکری، تدریسی مناصب پر فائز ہوئے، نیز عوامی سطح پر بھی فروغ اردو کی خدمات انجام دیتے رہے۔ چنانچہ یہاں وارد ہونے والے اردو داں افراد و اشخاص خصوصی ترجیحات و مراعات کے بطور درجہ بندی اور ترقیاں حاصل کرتے گئے۔ خطۂ راجپوتانہ کی ریاستوں کے حکمراں، راجے، مہاراجے، راجپوت اور ضلعوں کے گورنرس اردو داں نہ ہونے کے باوجود، اردو زبان، اردو داں افراد، شعرا و ادبا اور ماہرین ادب کو اپنے سرکاری و پولیٹکل محکمہ جات میں خصوصی عہدوں پر فائز کرتے تھے۔ ریاست ہائے راجپوتانہ میں اردو کی اس قدر پذیرائی و حوصلہ افزائی کے سبب یہاں نہ صرف زبان و ادب نے اپنے نقوش مرتسم کیے، مع ادب و فن، ثقافت و تہذیب، تمدن و شائستگی، روایت و تاریخ اور خوش کلامی و خوش سلیقگی اور آداب زندگی سے آگہی کی فضا بھی استوار ہوتی چلی گئی۔

وضع اصطلاحات بھی ہوئی اور فارسی و عربی کی اہم ترین کتب کے تراجم بھی کیے گئے۔

ماضی کی ان ہی ریاستوں میں ایک مردم خیز ضلع سیکر بھی ہے جس کے صدر مقام شہر سیکر میں شعری و ادبی تاریخ کے نقوش تقریباً ڈیڑھ سو دو سو برسوں سے موجود ہیں۔ یہاں بھی اردو زبان و ادب کی باد بہاری چلی اور خوش بو زار چمن لہلہائے۔ سرکاری فرامین اور انتظامی احکامات اردو میں ارسال و نافذ کیے گئے؛ کالج، اسکولس، انجمنوں، خانقاہوں اور مدارس کے ذریعے اردو زبان و ادب کا فروغ ہوا۔ مگر پھر یہ ہوا کہ شہر سیکر کی ادبی تاریخ ماضی کے دھندلکوں میں جا چھپی۔ پھر ارادۂ ایزدی ہوا کہ اسے مکمل روشنی اور تابانی میں لایا جائے، نیز اردو دنیا بھی اس کی عظمت پارینہ سے واقف ہو اس کے لیے نذیر فتح پوری کا انتخاب عمل میں آیا اور یہ انتخاب 'احسن انتخاب' ثابت ہوا۔ چنانچہ نذیر فتح پوری نے اس کے لیے کمر کسی جس کا مظہر ان کی کاوش جلیل ''تذکرہ شعرائے سیکر (شیخاواٹی)' کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ جس کے ورق ورق سے جاں فشانی، محنت و کوشش اور جد و جہد عیاں ہے۔ مصنف گرامی نے اُن اوراق پر شہر سیکر کے شعرا، نگینوں، ماہ و انجم، مریخ و زہرہ کی مانند جڑ دیے ہیں۔ یوں کتاب اردو دنیا کے لیے ایک بیش بہا سوغات کی حیثیت رکھتی ہے اور ایک ایسا تحفہ جو لازوال اور سدابہار ہے۔ ان شعرا میں سید وارث علی وارث، عبداللہ آزاد سیکری، رمضان صبا سیکری، نثار احمد کامل فاروقی، پروفیسر محمد بخش ذہین، سید شبیر علی اثر، ممتاز احمد تاج سیکری، فاروق انجینئر، ڈاکٹر اظہار مسرت، پروفیسر ارشد سراج نیازی، مولانا سرفراز بزمی فلاحی آرزو راجستھانی، محمد اسلم غازی، اوم پرکاش دِل سیکری، عابدہ بیگم حیا اور تابش مہتابی سیکری وغیرہ۔

'تذکرہ شعرائے سیکر (شیخاواٹی)' ایسا تذکرہ ہے؛ جسے بالخصوص سیکر شہر / ضلع کے شعری و ادبی ادب کی بازیافت کہنا مناسب ہوگا۔ ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ نذیر فتح پوری کا یہ وہ کارنامہ ہے جو صدیوں بلکہ قرنوں قرنوں یاد رکھا جائے گا۔ نہ صرف یاد رکھا جائے گا بلکہ جب جب راجستھان کے شعر و ادب اور دبستانِ جے پور کا تذکرہ تحریر کیا جائے گا، یہ کتاب حوالہ اور بنیاد بنے گی۔ قصہ یہ ہے کہ نذیر فتح پوری کا تحریر کردہ و ترتیب دادہ تذکرہ شعرائے سیکر (شیخاواٹی) ایسا کارنامہ ہے جسے بجا طور پر 'کارِ مسیحائی' سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ ابن مریم مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے اور یہ ادب کو زندہ کرنے کا عمل ہے۔ اس تذکرے کے متعلق اپنی مقدماتی تحریر میں ڈاکٹر شاہد احمد جمالی اس کا تعارف کراتے ہوئے اس طرح لکھتے ہیں:

''پیش نظر تذکرے میں سیکر کے شعرا کے احوال و آثار اور نمونہ ہائے کلام درج کیے گئے ہیں۔ میری دانست میں سیکر کے اردو شعرا پر کوئی باقاعدہ تذکرہ اس سے قبل منظر عام پر نہیں آیا۔ اس وجہ سے اس تذکرے کی قدر و اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ شعر و ادب کی تاریخ مرتب کرنے میں تذکرہ نگاری کا ہمیشہ اہم کردار رہا ہے۔ زیر نظر تذکرہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جن شعرا کو اس تذکرے میں شامل کیا گیا ہے، انھوں نے سیکر میں اردو شاعری کی روایات کو زندہ رکھا ہے۔ (ان میں سے) کئی شعرا صاحب تصنیف بھی ہیں۔ یہی ان شعرا کا بڑا کارنامہ ہے۔ تذکرہ شعرائے سیکر میں نذیر فتح پوری نے ایک باب 'مہمان شعرا' کا شامل کیا ہے۔ یہ وہ شعرا ہیں جو ملازمت (دعوتی و اصلاحی، تلاش معاش و وغیرہ) کے سلسلے میں سیکر آ کر آباد ہوئے۔ (وہ) یہاں کی شعری اور ادبی محفلوں کا حصہ بنے اور اردو ادب کے شائقین کو اپنے رشحاتِ قلم سے محظوظ و متاثر کیا۔ اس طرح یہ تذکرہ نوادرات میں شمار کیا جانا چاہیے۔''

## ترتیب

## مرادسعیدی: شخص اور شاعر

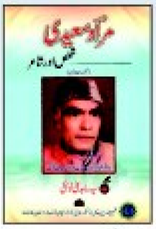

مرتب: سید ساجد علی ٹونکی

صفحات: 256، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: مراد اکیڈمی، ٹونک۔ 304001 (راجستھان)

مبصر: ڈاکٹر حسن آرا

سابق ہیڈ آف شعبہ اردو پی جی کالج، کوٹہ۔ 306901

'مرادسعیدی شخص اور شاعر' سید ساجد علی صاحب کی مرتب کی گئی تازہ ترین کتاب ہے۔ ساجد علی صاحب نے سولہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔

زیر نظر کتاب 'عرضِ مرتب' میں ساجد علی صاحب نے مرادسعیدی کی ذات و صفات اور فن پر لکھے گئے مضامین اور قلمکاروں کا تعارف بڑے سلیقے سے تحریر کیا ہے۔

پیش لفظ پروفیسر اسلم جمشید پوری صاحب نے لکھا ہے۔ جو وضاحتی بھی ہے۔ اور تفصیلی بھی۔ آپ نے مرادسعیدی کے کارناموں کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔

'سخنے چند' میں مختار ٹونکی صاحب نے مرادسعیدی صاحب کی شخصیت اور شاعری پر بہا نگ قلم اظہار کیا ہے۔

کتاب کا پہلا مضمون 'مرادسعیدی غیرتِ گلزار کے آئینہ میں' ہے۔ اس مضمون میں خالد محمود صاحب نے ٹونک اور سرونج کی ادبی مذہبی اور ثقافتی روایتوں کو قلمبند کرتے ہوئے صنفِ سخن چار بیت پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے۔ 'مرادسعیدی اور ان کی شاعری' میں پروفیسر شہپر رسول نے مرادسعیدی صاحب کے شعری کمالات تجزیاتی انداز میں پیش کیے ہیں۔ 'مطلع ادب کا روشن ستارہ' میں ڈاکٹر مہتاب عالم نے مرادسعیدی صاحب کی غزل گوئی، نظم نگاری، قطعات نگاری، رباعیات، حمد و نعت اور چہار بیت کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ 'ٹونک کی اردو شاعری کا نباض' میں خلیق الزماں نصرت نے ٹونک کے معروف علما اور شعرا کا ذکر کیا ہے۔ اور مرادسعیدی کے شعری مجموعوں پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ 'نابغۂ روزگار شاعر مرادسعیدی مرحوم' کے عنوان سے پروفیسر محمد مسعود احمد نے تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ مرادسعیدی صاحب کے اوصاف اور شعری کمالات پر دقیقہ ریزی سے لکھا ہوا مضمون ہے۔ ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری نے 'ٹونک میں اردو شاعری اور مرادسعیدی' میں ٹونک کی جغرافیائی، علمی ادبی، سیاسی، سماجی اہمیت کو تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس مضمون میں آپ نے مرادسعیدی کی شخصیت اور شعری کائنات کی انفرادیت بھی واضح کی ہے۔ ڈاکٹر ماجد دیوبندی صاحب کا تحریر کردہ مضمون 'مرادِ نعت کا سرچشمہ: مرادسعیدی' بہت اہم مضمون ہے۔ اس میں نعت گوئی کے معنی اور تاریخ کے ساتھ مرادسعیدی کی نعتیہ شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ 'مرادسعیدی کی غزلیہ شاعری کے تخلیقی عناصر' ڈاکٹر ارشد جمال صارم صاحب کا لکھا ہوا ایک بہترین مضمون ہے۔ اس مضمون میں مرادسعیدی صاحب کی غزلیہ شاعری کے جمالیاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان کے خیالات کو پاکیزہ اور زبان و بیان کو عود و عنبر کی معطر خوشبو بتایا ہے۔ ڈاکٹر رفعت اختر خاں نے 'مرادسعیدی کی شعری جہات' میں مرادسعیدی کی ذاتِ گرامی اور شعری کیفیات کو قلمبند کرتے ہوئے مرادسعیدی کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے۔ 'گلدستۂ مراد' کے چند منتخب اشعار' یہ مضمون

ڈاکٹر ارشد عبدالحمید صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں مرادسعیدی صاحب کے شعری مجموعے 'گلدستۂ مراد' کے چند اشعار کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

دیگر مضامین میں مرادسعیدی اور ان کے معاصرین (ڈاکٹر صادق علی)، بصیرتوں اور بصارتوں کا نظم گو شاعر مرادسعیدی (ڈاکٹر خان محمد رضوان)، مرادسعیدی دبستانِ ٹونک کے طرۂ امتیاز (شعور آشنا)، مرادسعیدی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ (محمد مستقیم رضا)، مرادسعیدی تم صندل کا پیڑ (سلیم جہانگیر)، مرادسعیدی ایک عبقری شخصیت (فیروز کمال)، مرادسعیدی کی جہات وکائنات کا جائزہ (ڈاکٹر ابراہیم افسر)، غزل کا شاعر مرادسعیدی ٹونکی (ڈاکٹر معقول احمد ندیم)، چمنستانِ داغ کا گلِ رعنا مرادسعیدی (ڈاکٹر عمران عاکف)، مرادسعیدی کی بامراد ساعتیں (مفتی خالد ایوب مصباحی)، مرادسعیدی کی شخصیت اور شاعری (صاحبزادہ شمشیر خاں شاہین)، مرادسعیدی کی نظم نگاری-ایک جائزہ (محمد باقر حسین)، مرادسعیدی کی عشقیہ شاعری (طالب حمید رامپوری)، شاعرِ فطرت مرادسعیدی (جنید اختر کاندھلوی)، دبستانِ ٹونک کا ایک نمائندہ شاعر -مرادسعیدی (ڈاکٹر سعادت رئیس)، مرادسعیدی کی چہار بیت نگاری (زاہد ٹانڈوی)، ٹونک کا نمائندہ شاعر: مرادسعیدی (صوفی افتخارالدین شاہ جیلانی) وغیرہ ہیں۔ کتاب میں شامل ہر مضمون معلوماتی، مکمل، معیاری اور وضاحتی بھی ہے۔ قلمکار اور مرتب قابلِ ستائش ہیں کیونکہ مختلف مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل دینا آسان کام نہیں ہے۔

سہیل پیامی صاحب نے 'مرادِ نیک نہاد' کے عنوان سے ایک بڑی دلکش نظم لکھ کر کتاب میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

'مرادسعیدی کے شعری مجموعوں پر تبصرے' کے عنوان سے مرادسعیدی صاحب کے شعری مجموعوں پر تبصرے تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ تبصرے بصیرت انگیز ہیں۔

والدِ محترم مرادسعیدی (کچھ یادیں کچھ باتیں) مرادسعیدی صاحب کے فرزند فہیم الدین خاں صاحب نے تحریر کیا ہے۔

زیرِنظر کتاب کے فلیپ پر پروفیسر خالد محمود صاحب، پروفیسر شہپر رسول صاحب کی آرا تحریر کی گئی ہیں۔ جس سے کتاب کی اہمیت اور افادیت واضح ہو گئی ہے۔ بیک کور پر معروف شاعر مخمور سعیدی کے تاثرات مع تصویر شائع ہوئے ہیں۔ اس صفحے پر کتاب کے مرتب سید ساجد علی صاحب کی بھی تصویر ہے۔

## طنز و مزاح

### خندۂ زیرِ لب

مصنف/ ناشر: فیاض احمد فیضی

صفحات: 224، قیمت: 300، اشاعت: 2024

مبصر: پروفیسر اعجاز علی ارشد

نفیس کالونی، باری پتھ، پٹنہ- 800006

فیاض احمد فیضی کی تازہ ترین کتاب 'خندۂ زیرِ لب' ایسی کتابوں میں شمار کی جاسکتی ہے جنھیں ایک ہی نشست میں پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ تقریباً سوا دو سو صفحات کی یہ کتاب مجھے 25/ اکتوبر کی دوپہر میں ملی اور میں نے پڑھنی شروع کی تو تاریخ بدلنے سے قبل ہی لگ بھگ دو سو صفحات بہت غور سے پڑھ لیے۔ باقی صفحات کا بھی 'سرسری اس جہاں سے گزرے' کے انداز میں مطالعہ کیا کیونکہ یا تو وہ میرے پڑھے ہوئے تھے یا فیضی کے لکھے ہوئے نہیں تھے۔

دراصل فیضی کی دوسری کتابیں بھی میں شوق سے پڑھتا رہا ہوں اور مجھے احساس ہے کہ عصری مشاہدات کو طنز وظرافت کی چاشنی میں ڈبو کر دل پذیر بنا دینا فیاض احمد فیضی کی تخلیقی ہنرمندی کا سب سے نمایاں پہلو ہے ظاہر ہے کہ عہدِ حاضر کے وہ بیشتر جلوے جو فیضی کی تحریروں میں دکھائی دیتے ہیں ہمارے اور آپ کے تجربات کا بھی حصہ بنتے رہے ہیں مگر انھیں بیان کرتے ہوئے ہم یا تو نکتہ چیں بن جاتے ہیں یا مصلح، جب کہ فیضی بنیادی طور سے ایک فنکار ہی رہتے ہیں۔ کمالِ فن یہ ہے کہ ہنسنے ہنسانے میں بھی وہ ایک وقار اور معیار قائم رکھتے ہیں ورنہ 'خندۂ زیرِ لب' کو دستِ طلب یا نصیحت بے سبب بننے میں دیر نہیں لگتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی کردار کے پس پردہ خطیب بننے کی کوشش کرتے ہیں تو کم از کم مجھے اچھا نہیں لگتا۔

'خندۂ زیرِ لب' کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بھی اندازہ ہوا کہ فیضی کے یہاں مشاہدے کی وسعت کے ساتھ ساتھ طرزِ بیان کی نیرنگی روز افزوں ہوتی جارہی ہے۔ انھوں نے انشائیوں اور ظریفانہ مضامین کے علاوہ خاکے بھی لکھے ہیں اور سفرنامے بھی۔ لطف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خاکوں پر ایسے برجستہ عنوانات لگا دیے ہیں جو مرکزی خیال کی وضاحت کے لیے کافی ہیں، مثلاً 'چھوٹے شہر کا بڑا آدمی' یا 'مخالف سمت کا آدمی' وغیرہ۔ ساجد رشید، پرویز یداللہ مہدی، محمد رفیع انصاری، بیگ احساس یا عبدالستار دلوی کے خاکے پڑھتے ہوئے ان کی زندہ دلی کے ساتھ ساتھ دردمندی کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ صورت بعض مضامین میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جہاں وہ قاری کو خندہ زیرِ لب سے آگے بڑھ کر پہلے تو قہقہہ لگانے پر مجبور کرتے ہیں اور اختتام تک پہنچنے سے قبل اچانک آب دیدہ بھی کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'چچا چھکن نے اسمارٹ فون خریدا' میں چندو کے سوال کا جواب دیتے ہوئے چچا کا یہ بلیغ اور درد انگیز بیان ملاحظہ ہو:

''بیٹا تیرے جیسے نوجوان اپنا موبائل لینے کے بعد آہستہ آہستہ ساری رشتہ داریاں کھو بیٹھتے ہیں۔ ہم نے یہ اسمارٹ فون اس لیے لیا ہے کہ اپنے کھوئے ہوئے رشتہ داروں کو دوبارہ پا سکیں۔''

فیضی نے اپنی تحریروں میں کئی بار مشتاق احمد یوسفی کا نام لیا ہے۔ ویسے بھی ان دنوں ظرافت نگاری کا کوئی حوالہ یوسفی کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن فیضی کی تحریروں سے چار پانچ بیانات نقل کرتے ہوئے انھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ یوسفی بن سکتے ہیں اگر پہلے وہ اس طرح کے مزید چار درجن جملے تراش لیں اور پھر دو درجن میڈیا پرسن تلاش کرلیں۔ میری نظر میں وہ جملے یہ ہیں:

(الف) لیکن فقیروں اور مفلسوں کو سوائے افزائشِ نسل کے کوئی اور شوق نہیں ہوتا۔

(ب) پچھلی چند دہائیوں میں سوشل میڈیا نے زندگی کے ہر شعبے میں اتنی آسانیاں پیدا کر دی ہیں کہ جینا دشوار ہو گیا ہے۔

(ج) عورت اس لیے شادی کرتی ہے کہ اسے بچپن ہی میں بتا دیا جاتا ہے کہ تم صرف شادی کرنے کے لیے اس دنیا میں آئی ہو۔

(د) فیس بک وہ دنیا ہے جہاں بے چہرہ لوگ، دو چہرہ لوگ اور کثیر چہرہ لوگوں کی کثرت ہے۔

پیشِ نظر کتاب کے سبھی مضامین کا تعارف کرانا تو دشوار بھی ہے اور شاید نامناسب بھی کیونکہ اس سے قارئین کا شوقِ مطالعہ کم ہو جائے گا۔ پھر بھی دو تین مضامین کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو 'عیادت کرنے والے کم نہ ہوں گے' ہے

جس کو سوفی صد نہ سہی تو نوے فی صد 'آپ بیتی' اور ذاتی تجربے کا اظہار سمجھنا چاہیے۔ جب وہ ہارٹ سرجری کے لیے جانے والے ہوتے ہیں ان کے چار دوست ایک ساتھ عیادت کے لیے آتے ہیں اور دیر رات تک واپس جانے کا نام نہیں لیتے۔ ایک اٹھاون برس کے نوجوان شاعر ہیں جو اپنی آٹھ دس غزلیں اور چار پانچ نثری نظمیں سناتے ہیں، دوسرے افسانہ نگار ہیں جو پینتالیس منٹ میں اپنا ایک افسانہ پیش کرتے ہیں، تیسرے صحافی ہیں جو مستقل اپنے مدیر کی جہالت کا مذاق اڑاتے ہیں اور چوتھے ایک پروفیسر ہیں جو اپنے معاشقوں کی داستان سنا کر مریض کا دل بہلانا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپریشن سے قبل ہی مریض نیم جاں ہو جاتا ہے۔ مگر مضمون میں بہت کچھ 'جگ بیتی' بھی ہے۔ مثلاً:

''پسندیدگی (Like) اور تبصرے (Comments) کی اس دوڑ میں اکثر لوگ بیماری اور موت کی خبر پڑھ کر بھی Like کا بٹن دبا دیتے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو ان کی عجلت پسندی اور کچھ علم کی کمی اور عمل کی زیادتی ہوتی ہے۔ بیماری کی خبر کے جواب میں ریڈی میڈ دعائیں اور وفات کے موقع پر نت نئی ڈیزائن اور رنگوں والے انا للہ وانا الیہ راجعون کے طغرے اب سوشل میڈیا پر بآسانی دستیاب ہیں جو بیماروں اور عیادت گزاروں اور متوفیان اور تعزیت گزاروں کے درمیان پل کا کام کرتے ہیں۔''

دوسرا مضمون 'چلغوزے' ہے جس میں طنز کی فراوانی ہے اور استعارے کا پردہ اتنا لطیف ہے کہ موجودہ معاشرے کا حال چال صاف نظر آتا ہے۔ تیسرا 'ڈاکٹر واٹس اپ' ہے جو طنز ملیح کا خوب صورت نمونہ ہے اور ان لوگوں کے لیے درس عبرت بھی جو واٹس اپ کے نسخوں سے اپنا علاج کراتے ہوئے شرماجی کی طرح نئی نئی بیماریوں میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں۔

کتاب کے آخری مضمون بلکہ مختصر سفرنامہ 'فردوس گم شدہ' کا تذکرہ میں اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ نہ صرف قارئین کو بلکہ فیضی اور ان کی طرح کے دوسرے مسافروں کو بھی جو ٹام کروکس یا ایزمائی ٹرپ (Ease my Trip) کے وسیلے سے کشمیر کا چندروزہ سفر کرتے ہیں، وہاں کی حقیقی صورت حال کا احساس کرا سکوں۔ سچی بات یہ ہے کہ کشمیر کی روح کا اندازہ وہاں دو چار دن قیام کر کے لگایا ہی نہیں جا سکتا۔ جب تک ہم سری نگر کے ہنگاموں، نشاط باغ اور شالیمار باغ کے حسن، حضرت بل کی درگاہ، گلمرگ اور پہلگام سے چالیس پچاس کیلومیٹر دور کے سیاحتی مقامات کا سفر نہ کریں، کشمیر کا قدرتی حسن ہماری نظروں سے اوجھل ہی رہتا ہے۔ رہی کشمیریوں کی صارفیت یا تجارت پسندی تو وہ بھی کن حالات کا نتیجہ ہے، اس پر غور کرنا ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن حالات میں انھوں نے کئی دہائیوں سے زندگی گزاری ہے بلکہ اب بھی گزار رہے ہیں، اس کے باوجود ان کا حوصلہ، ان کی قناعت پسندی اور مہمان نوازی ایک مثال ہے۔ ایسے میں 'فردوس گم شدہ' کا آخری پاراگراف تو میری نظر میں ایک سوالیہ ہی ہے۔ کاش کہ فیضی کشمیر کا ایک اور سفر کر سکیں اور اس سفرنامے پر نظر ثانی کی گنجائش نکلے۔

فیضی میرے ہم عصر بھی ہیں اور طنز و مزاح نگار ہونے کے سبب ہم مشرب بھی۔ گرچہ وہ شاید 'بزرگی بہ عقل است' کے معیار سے مجھے بزرگ قرار دینے پر مصر رہتے ہیں۔ لیکن میں ان کو ظرافت نگاری کے میدان میں خود سے کوسوں نہیں تو میلوں آگے دیکھتا ہوں اور اس حیرت انگیز سچائی کا قائل ہوں کہ ان کے اسلوب کی شگفتگی عمر بڑھنے کے باوجود کم ہونے کی جگہ بڑھتی جا رہی ہے۔

## شاعری

### کلیات خیر

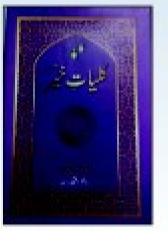

شاعر و تخلیق کار: ابوالخیر رحمانی

مرتب و مدوّن: ڈاکٹر افتخار احمد

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

صفحات: 688، قیمت: 1000، سنہ اشاعت: 2024

مبصر: عبدالقیوم، رام گھاٹ کالونی، وزیر آباد، دہلی 110084

'کلیات خیر' مولانا ابوالخیر رحمانی کے اردو و فارسی کلام پر مشتمل ہے۔ کلیات میں شامل مقدمہ کافی طویل اور معلوماتی ہے جس میں ڈاکٹر افتخار احمد نے ابوالخیر رحمانی کی حیات و خدمات کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور زندگی کے ہر پہلو کو اُجاگر کیا ہے۔ اس کلیات کی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر افتخار احمد (اسوسیٹ پروفیسر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) نے جس دقت نظری اور باریک بینی سے کام لیا ہے، یقیناً وہ لائق تحسین ہے۔ کلیات کو منظر عام پر لانے سے پہلے ایک عرصے تک انھوں نے خیر رحمانی کے کلام کو جستہ جستہ اکٹھا کیا، تعلیمی و ادبی اور دیگر خدمات کی تفصیلات کو یکجا کیا، پھر اسے کتابی شکل دی۔ اس چیز کا ثبوت کم و بیش دو سو صفحات پر مشتمل تفصیلی مقدمہ ہے۔ افتخار احمد نے بے حد سنجیدگی سے کام کیا ہے۔ مقدمہ اور کتاب کے مطالعے سے ابوالخیر رحمانی جیسی در نایاب شخصیت سے واقف ہونے کا موقع ملتا ہے اور اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ نہ جانے کتنے گوہر نایاب اب بھی پردۂ خفا میں ہیں۔

انیسویں صدی میں مشرقی علوم و فنون کی ماہر شخصیات میں مولانا ابوالخیر رحمانی کا شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں گنتی کے لوگ تھے جن کو بیک وقت اردو، عربی، فارسی، انگریزی زبان پر یکساں دسترس حاصل تھی۔ انگریزی دانی کا عالم یہ تھا کہ انگریز بھی ان کی قابلیت اور زبان دانی کے قائل تھے، انگریزی سے اردو میں کئی نظموں کا ترجمہ کیا ہے اور ان کے مفاہیم کو مزید وسعت کے ساتھ بیان کیا ہے، مشہور انگریزی نظم 'لٹل اسٹار' کا ترجمہ کافی خوب ہے۔

مولانا ابوالخیر رحمانی (اصل نام: ابوالخیر وجیہ الاسلام محمد صفی الدین، تاریخی نام: مظہر عالم [1268ھ] اور تخلص: خیر تھا) کی پیدائش 5 رجب 1286ھ مطابق 12 اکتوبر 1879 بہار کے مشہور ضلع دربھنگہ کے بھون پٹی جگدیش پور میں ہوئی۔ جگدیش پور بعد میں قاضی بہار کے نام سے مشہور ہوا۔ ان کا تعلق ہاشمی خاندان سے تھا۔

مولانا خیر رحمانی کا گھرانہ علمی و ادبی تھا، اس لیے تعلیم و تربیت کا ہر لحاظ سے خیال رکھا گیا اور کسی طرح کی کوئی دقت نہیں آئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، اسکولی تعلیم بھی آس پاس کے اسکولوں میں ہوئی، اعلیٰ دینی تعلیم ندوۃ العلما لکھنؤ سے حاصل کی۔ 1886 میں اس ادارے سے فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد آبائی وطن کو ہی اپنا مستقل مسکن بنایا۔ مولانا محمد علی مونگیری سے بیعت و ارادت سے مشرف ہونے کے ساتھ ان سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور ادبی تسکین کے مراحل بھی طے کرتے رہے۔ مولانا رحمانی اپنی غزلیں بھی مونگیری صاحب کی خدمت میں بغرض اصلاح بھیجا کرتے۔

ابوالخیر رحمانی نے شعری اصلاح حسرت موہانی، جلال لکھنوی سے بھی حاصل کی، حسرت موہانی کا رنگ ان کے کلام میں غالب رہا۔ فارسی شاعری میں سید محمد علی ایرانی کی شاگردی اختیار کی۔ فارسی میں ان کے متعدد کلام موجود ہیں۔ اس کلیات میں بھی ان کا فارسی دیوان شامل ہے۔ ان کی شاعری میں اردو کے کئی اہم شاعروں کا رنگ بھی نظر آتا ہے، انگریزی نظموں کے تراجم میں اسماعیل میرٹھی کا رنگ۔ رباعیاں، کہہ مکرنیاں کہنے میں اکبرالہ آبادی کی عکاسی اور دعوت و پیغام سے لبریز شاعری کرنے میں کلام اقبال کی جھلک نظر آتی ہے۔

کلیات خیر میں اشعار والے زمرے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دیوان اول اور دیوان دوم۔ دونوں دواوین میں اشعار کی پیش کش حروف ہجا کے لحاظ سے کی گئی اور اس میں حرف اخیر کا خیال رکھا گیا ہے۔ ایک خاص اور اہم بات یہ بھی کہ حرف کا اصطلاحی طور پر کیا نام ہے، اسے بھی بریکٹ میں پیش کیا گیا ہے مثلاً حرف: پ (بائے فارسی)، حرف: ٹ (تائے ثقیلہ)۔ حرف: ز (زائے معجمہ) وغیرہ۔ یہ طریقہ کار شعری کلام کی ترتیب وتدوین کے فرائض انجام دینے والوں کے لیے بہترین مثال ہے۔

دیوان سوم (فارسی کلام کے لیے مختص ہے)۔ اس سے پہلے کچھ منظومات، کہہ مکرنیاں، مفردات مختلف عناوین کے تحت ہیں۔ یہ نظمیں بے حد موزوں اور کلاسیکی رنگ میں لیس ہیں۔

اخیر میں قطعات تاریخ کے تحت مختلف قطعات پیش ہیں۔ اخبار، رسائل وغیرہ کے اجرا کی تاریخ کے ساتھ ان کی نوعیت پر بھی منظوم بیان ہے۔ شادیات کے تحت بھی مختلف شخصیات کا تاریخی بیان بشکل منظوم اور بطرز قطعہ موجود ہے۔ تولدات، وفیات، تعمیرات، فتوحات، کامرانیات، مختلف سپاس نامے اس طرح کی شعری تخلیقات کو کلیات میں جگہ دی گئی ہے۔ کلیات کے اخیر میں 'دیوان فارسی (رشحات خیر ونفحات خیر)' کے تحت فارسی کلام اس کلیات کی زینت بنے ہیں۔ یہاں بھی ردیف کا لحاظ حروف ہجا کے اعتبار سے ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کلیات سے ابوالخیر رحمانی جیسے عظیم، فنکار، تخلیق کار سے واقف ہوں گے اور ڈاکٹر افتخار کی خدمات کو سراہیں گے۔

## صحرائے غزل

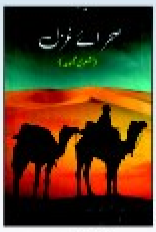


مصنف: ڈاکٹر اے ایم اظہار الحق اظہر (اظہر احمدی)

صفحات: 160، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: ارم پبلشنگ ہاؤس، پٹنہ

مبصر: اشفاق عادل

403، وی وڈ پلازا اپارٹمنٹ، پتھر کی مسجد، پٹنہ۔ 800006 (بہار)

'صحرائے غزل' ڈاکٹر اے ایم اظہار الحق اظہر (اظہر احمدی) کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اظہار الحق اظہر کا تعلق شمالی بہار کے مردم خیز علاقہ چاند فتح پور سے ہے۔ وہ اردو اور انگلش میں ایم اے ہیں اور وکالت کی سند بھی رکھتے ہیں۔ نیز ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے بھی سرفراز ہیں۔ ان دنوں وہ ضلع ویشالی کے صدر مقام حاجی پور میں بحیثیت ایڈووکیٹ پریکٹس کرتے ہیں۔

اظہار الحق اظہر کو شعر وسخن سے طبعی مناسبت ہے۔ وہ زود گو اور تیز گام شاعر ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ شعری سرمایہ جو اس مجموعے میں شامل ہے، کورونا کی وبا کے زمانے میں خلق کیا گیا تھا، جب سارا عالم ہراساں و پریشاں لاک ڈاؤن کی وجہ سے گھروں میں مقید ہو گیا تھا۔ ان دنوں ان کا ذہنی سہارا مشق سخن ہی تھا، جو آج صحرائے غزل کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں غزلوں کے علاوہ ایک حمد، چند نعتیں، مناجات، منقبت، اور قطعات ہیں۔ کتاب کا شعری حصہ 'عرض شاعر' کے بعد عام روایت کے مطابق حمد ونعت سے شروع ہوتا ہے۔

شاعر نے اپنے دیباچہ 'عرض شاعر' میں اپنے شعری ذوق اور اس کے متعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ مجموعے کے آخر میں 'تاثرات و پیغامات' کے تحت پروفیسر علیم اللہ حالی، فیض احمد شعلہ، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر، مولانا سید مظاہر عالم قمر شمسی اور ناظم قادری کی تقریظات ہیں۔ علاوہ اس کے دو شعرا اکبر چنوروی اور منصور آزاد نے منظوم تاثرات پیش کیے ہیں۔

صحرائے غزل کے اوراق سے گزرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی غزلوں میں پیام وانتباہ، جبر واستبداد، احوال زمانہ، ابن الوقت سیاست اور معاشرے کے بگاڑ وغیرہ کی طرف توجہ مرکوز کی ہے یعنی وہ اپنے گرد وپیش سے بے خبر نہیں ہے اور اس کا حساس دل اس سے بے حد متاثر ہے۔ علاوہ ازیں شاعر نے اخلاقی قدروں میں گراوٹ، حالات حاضرہ، دین ومذہب کے نام پر نمائش وبگاڑ پر بغیر مصلحت اندیشی کے اپنی شدید برہمی اور احتجاج کا اظہار کیا ہے، جس کے نمونے صحرائے غزل کے اوراق پر جا بہ جا نظر آتے ہیں۔ کلام کے مطالعے سے مترشح ہوتا ہے کہ شاعر نے سادہ، سلیس اور عام فہم الفاظ میں راست بیانی سے اپنے مافی الضمیر کو اشعار میں ڈھالا ہے۔

نئے زمانے کا دستور اب ہے یہ اظہر — دلوں میں آگ لبوں پر گلاب رکھتے ہیں
لوگ بے خوف ہو کے رہتے تھے — عدل و انصاف کا سماں جب تھا
روٹی کپڑا اور گھر کی ہے ضرورت سب کو یاں — زندہ رہنے کے لیے تو آب ودانہ چاہیے
نفرتوں نے مکاں بنا لیا دل میں — بیر لوگوں میں یہ کہاں تھا کبھی

صحرائے غزل کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ شاعر غزل میں رمز وایمائیت، استعارات، علامات، اشارے وکنائے وغیرہ کے وسیلے سے اپنے جذبات کا اظہار کم کرتا ہے۔ اس کا طرز تخاطب براہ راست ہے، جس کی وجہ سے شعر میں تہ داری اور شعریت کی خوشبو دبی دبی سی نظر آتی ہے۔ وہ جو بھی کہنا چاہتا ہے سیدھے سادے انداز میں کہہ دیتا ہے۔ اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ شاعر کو صحرائے غزل میں ابھی اور سفر کرنا ہے تاکہ وہ نخلستان تک پہنچ سکے۔ اس ضمن میں چند اشعار دیکھیں۔

ہر کسی کی آنکھ سے پردہ ہٹانا چاہیے — سو گئی ہے قوم جو اس کو جگانا چاہیے
جو ہمیشہ وقت پر دھوکا دے اپنے یار کو — ایسے انساں کو نہ پھر سے آزمانا چاہیے
اخبار ان دنوں کے نکلتے ہیں اس طرح — کوئی خبر بھی مجھ کو تو لگتی اہم نہیں

غزل کی شاعری کا بنیادی موضوع حسن وعشق اور اس کے لوازمات ہیں جیسے ہجر ووصال وغیرہ، لیکن آج کی عصری غزلیہ شاعری میں یہ جذبات مدھم ہو گئے ہیں۔ صحرائے غزل کے مسافر کو حوادثات زمانہ کے ادراک کے ساتھ ساتھ لطیف جذبات کا بھی احساس ہے یعنی شاعر کا دل جذبۂ عشق سے تہی دامن نہیں۔ چند شعر دیکھیں۔

چین دل کا قرار آنکھوں کا — لے گئی ان کی بے حجابی سب
پاس جب تم تھے روشنی بھی تھی — کچھ نہ احساس لمحۂ شب تھا
مدتوں سے اداس بیٹھا ہوں — کچھ تو کہیے کہ دل بہل جائے

بعض اشعار میں فنی خامیاں راہ پا گئی ہیں، جنھیں تھوڑی سی توجہ سے دور کیا

جاسکتا تھا۔ مثال کے طور پر۔

اجڑے ہوئے انھیں تو زمانہ گزر گیا    لیکن لبوں پہ اب بھی وہ مسکان رہ گیا
(’مسکان‘ کو تذکیر باندھا گیا ہے)

میں نے سجائی تھی جو چمن وہ بھی ایک دن    ماں باپ کی وفات سے سنسان رہ گیا
(’سجائی تھی‘ کی جگہ ’سجایا تھا‘ ہونا چاہیے)

درج بالا اشعار کی روشنی میں شاعر کو آئندہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ابھی اسے کئی ہفت خواں طے کرنے ہیں اور آفاق کی وسعت انھیں دعوت پرواز دے رہی ہے۔

## قیامت کے باوجود

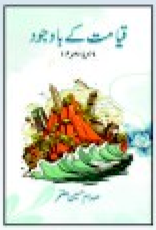

شاعر: صدام حسین مضطر

صفحات: 131، قیمت: 325 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: صدام حسین مضطر

مبصر: محمد ارشد ہمراز، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد 500032

صدام حسین مضطر کا پہلا شعری مجموعہ ’قیامت کے باوجود‘ ابھی منظر عام پر آیا ہے جو 72 غزلوں اور 10 نظموں پر مشتمل ہے۔ بقول مصنف ”مجموعے میں شامل دو تین نظموں اور ایک غزل (جو استاد محترم ڈاکٹر راشد انور راشد کے سانحہ ارتحال پر لکھی گئی) کے علاوہ اپریل 2020 سے دسمبر 2023 تک کی تخلیقی کاوشوں کا انتخاب اس میں پیش کیا گیا ہے“۔ کتاب کے شروع میں مصنف نے ”کچھ اپنے اور کچھ شاعری کے بارے میں“ اس عنوان سے اپنا اور اپنی شاعری کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ تعارف پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ صدام حسین مضطر کے اندر سچ لکھنے کی جرأت ہے اور یہ بھی کہ مضطر نہ صرف اچھے شاعر ہیں بلکہ ان کے اندر ایک عمدہ نثر نگار بھی چھپا ہے۔

پیش نظر مجموعے کے حوالے سے اگر مضطر کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں یکسانیت نہیں ہے۔ اسلوب کا انوکھاپن، موضوعات اور بحور کا تنوع ہے۔ کسی معروف شاعر کی زمین یا ایک ہی رواں اور آسان بحر میں کئی غزلیں لکھ لینا اور اس میں عشق و پیار، گیسوئے یار اور لب و رخسار کی روایتی باتیں کرنا قدرے آسان ہوتا ہے اور سہل پسندی کی وجہ سے نئے شعرا میں یہ چلن بھی عام ہے لیکن پامال راستے پر چلنے کے بجائے مضطر نے اپنے لیے نئی راہ نکالی ہے۔

غزلوں میں ڈھونڈھیے نہ مری زلف یار کو    خود مجھ میں دیکھیے کہ بہت پیچ و تاب ہے

ان کے یہاں چھوٹی اور طویل بحروں کا استعمال ملتا ہے لیکن ایک ہی بحر کی تکرار نہیں ہے جس کی وجہ سے قاری آہنگ کی یکسانیت سے اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا ہے۔ چھوٹی بحر کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ استفہامیہ لہجے کا کیا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ میری نظر میں یہ ایسی غزل ہے جس کے ایک شعر کی تشریح کے لیے چند صفحات بھی ناکافی ہوں گے۔

جذبات میں ڈوبا کرتے ہو    تم یار خسارا کرتے ہو؟
کس بات کا تم کو دھوکا ہے    کس بات پہ نخرا کرتے ہو؟
کیا ضبط کا بندھن ٹوٹا ہے    یا صرف دکھاوا کرتے ہو؟

یہ مکمل غزل اور اس جیسی کئی اور غزلیں، کرتے ہو؟ ہے نا؟ ہے؟، جیسی استفہامیہ ردیف پر مشتمل ہے۔ استفہامیہ لہجے سے غزل کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ یہ استفہامیہ اور استعجابیہ لب و لہجہ مضطر کی شاعری کو بھی ایک نئی معنویت عطا کرتا ہے۔

کوچہ کوچہ جب حسینی قافلے ہیں    کس لیے تو بولنے سے ڈر رہا ہے؟
ہم جو لگتے ہیں خطا کار ہی لگتے ہیں نا    ہیں نہیں پھر بھی گنہگار ہی لگتے ہیں نا؟
ہوش والوں سے ملو ساتھ ہمارا چھوڑو    ہم تو اکثر تمھیں سرشار ہی لگتے ہیں نا؟

مضطر کی غزلوں میں لفظ ’یار‘ کا کثرت استعمال فراق کی یاد دلاتا ہے۔ فراق کے یہاں جس طرح لفظ ’دوست‘ کا استعمال بڑی کثرت سے ملتا ہے مضطر کے یہاں لفظ ’یار‘ کی وہی کیفیت ہے۔ صدام حسین مضطر کے یہاں لفظ ’یار‘ پر مشتمل اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

تم چپ بھی رہو یار کوئی بات نہ چھیڑو    غم ہے کہ ابھی عید منانے میں لگا ہے
زندہ ہوں دیکھ مجھ کو قیامت کے باوجود    حیرت ہے یار یعنی کہ میں مر نہیں رہا
یار سمجھو ہے مسئلہ دل کا    بات ہوتی اگر یہ عادت کی
یارو ہمارے دور کا عالم نہ پوچھنا    ہر دن ہمارے دور کا یوم الحساب ہے

ماضی اور حال کے سیاسی اور سماجی منظرنامے پر بھی ان کی گہری نظر ہے جس کو شعری پیکر میں ڈھالنے کے لیے رسومیات غزل سے یہ انحراف نہیں کرتے ہیں کہ کہیں یہ نعرہ نہ بن جائے بلکہ انہیں لفظیات اور تراکیب سے غزل بُنتے ہیں جو اس کے لیے موزوں ہیں۔ موضوعات و مضامین کے تفاعل میں یہ جذباتیت سے نہیں بلکہ جذبے سے کام لیتے ہیں اگر ان کے یہاں آگ ہے تو وہ سلگنے والی ہے اور دریا ہے تو وہ خاموشی سے بہتا ہے۔

اپنے کل پر ہنس رہا تھا میں کہ نادانی کے ساتھ
ہنستے ہنستے رو دیا پھر کیوں پشیمانی کے ساتھ
میں یہ کیوں کر بہہ رہا ہوں مثل دریا رات دن
اور حاصل سب کو ہوں میں کیوں فراوانی کے ساتھ

ایسے بہت سے اشعار ہیں جو بطور نمونہ پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان کی کسی غزل میں سطحیت اور اکہرے پن کی چھاپ نظر نہیں آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے شعری بیانیے کی اساس انھوں نے محض عشق و محبت اور سستی جذباتیت پر نہیں رکھی ہے۔ سہیل آزاد صاحب نے درست لکھا ہے:

”مضطر صاحب کی شاعری پر گہرائی سے نظر ڈالنے پر مجھے حیران کن سرشاری کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے سنجیدگی سے محسوس کیا ہے کہ مضطر صاحب نے غزل میں جن خطوط پر سفرِ سخن کا آغاز کیا ہے وہ روایتی مضامین سے مزین نہیں ہیں بلکہ ان کو اپنے تخیلات اور افکار سے شاعر نے تراشا ہے۔ ان غزلوں کی قرأت کرتے ہوئے قطعاً یہ نہیں لگتا کہ اس شاعری کی عمر ابھی بہت کم ہے بلکہ مضامین کی ندرت اور فکر انگیزی نے سخن کی سنجیدہ فضا قائم کی ہے۔ یہ شاعری کسی روایتی محبت اور عشق کا بیانیہ نہیں ہے بلکہ انسانی قدروں کے تنزل، احساس کی دشت نوردی، کاروبار دنیا کی الجھنوں اور ذہن کو تھکا دینے والی دوڑ دھوپ کی تشریحات ہیں۔“

ایک تازہ کار شاعر ہونے کے باوجود ان کی غزلوں اور نظموں میں جو تہہ داری، جدت طرازی، سنجیدگی اور ٹھہراؤ ہے وہ اس امر کا متقاضی ہے کہ انھیں ٹھہر کر پڑھا جائے۔ ان پر گفتگو کی جائے۔ پذیرائی اور حوصلہ افزائی کی جائے کیونکہ صدام حسین مضطر ابھی ریسرچ کے طالب علم ہیں جو انھوں نے پیش کیا ہے اس سے مزید بہتر کے امکانات ان کے یہاں موجود ہیں۔ ■

# ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہو سکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی و ثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔
یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔



# قومی اردو کونسل کی فرینکفرٹ کتاب میلے میں شرکت محبانِ اردو کے لیے باعث صد افتخار: ڈاکٹر شمس اقبال

**نئی دہلی:** جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں منعقدہ پچھترویں کتاب میلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے بھی حصہ لیا۔ یہ کتاب میلہ دنیا کے بڑے کتاب

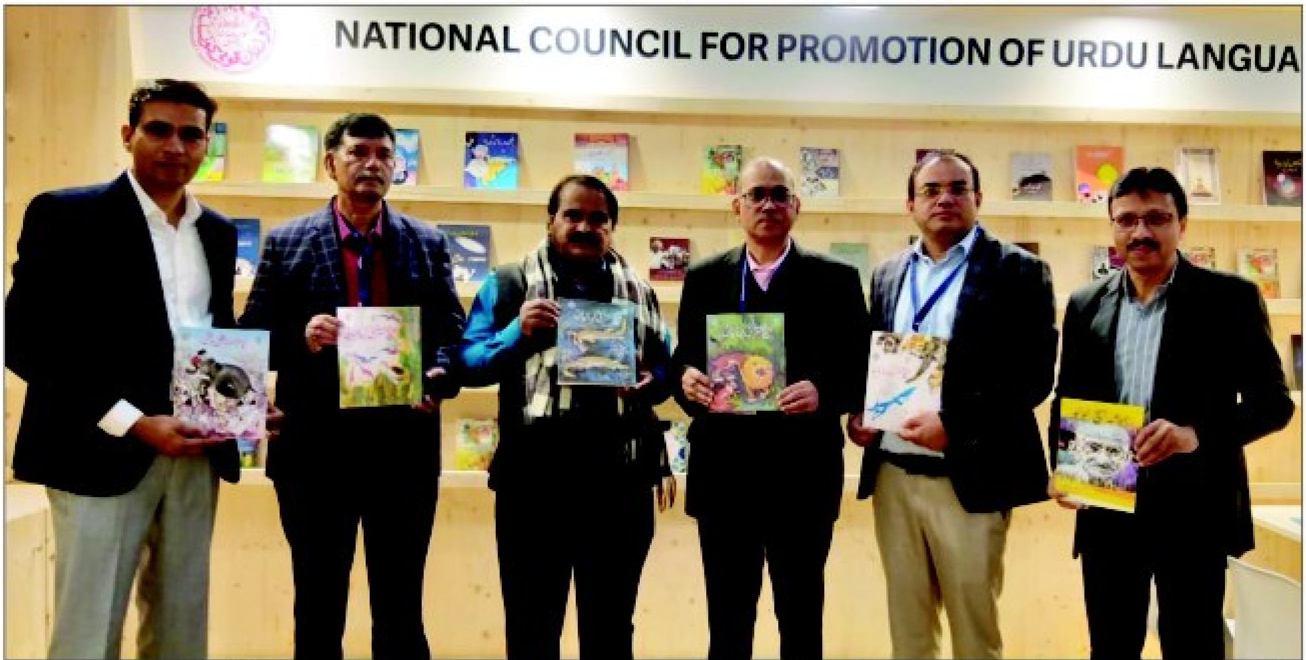


میلوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب میلے کی شناخت کتابوں کے کاپی رائٹ، تراجم اور پروڈکشن کے حوالے سے ہے۔ اس کتاب میلے میں دنیا کے 130 ممالک کے 17000 سے زائد ناشرین، مصنفین اور بک ایجنٹس نے شرکت کی۔ بھارت پویلین کا اہتمام نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا نے کیا ہے۔ قومی اردو کونسل کے اسٹال پر اردو اور دیگر زبانوں کے مصنفین اور ناشرین بڑی تعداد میں تشریف لائے۔ بھارت پویلین میں رام بہادر رائے جی کی کتاب 'آئین ہند: اَن کہی کہانی' کا اجرا بھی مشہور ادیب عارف نقوی اور نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے چیئرمین پروفیسر ملند سدھاکر مراٹھے کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ فرینکفرٹ کتاب میلے میں قومی اردو کونسل کی نمائندگی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) محمد احمد اور اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اجمل سعید نے کی۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ قومی اردو کونسل کی فرینکفرٹ عالمی کتاب میلے میں شرکت محبانِ اردو کے لیے باعث صد افتخار ہے۔ مجھے امید ہے کہ کونسل کی شرکت اردو کے لیے نیک فال ثابت ہوگی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 18 اکتوبر 2024

# آج کے دور میں علم و ہنر اور تربیت کی اشد ضرورت ہے: ڈاکٹر شمس اقبال

## جامعہ سینئر سکنڈری اسکول میں قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام مختلف تہذیبی اور ثقافتی تقریبات

**نئی دہلی :** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام، جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول کے اشتراک سے 'داستان جامعہ' و دیگر ثقافتی اور ادبی پروگرام کا انعقاد اور سہ روزہ نمائش کتب کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ یہاں کے بچوں کو دیکھ کر محسوس ہو رہا ہے کہ

ہندوستان کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔ یہی بچے ملک کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ آج کے دور میں علم و ہنر اور تربیت کی اشد ضرورت ہے۔ ان تین چیزوں کو سامنے رکھ کر اگر اساتذہ ان بچوں کی تعلیم و تربیت کریں گے تو یقیناً یہ بچے ملک کی تعمیر و ترقی میں کلیدی کردار ادا کریں گے۔ پروگرام کا آغاز انٹر اسکول ڈبیٹ مقابلے سے ہوا۔ اس مقابلے میں اول انعام محمد حذیفہ (اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول)، دوم انعام آمنہ انصاری (سید عابد حسین سینئر سیکنڈری اسکول) اور سوم انعام اریبہ شاہ (جامعہ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول) نے حاصل کیا۔ جب کہ تشجیعی انعام مریم (جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول) کو دیا گیا۔ فاتح اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول کی ٹیم قرار پائی۔ جب کہ دوسرا مقام جامعہ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول نے حاصل کیا۔

بیت بازی مقابلے میں اول انعام محمد حذیفہ (اینگلو عربک اسکول)، دوم محمد شاہد عالم (جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول) اور تیسرا انعام ادیبہ مختار (سید عابد حسین سینئر سیکنڈری اسکول، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے حاصل کیا۔ جب کہ تشجیعی انعام ماریہ فیصل (رابعہ پبلک سینئر سیکنڈری اسکول) کو دیا گیا۔ فاتح ٹیم اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول کی مومن ٹیم قرار پائی۔ جب کہ دوسرا مقام جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول کی غالب ٹیم نے حاصل کیا۔

غزل سرائی مقابلے میں اول انعام جامعہ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول کی ماہم امداد، دوم انعام اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول کے محمد حمزہ اور سوم انعام جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول کی سامعہ نے حاصل کیا۔ جب کہ تشجیعی انعام رابعہ پبلک سینئر سیکنڈری اسکول کی آمنہ خان کو دیا گیا۔ غزل سرائی مقابلے میں فاتح جامعہ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول کی ٹیم قرار پائی۔ جب کہ دوسرا مقام اینگلو عربک اسکول کی ٹیم نے حاصل کیا۔

ان مقابلوں میں ہی ڈبلو سی ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل سوسائٹی، سید عابد اسکول سینئر سیکنڈری اسکول، جامعہ مڈل اسکول، خدیجۃ الکبریٰ گرلز پبلک اسکول وغیرہ کے طلبا و طالبات نے بھی شرکت کی۔

پروگرام میں استقبالیہ کلمات ڈاکٹر محمد ارشد خان، پرنسپل جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول نے پیش کیے۔ اس موقعے پر 'داستانِ جامعہ' کے عنوان سے پروفیسر دانش اقبال کی تحریر کردہ داستان کی پیش کش ڈاکٹر جاوید حسن، قاصد رضا، سید تجمل اسلام، محمد عادل اور انس فاروقی نے کی۔ ڈبیٹ، غزل سرائی مقابلہ اور بیت بازی مقابلے میں حَکَم کے فرائض ڈاکٹر عبدالنصیب، ڈاکٹر رحمان مصور اور ڈاکٹر واحد نظیر نے انجام دیے۔ اس موقعے پر بطور خاص پروفیسر شہپر رسول (وائس چیئرمین، اردو اکادمی دہلی)، ڈاکٹر اطہر فاروقی (جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو ہند)، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک، قومی اردو کونسل) اور ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر) وغیرہ موجود رہے۔

پروگرام کو کامیاب بنانے میں ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی، کنچن بھاردواج اور جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول کے دیگر اساتذہ نے اہم کردار ادا کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28 اکتوبر 2024

# قومی اردو کونسل میں وجیلنس بیداری ہفتہ کے تحت پروگرام

**نئی دہلی :** قومی اردو کونسل کے زیراہتمام وجیلنس بیداری مہم کے تحت پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں قومی اردو کونسل کے تمام اسٹاف نے ایمانداری کے ساتھ اپنی ذمے داریاں ادا کرنے کا حلف لیا۔ اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اشارات اور نکات سے آگاہ کیا۔انھوں نے کہا کہ صرف سرکاری ملازم ہی نہیں بلکہ ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی ایمانداری سے گزارے اور بدعنوانی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے اور یہ احساس اپنے آس پاس کے لوگوں میں پیدا کرنے کی بھی کوشش

ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ وجیلنس بیداری ہفتہ منانے کا مقصد آفس کے تمام اسٹاف اور کارکنان کو اپنے فرائض، ذمے داریوں اور حقوق کے تئیں بیدار کرنا ہے اوران کے اندر وہ جذبہ پیدا کرنا ہے جس کے ذریعے وہ سماج سے بدعنوانی، کرپشن وغیرہ دور کرسکیں اور نظام میں شفافیت لاسکیں۔

اس موقعے پر مقرر مہمان جناب رویندر کمار (ریٹائرڈ ڈائرکٹر، گورنمنٹ آف انڈیا) نے لیکچر دیا اور اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے موضوع کے تمام اہم کرے تبھی ہمارا نظام بہتر سے بہتر ہوگا۔انھوں نے مزید کہا کہ ہر سرکاری ملازم کو رول آف کنڈکٹ پڑھنا چاہیے اوراس کے مطابق ہی اپنے فرائض ادا کرنا چاہیے۔ اس موقعے پر کچھ سوالات بھی کیے گئے جن کے انتہائی اطمینان بخش جوابات رویندر کمار جی نے دیے۔مہمان مقرر کا تعارف قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) محمد احمد نے کرایا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 اکتوبر 2024

# جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

# اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

**دھلی**

## شاہد ماہلی: حیات وادبی خدمات

**نئی دھلی:** انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام اردو کے معروف ومشہور

شاعر وادیب اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائرکٹر سید شاہد ماہلی کی یاد میں 'شاہد ماہلی یادگاری خطبہ' بعنوان 'شاہد ماہلی: حیات وادبی خدمات' کا انعقاد 19 اکتوبر 2024 کو کیا گیا۔ معروف دانشور ایڈوکیٹ عبدالرحمٰن نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ شاہد ماہلی نہ صرف ادیب وشاعر اور دانشور تھے بلکہ ایک اچھے مربی، استاد، دوست، اور شریف الطبع خصلت کے مالک تھے۔ مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) کے صدر اقبال مسعود فاروقی نے کہا کہ شاہد ماہلی آج ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی علمی وادبی کارنامے ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ اردو کے معروف ادیب ونقاد پروفیسر صادق نے کہا کہ شاہد ماہلی نے اردو دنیا کے لیے جو کام کیا ہے اسے کبھی بھی اہل دانشور فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) کے جنرل سکریٹری خورشید عالم نے کہا کہ شاہد ماہلی نے جو اردو کے لیے اپنی خدمات انجام دی ہیں اس سے ایک عہد کی نمائندگی ہوتی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) نے ہمیشہ یوم غالب اور یوم ذوق کو بڑے اہتمام سے منایا ہے۔ ہم نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ ہم شاہد ماہلی یادگاری خطبے کا انعقاد کریں گے جس کی آج تکمیل ہو رہی ہے۔ آج ہم اپنے ایک دیرینہ دوست اور انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائرکٹر سید شاہد ماہلی کی یاد میں جمع ہوئے ہیں۔ شاہد ماہلی کا غالب انسٹی ٹیوٹ میں 1978 میں تقرر ہوا۔ وہ 1998 میں انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 2013 میں ان کی اس عہدے سے سبکدوشی ہوئی۔ جب 2019 میں ان کا وصال ہوا اس وقت وہ انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے صدر تھے۔ آج شاہد ماہلی ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر آج بھی ان کی تخلیق کردہ کتابیں ادبی دنیا میں اہمیت رکھتی ہیں۔ انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) کی رکن ہاجرہ منظور نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ شاہد ماہلی کو یاد رکھنا دراصل اپنی تہذیبی وراثت کو یاد رکھنا ہے۔ مذاکرے کے بعد شام غزل کا اہتمام کیا گیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 20 اکتوبر 2024

## مشترکہ تہذیب اور اردو ادب پر لیکچر

**دھلی:** شعبۂ اردو کروڑی مل کالج کے زیراہتمام منعقدہ پروگرام بعنوان 'مشترکہ تہذیب اور اردو ادب' میں طلبا سے مخاطب ہوتے ہوئے ڈاکٹر احمد امتیاز نے فرمایا کہ کلچر ایک پیچیدہ کلیہ ہے اس میں علم، عقائد، فنون، اخلاق، قانون، رسم ورواج، اور دوسری بہت سی صلاحیتیں اور عادتیں شامل ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین پر مختلف علاقوں سے لوگ آتے رہے اور اپنی تہذیبی روایت سے یہاں کے لوگوں کو متعارف کرتے رہے اس کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندوں نے بھی دوسری قوموں پر اپنی تہذیب کے اثرات ڈالے۔ یہ سلسلہ ہزاروں برسوں سے اسی طرح ایک نسل سے دوسری نسل، ایک قوم سے دوسری قوم اور ایک خطہ سے دوسرے خطے میں چلتا رہا۔ تہذیبی عوامل کا منتقل ہونا ایک فطری عمل ہے انھوں نے آریاؤں کی آمد سے لے کر عہد وسطیٰ کے مسلمانوں اور برطانوی حکمرانوں تک کا ذکر کیا، امیر خسرو سے لے کر ظفر اقبال تک کے شعرا کے کلام پیش کیے اور مشترکہ تہذیب پر روشنی ڈالی۔ اس تقریب میں کالج کے پرنسپل پروفیسر دینیش کھٹر موجود تھے۔ اس موقعے پر پروفیسر محمد یحییٰ صبا نے مشترکہ تہذیب کے علم برداروں کا ذکر کیا اور ان کی گنگا جمنی فکر پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر محمد محسن نے ہندوستان کی تہذیبی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے ساج کے مثبت پہلوؤں کو سراہا۔ محمد عمران حسین نے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ انھیں ملک کی تہذیبی روایت کو زندہ رکھنے کے لیے اس قسم کی مہم کا حصہ بننا چاہیے۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر راکیش کمار پانڈے نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں مشترکہ تہذیب کی اہمیت وافادیت اور اس کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے حسرت موہانی کی غزل سنائی۔ ڈاکٹر ندیم احمد نے پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی جڑیں اس سرزمین میں اس قدر گہری ہیں کہ کوئی اسے مٹا نہیں سکتا۔ تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر مجیب احمد خان نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب میں کالج کے اردو طلبا کے ساتھ ساتھ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے طلبا وطالبات اور ریسرچ اسکالر بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 22 اکتوبر 2024

## سینٹ اسٹیفن کالج میں اردو خطاطی ورکشاپ

**نئی دھلی:** سینٹ اسٹیفن کالج دہلی یونیورسٹی میں

ہفت روزہ اردو خطاطی ورکشاپ کے اختتامی اجلاس کے موقعے پر شعبۂ اردو کے استاذ پروفیسر شیم احمد نے اردو ورکشاپ میں شریک طلبہ اور حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے ان کے ذوق و شوق کی تعریف کی۔ انھوں نے طلبا کے اردو زبان سے لگاؤ اور تجسس کو دیکھتے ہوئے کہا کہ ہم عنقریب اردو کی تہذیب وتحریر سے متعلق دوسرا پروگرام تشکیل دیں گے۔ ڈاکٹر سرفراز جاوید نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ شعبہ کی جملہ کارکردگی کی کامیابی میں طلبہ کا اہم کردار ہوتا ہے۔ شعبۂ اردو، بزم ادب کی صدر علمہ شیم نے معروف خطاط ڈاکٹر شیم احمد کے بارے میں بتایا۔ فراز سرور نے اساتذہ اور خطاط ڈاکٹر شیم احمد بجنوری کے حسن سلوک اور حوصلہ افزائی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 اکتوبر 2024

## 'کتھا سندھی' پروگرام

**نئی دھلی:** ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'کتھا سندھی' پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں معروف اردو افسانہ

نگار پروفیسر اسلم جمشید پوری نے شرکت کی۔ قابل ذکر ہے کہ اس پروگرام کے تحت ملک کے بلند پایہ فکشن نگار کو مدعو کیا جاتا ہے جس میں ان کے تخلیقی سفر پر گفتگو ہوتی ہے، ساتھ ہی ان سے کوئی منتخب افسانہ پیش کرنے کی گذارش کی جاتی ہے۔ آج کے پروگرام میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اپنے تخلیقی سفر پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ انھیں افسانے پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ جب ان کے والد کہیں باہر جاتے تو اپنے ساتھ فکشن کی کتابیں خرید کر لاتے جنھیں وہ پوری دلجمعی سے پڑھتے۔ انھوں نے ابن صفی کو بہت پڑھا اور پھر انھیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کا آبائی وطن بلند شہر ہے مگر ان کے والد جمشید پور میں رہتے تھے جہاں ان کی پیدائش ہوئی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'افق کی مسکراہٹ' کے نام سے 1997 میں شائع ہوا، اسی سال بچوں کے لیے کہانیوں کا مجموعہ 'ممتا کی آواز' بھی منظر عام پر آیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کی کہانی 'لینڈرا' بھی بہت پسند کی گئی جس کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا۔ انھوں نے 'گئودان سے پہلے' نام کی اپنی عمدہ کہانی پیش کی جسے سامعین نے خوب پسند کیا۔ اس پر اظہارِ خیال کرنے والوں میں چندر بھان خیال، پروفیسر فاروق بخشی، پرویز شہریار اور ابوظہیر ربانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس محفل میں میرٹھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے اساتذہ کے علاوہ کئی طلبہ نے شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت اکادمی کے ڈپٹی سکریٹری دیویندر کمار دیویش نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 اکتوبر 2024

## اردو صحافت کا موجودہ منظر نامہ اور چیلنجز

**نئی دھلی:** اردو صحافت کو پیغمبرانہ مشن قرار دیتے ہوئے روزنامہ 'انقلاب' نارتھ کے ایڈیٹر ودود ساجد نے کہا کہ یہ چیلنجز کے کوکھ سے پیدا ہوئی، ایسے میں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اردو گھر نئی دہلی میں منعقد بھارت ایکسپریس اردو کانکلیو میں 'اردو صحافت کا موجودہ منظر نامہ اور چیلنجز' کے عنوان سے اپنے اہم خطاب میں انھوں نے کہا کہ اردو صحافت کو درپیش کوئی بھی چیلنج اس کو ختم نہیں کرسکتا۔ انھوں نے اسٹیج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں پر موجود اردو صحافیوں کی پہلی، دوسری اور تیسری نسل کی مثال ہے۔ ودود ساجد نے بھارت ایکسپریس کے مینیجنگ ایڈیٹر رادھے شیام سے درخواست کی کہ اگر وہ اس تقریب میں صحافت کے طلبا کو ایوارڈ سے نواز رہے ہیں تو ان کی تربیت کا بھی انتظام کریں، جس کو رادھے شیام نے فوری طور پر قبول کرلیا اور ایڈیٹر انقلاب کی تقریر کے اختتام کے فوری بعد 12 طلبہ کے لیے ادائیگی کے ساتھ انٹرن شپ کا اعلان کیا جس کو کافی سراہا گیا۔ اس سے قبل جدید خبر کے ایڈیٹر معصوم مراد آبادی نے کہا کہ ملک میں جس طرح اردو زبان کی خستہ حالت ہے، وہی صورت حال اردو اخبارات کی بھی ہے۔ جو لوگ اردو اخبارات نکال رہے ہیں، انھیں اندرونی مشکلات کا علم ہے۔ این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ اردو کے خاص قاری تو ہیں، لیکن عام قاری ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں مایوسی کی بجائے پرامید رویہ اختیار کرنا چاہیے اور یہ اردو صحافت کا کام ہے کہ وہ بتائے کہ اردو زندہ ہے، اردو زندہ تھی اور رہے گی۔ خیال رہے کہ بھارت ایکسپریس کے اردو کانکلیو میں صحافتی، سیاسی، سماجی اور مذہبی سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔ اس کے مختلف سیشن میں اہم شخصیات کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 اکتوبر 2024

## شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 55 ویں ان ہاؤس سمینار کا انعقاد

**نئی دھلی:** ریسرچ اسکالرز فورم، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے زیر اہتمام پروفیسر نسیم اختر ندوی،

صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر صدارت 55 ویں ان ہاؤس سمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ پروگرام کے آغاز میں ریسرچ اسکالرز فورم کے سکریٹری ابوحذیفہ نے تمام اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کا استقبال کیا۔ اس کے بعد ریسرچ اسکالر 'محمد اعجاز' نے شامی ناول نگار سمریز بک کے ناول 'صلصال' کا ایک تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ مقالہ نگار نے ابتدا میں ناول نگار کی زندگی کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتے ہوئے ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی اور خاص کر ان کے ناول پر تفصیلی گفتگو کی۔ ناول کے موضوعات، کردار، اسلوب بیان، اور ناول کے اجتماعی اور سیاسی منظر نامے پر بھی روشنی ڈالی۔ مقالے کے بعد اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز نے مقالے سے متعلق سوالات بھی کیے جن کے مقالہ نگار نے انتہائی خوش اسلوبی سے جواب دیے۔ سمینار میں شریک اساتذہ نے مقالہ کو سراہا اور اسے مفید اور معلومات افزا قرار دیا۔ پروگرام کے آخر میں صدر جلسہ پروفیسر نسیم اختر ندوی صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مقالہ کی تعریف کرتے ہوئے مقالہ نگار کو مفید مشورے دیے۔ انھوں نے ریسرچ اسکالرز کو ان ناول نگاروں کی ناولوں کا بھی مطالعہ کرنے کے لیے کہا جو ابھی باحیات ہیں اور عصر حاضر کے مشہور ترین ناول نگاروں میں شمار

ہوتے ہیں۔ پروگرام کے آخر میں پروگرام کے ناظم ابوحذیفہ نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 19 اکتوبر 2024

## موجودہ زمانے میں اسٹیم ایجوکیشن کے مواقع

**نئی دہلی:** شعبہ تربیت اساتذہ و غیر رسمی تعلیم (آئی اے ایس ای) شعبہ تعلیمات، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے آئی اے ایس ای کے نیو ہال میں 'موجودہ زمانے میں اسٹیم ایجوکیشن کے مواقع' کے موضوع پر ایک توسیعی خطبہ منعقد کیا۔ شعبہ تعلیمات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت پر ملبورن یونیورسٹی، آسٹریلیا کے پروفیسر جان وان ڈریل نے یہ خطبہ دیا جس نے آج کی سرعت سے بدلتی زندگی میں اسٹیم ایجوکیشن کی اہمیت کی طرف ملتفت کیا۔ قابل ذکر ہے کہ ملبورن یونیورسٹی نے نئی دہلی کے کناٹ پلیس میں اپنا ایک سینٹر قائم کیا ہے جس کا نام ملبورن گلوبل سینٹر رکھا ہے۔ ایک فیکلٹی اور ریسرچ اسکالروں کو 14 اکتوبر کو اسٹیم ایجوکیشن پر یک روزہ ورکشاپ میں مدعو کیا گیا تھا۔ اس پروگرام کی کڑی کے طور پر آئی اے ایس ای، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کنوینر ڈاکٹر ارم خان کے استقبالیہ خطبے سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ مہمان مقرر پروفیسر جان وان ڈریل ملبورن یونیورسٹی کے فیکلٹی آف ایجوکیشن میں ریاضی، سائنس، ٹکنالوجی اور ایجوکیشن گروپ کے کولیڈر اور سائنس ایجوکشن کے پروفیسر ہیں۔ اسٹیم ایجوکیشن کے سلسلے میں اپنے گہری معلومات سے انھوں نے سامعین کو مبہوت کر دیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے جدید معاشرے کی ترقی اور اس کے فروغ میں اصول اور ضابطہ کے اہم رول پر زور دیا۔ اسٹیم ایجوکیشن کی عمل آوری کے سلسلے میں پروفیسر موصوف نے آسٹریلیا کے نصاب میں امتحان کے نظام میں چیلنجز اور فعال سماعت کے رول پر بھی زور دیا۔ جھوٹی خبروں اور غلط اطلاعات کے اس عہد میں اسٹیم ایجوکیشن کی اہمیت پر ان کی تقریر مرکوز تھی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 18 اکتوبر 2024

## اقبال کے فکر و فن کا حسن امتزاج

**نئی دہلی:** اقبال کے فکر و فن کا حسن امتزاج کے موضوع پر 27 اکتوبر کو ایک سمینار تسمیہ آڈیٹوریم جامعہ نگر میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سید فاروق نے صدارتی کلمات میں مقالہ نگاروں کے مقالات پر مختصر گفتگو کی۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کے کلام میں فکر و فن کا حسن امتزاج ہی ان کو بڑا شاعر اور مفکر بناتا ہے۔ سابق وائس چانسلر امپھال ایگری کلچر یونیورسٹی ڈاکٹر افروز عالم نے اپنی گفتگو میں کہا کہ اقبال کی اہمیت جتنی ایشیا میں ہے اتنی ہی یورپ میں بھی ہے۔ معظم الدین نے اپنے مقالے میں اقبال کے کلام کے ارتقائی فکر و فن پر روشنی ڈالی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ڈاکٹر شکیل اختر نے اپنے خطاب میں اقبال کے فکر و فن پر بامعنی گفتگو کی۔ فارسی شعبہ کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ارشد القادری نے اقبال کے فارسی کلام کی اہمیت اور معنویت پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر سرفراز جاوید نے اقبال کے فلسفہ خودی کے حوالے سے مقالہ پیش کیا، شعبۂ اردو دہلی کے استاد ڈاکٹر علی احمد ادریسی، ڈاکٹر نورین علی اور ریسرچ اسکالر محمد فیصل، محمد رضوان نے اپنے پرچے پڑھے۔ اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ریسرچ اسکالر انیس احمد نے اقبال کے فکر و فن پر مضمون پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 28 اکتوبر 2024

## ابن کنول: حیات و ادبی خدمات

**نئی دہلی:** دہلی یونیورسٹی شعبہ اردو کے سابق صدر اور معروف ادیب پروفیسر ابن کنول کی یاد میں 15 اکتوبر کو

یک روزہ سمینار 'ابن کنول: حیات و ادبی خدمات' کا انعقاد کیا گیا۔ یہ سمینار غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی اور 'شاگردان پروفیسر ابن کنول' کے اشتراک سے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سمینار ہال میں منعقد کیا گیا۔ سمینار میں پروفیسر ابن کنول کے رفقا، دوست احباب، ان کے شاگرد اور ریسرچ اسکالرز نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ معاصر اساتذہ، معروف تخلیق کاروں اور ادیبوں نے کہا کہ پروفیسر ابن کنول کو داستان کا شوق خاندانی وراثت کے طور پر ملا تھا، ان کے افسانوں میں رشتوں کے بچھڑنے کا غم اور تہذیبی اقدار کے زوال کو محسوس کیا جاسکتا ہے، وہ ایک مخلص استاذ، معروف ادیب، مقبول افسانہ نگار، نکتہ سنج محقق اور شریف الطبع انسان تھے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے کی۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر صغیر افراہیم نے ابن کنول کی حیات و خدمات پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے دور طالبعلمی سے لے کر عملی زندگی کا پورا نقشہ پیش کیا۔ اس موقعے پر استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر محمد کاظم نے کہا کہ ابن کنول کی علمی و ادبی خدمات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی ہمہ جہت شخصیت پر چار یونیورسٹیز میں تحقیقی مقالات لکھے جارہے ہیں۔ پروفیسر فاروق بخشی نے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ابن کنول کو یاد کر کے آج بھی آنکھیں چھلک جاتی ہیں۔ انھوں نے ابن کنول کی شخصیت پر ایک شعر پڑھا۔

عمیق گہرے سمندر کے پانیوں جیسا
عجیب شخص تھا قصے کہانیوں جیسا

معروف ناول نگار پروفیسر غضنفر نے ابن کنول پر تحریر کردہ اپنا خاکہ 'بند راستے' پیش کیا۔ مذکورہ خاکے میں غضنفر نے ابن کنول کی حیات و خدمات کو انتہائی فنکاری کے ساتھ پیش کیا۔ معروف تخلیق کار پروفیسر طارق چھتاری نے ابن کنول کے افسانوں پر تفصیلی بحث کی۔ انھوں نے کہا کہ ابن کنول نے سب سے پہلے افسانہ لکھنا شروع کیا۔ ان کے مزاج میں داستانیں تھیں، اس کی وجہ سے ان کے مزاج میں یہ رنگ شامل ہوگیا تھا؛ جو ان کے افسانوں پر نظر آتا ہے۔ سمینار میں مہمان ذی وقار کے طور پر پروفیسر اسلم پرویز نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ابن کنول کو میں نے ہمیشہ مخلص، ایماندار اور دیانتدار محسوس کیا۔ میں نے بہت سے اساتذہ کی تدفین میں شرکت کی لیکن کہیں بھی

شاگردوں کی اتنی تعداد نہیں دیکھی؛ جتنی ابن کنول کے جنازے میں دیکھی۔ اس موقعے پر صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ ابن کنول دوستوں کے دوست اور خوش گفتار انسان تھے، شعر و سخن سے ان کا گہرا رشتہ تھا۔ انھوں نے ابن کنول کی ادبی سرگرمیوں پر تفصیلی گفتگو کی۔ اظہار تشکر ڈاکٹر ادریس احمد ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی نے پیش کیا۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر امتیاز احمد نے کی۔ اس یک روزہ قومی سمینار میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، مانو حیدرآباد، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی لکھنؤ، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جے این یو اور اگنو کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ابن کنول کی کتاب 'مزید شگفتگی' کی رسم اجرا بھی ادا کی گئی، جسے ابن کنول کی شریک حیات صبیحہ ناصر نے مرتب کیا ہے۔ سمینار میں جن مقالہ نگاروں نے مقالے پیش کیے ان میں ڈاکٹر ابوشہیم خان، ڈاکٹر افضل مصباحی، ڈاکٹر اکمل شاداب، ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی، ڈاکٹر یامین انصاری، ڈاکٹر عزیر اسرائیل، ڈاکٹر محمد ارشد، ڈاکٹر شمس الدین، ڈاکٹر وصی احمد اعظمی، ڈاکٹر عالیہ، ڈاکٹر نثار احمد، ڈاکٹر طفیل، ڈاکٹر عبدالحفیظ، ڈاکٹر غلام اخضر، شیزہ سہیل، واحدہ کوثر، ڈاکٹر امیر حمزہ، اشرف یاسین وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اس موقعے پر ابن کنول کی شریک حیات، صاحبزادیاں اور ملک کے کونے کونے سے ان کے چاہنے والے موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اکتوبر 2024

## مہجری فکشن: مسائل، موضوعات اور اسالیب

**نئی دھلی:** جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کے مرکز اور 'ورلڈ اردو ایسوسی ایشن' نئی دہلی

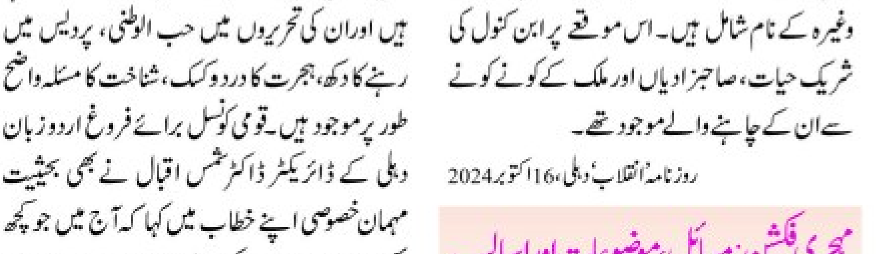

کے اشتراک سے 'مہجری فکشن: مسائل موضوعات اور اسالیب' کے موضوع پر یک روزہ سمینار کا اہتمام کیا گیا جس میں کل نو مقالے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر رضوان الحق نے اکیسویں صدی میں مہجری ادب کی ضرورت اور معنویت پر بھرپور روشنی ڈالی جب کہ نثار احمد نے ناول 'بالکنی' کے حوالے سے ہجرت اور کرب کی دردانگیز روداد کو پیش کیا۔ 'مقصود الٰہی شیخ کے افسانوں میں مہجری ادب' کے تحت نوید رضا نے ان کے افسانوں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا، اسی طرح دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر محمد اشرف اور اسعد اللہ، ریسرچ اسکالر جے این یو نے روبینہ فیصل کے ناول 'نارسائی' پر تجزیاتی مقالہ پیش کرتے ہوئے ناول کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ جب کہ شہلا کلیم اور ظہور احمد نے روبینہ فیصل کی افسانہ نگاری اور ان کی تحریروں میں نسائی آواز کو تلاش کرتے ہوئے مقالہ پڑھ کر داد و تحسین وصول کیا۔ رافعہ شبنم نے مہجری فکشن کے حوالے سے رضیہ فصیح احمد کی افسانہ نگاری اور انورادھا ورما نے جرمنی میں مقیم انور ظہیر رہبر کے فکشن پر تحقیقی مقالہ پیش کرتے ہوئے افسانہ اور فکشن کی فنی باریکیوں کا محاکمہ کیا۔ اس پروگرام کی صدارت کر رہے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ مہجری ادب سے مراد وہ ادب ہے جہاں ادیب ہجرت کر کے مستقل طور پر اسی ملک کی شہریت اختیار کر لیتے ہیں اور زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور ان کی تحریروں میں حب الوطنی، پردیس میں رہنے کا دکھ، ہجرت کا درد و کسک، شناخت کا مسئلہ واضح طور پر موجود ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے بھی بحیثیت مہمان خصوصی اپنے خطاب میں کہا کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں اس ادارے کی بدولت ہوں، جے این یو میں ہمیشہ بحث و مباحثے کی فضا سازگار رہی ہے یہاں کے طلبا اساتذہ کو بھی پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں وجہ یہ ہے کہ سوالات کرنے کی یہاں آزادی ہے۔ اپنے طالب علمی کے دور کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہمارے دور میں ڈاکٹر توحید خان صاحب ہم طلبا کی نہ صرف ادبی تربیت کرتے تھے بلکہ اسی طرح کے ادبی پلیٹ فارم مہیا کراتے تھے جس سے ہماری ادبی سرگرمی جاری رہتی تھیں۔ میں اس اہم پروگرام کے لیے آپ سبھوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور قومی کونسل ہر طرح کے تعاون کے لیے حاضر ہے۔ جے این یو کے فارسی شعبہ کے استاد پروفیسر اخلاق آہن نے کہا کہ اردو میں مہجری ادب ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔ ہجرت کے ضمن میں انھوں نے اپنی لکھی ہوئی ایک نظم بھی پیش کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر نصیب علی نے ادا کیے۔ سمینار کی نظامت محترمہ شہلا کلیم نے کی جب کہ شکریے کی رسم جناب طریق العابدین نے انجام ادا کی۔

پریس ریلیز: اسعد اللہ، جے این یو، نئی دہلی، 12 اکتوبر 2024

## جی ڈی چندن کی صحافت

**نئی دھلی:** معروف صحافی آنجہانی جی ڈی چندن کے 102 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام 'جی ڈی چندن کی صحافت' کے عنوان سے یک روزہ سمینار منعقد کیا گیا۔ سمینار کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ انھوں نے کہا کہ چندن صاحب انگریزی میں ایم اے تھے۔ جرنلزم میں ڈپلومہ کیا تھا۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے۔ قلمی اخبار بھی نکالے۔ ان کی تین کتابیں اردو صحافت کا سفر، جام جہاں نما اور چندن صاحب کی نادر تحریریں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر جناب عبدالماجد نظامی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ چندن صاحب زندگی بھر صحافت اور اردو کے فروغ کے لیے کام کرتے رہے۔ اس موقعے پر عبدالباری مسعود نے کہا کہ چندن صاحب اردو سے محبت کرتے تھے۔ آر این آئی کی رپورٹ کا تجزیہ کرتے تھے۔ اس موقعے پر معین شاداب نے اپنے مقالے میں کہا کہ چندن صاحب کی کتابیں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ صحافی کی زبان الگ ہوتی ہے۔ محقق کی زبان الگ ہوتی ہے۔ جام جہاں نما ان کی کتاب 1992 میں آئی۔ انھوں نے تحقیق سے ثابت کیا کہ وہ اردو کا پہلا اخبار تھا، اسے آج تک کوئی رد کرنے والا نہیں ہے۔

معصوم مرادآبادی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب اور زبان کے فروغ میں صحافیوں نے بڑا کام کیا ہے۔ چندن صاحب نے اپنا سارا وقت صحافت اور تحقیق میں لگایا۔ سہیل انجم نے اپنی تقریر میں کہا کہ جی ڈی چندن سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ وہ مولانا آزاد کے عقیدت مند تھے۔ وہ الہلال کو انگریزی اخبار کے ہم پلہ بلکہ اس سے بڑا مانتے تھے۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ چندن صاحب بہت محنتی انسان تھے۔ اپنا وقت پڑھنے لکھنے میں گزارتے تھے۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر یامین انصاری نے کی۔ انھوں نے کہا کہ غالب اکیڈمی ہر سال جی ڈی چندن کی یاد میں ایک جلسے یا سمینار کا اہتمام کرتی ہے جس میں اردو صحافت اور زبان پر سیر حاصل گفتگو ہوتی ہے۔ اس موقعے پر معصوم مرادآبادی کا مولفہ مونوگراف جی ڈی چندن کی رسم رونمائی ہوئی۔ سمینار کے آخر میں روزنامہ میرا وطن، صدائے انصاری، ہمارا سماج، اخبار مشرق سمیت دہلی کے مختلف اخباروں کے اردو صحافیوں، نامہ نگاروں اور فوٹو گرافوں کو مومنٹو تقسیم کیے گئے۔ اس سمینار میں متین امروہوی نے جی ڈی چندن کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 12 اکتوبر 2024

## غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام نثری نشست

**نئی دہلی:** غالب اکیڈمی نئی دہلی کے زیر اہتمام نثری نشست کا اہتمام اردو تحریک سے وابستہ صوفی غفران اشرفی کی صدارت میں کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ بہار میں اردو مشاعرے اور دوسری تقریبات ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے ادارے سے چار سو طرحی نشستیں منعقد ہو چکی ہیں، لیکن نثر کا رواج کم ہے۔ غالب اکیڈمی میں نثری اور شعری نشستیں ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے حضرت نظام الدین اولیا کی سیرت پر مضمون پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا نے حضرت امیر خسرو سے کہا تھا کہ مقامی زبانوں میں لکھا کرو۔ حضرت کے فرمان کی تکمیل میں حضرت امیر خسرو نے ہندوی میں شاعری کی۔ وہی اردو شاعری کا نقش اول ثابت ہوا۔ ٹی این بھارتی نے ایک اہم ثقافتی شخصیت جگدیش سوانی ناتھن پر مضمون پڑھا۔ عاشق الفاظ نے سفرنامے

کی اہمیت پر ایک مضمون پڑھا اور مصنوعی ذہانت کے فوائد پر روشنی ڈالی۔ شہزادی نے قسمت کے چمکتے ستارے کے عنوان سے اور گولڈی نے نئے انداز کی کہانی پیش کی۔ احترام صدیقی نے 'پہلا جھوٹ' کے عنوان سے اودھ کے نوابین کے تعلق سے ایک کہانی سنائی۔ پروین ویاس نے پڑھی گئی کہانیوں پر اظہار خیال کیا۔ ثروت عثمانی نے 'سن تو سہی' کے عنوان سے ایک دلچسپ کہانی پیش کی، جو دفتروں کے حاکموں کے کام کو ٹالنے کی عادت پر مبنی تھی۔ شاہد حبیب نے سیرت نبوی پر مشتمل کتاب 'ذکر ک' پر تبصرہ پیش کیا۔ مشہور ادیب، فکشن نقاد، براڈ کاسٹر ڈاکٹر مظہر محمود نے دوردرشن سے طویل وابستگی کی بنیاد پر کہا کہ دوردرشن کے لیے جو پروگرام بنائے جاتے ہیں وہ ٹارگیٹ آڈینس کے لیے بنائے جاتے ہیں جیسے کرشی درشن کسانوں کے لیے بزم اردو والوں کے لیے اور پتریکا کے پروگرام ہندی والوں کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ اسی طرح نثری اور شعری نشستوں کا بھی معاملہ ہے۔ دونوں کے سامعین کا حلقہ مختلف ہوتا ہے۔ سکریٹری کے شکریے کے ساتھ نشست ختم ہوئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 اکتوبر 2024

**اتر پردیش**

## ادب نواز محمد حامد علی کی یاد میں چار روزہ جلسہ

**گورکھپور:** اردو کے فروغ کے لیے مشترکہ کوشش ناگزیر بتاتے ہوئے رام منوہر لوہیا اور صفدر جنگ ہسپتال دہلی کے سابق سربراہ اعلیٰ شعبہ طب یونانی ڈاکٹر سید احمد خان نے کہا کہ اردو دنیا کی خوبصورت اور مہذب زبان ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب اپنی اس پیاری اور انمول زبان کو زندہ رکھنے اور آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔ میاں صاحب اسلامیہ انٹر کالج میں ساجد علی میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام ادب نواز اور سماجی کارکن محمد حامد علی کی یاد میں منعقدہ 4 روزہ جلسہ اردو کے افتتاحی پروگرام میں صدارتی خطبہ پیش کر رہے تھے۔ انھوں نے مرحوم محمد حامد علی کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں ان کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اردو کے سچے عاشق اور خادم ہونے کے ساتھ ہر ایک کو تعلیم کے زبردست علمبردار تھے۔ معروف معالج ڈاکٹر عزیز احمد نے کہا کہ اردو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی زبان ہے۔ جدوجہد آزادی میں اردو کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اسپیشل جوڈیشیل مجسٹریٹ عبدالرشید نے کہا کہ اردو ہندوستان کی اپنی زبان ہے، یہیں پلی بڑھی اور پروان چڑھی اور آج پوری دنیا میں معروف و مقبول ہے۔ اس موقعے پر لال ٹرسٹ کے سکریٹری راجیش سنگھ نے اردو و ہندی قارئین کی تعداد میں کمی پر تشویش کا اظہار کیا۔

ساجد علی میموریل کمیٹی کے سکریٹری محبوب سعید 'حارث' نے استقبالیہ کلمات پیش کیے اور کہا کہ جلسہ اردو کا واحد مقصد اردو زبان کو فروغ دینا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی ترقی تہذیب و ثقافت کی ترقی ہے اور اس کی تعلیم و ترقی کے لیے ضروری ہے۔ شاعر ماجد علی 'محشر' کے شعری مجموعہ 'کلام محشر' کے حوالے سے کہا کہ ان کی نظموں میں واہ اور آہ دونوں کا رنگ ہے۔ وہ سادہ اور آسان الفاظ میں ایسی باتیں کہتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والے حیران رہ جاتے تھے۔ 'کلام محشر' مرتب کر کے دادا اور والد حامد علی مرحوم کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کی کوشش ہے۔ پروگرام میں ڈاکٹر سید احمد خان کی اردو خدمات کے اعتراف میں توصیف نامہ اور مومنٹو پیش کر کے اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' گورکھپور، 11 ستمبر 2024

## اُنس بتاں

**لکھنؤ:** دبستان اہل قلم لکھنؤ کے زیر اہتمام ایک رباعی مشاعرہ بیاد خیام ہند نور محمد یاس اور آفتاب حسین درویش سندیلوی کا پہلا شعری مجموعہ 'انس بتاں' کی تقریب رسم اجرا کا انعقاد یو پی پریس کلب حضرت گنج لکھنؤ میں ہوا۔ پروگرام کی سرپرستی لندن سے مظفر احمد مظفر نے کی۔ شاعر وصحافی ڈاکٹر ہارون رشید نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ شعری مجموعہ انسِ بتاں پر اظہار خیال کرتے ہوئے واصف فاروقی نے کہا کہ آفتاب حسین کی شاعری میں غم دوراں غم جاناں کے ساتھ ساتھ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا بھی رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ صدر دبستانِ اہل قلم ڈاکٹر مخمور کاکوروی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ 'انس بتاں' آفتاب حسین درویش سندیلوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ جہاں تک ہم نے مطالعہ کیا تو آفتاب حسین درویش کی شاعری ان کے ہم عصر شعرا سے کچھ الگ ہٹ کر ہے۔ دہلی سے خصوصی طور پر شرکت کرنے والے مزاح نگار محمد علی علوی نے منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ شاہجہاں پور کی ادبی فضا کو شاداب رکھنے والے باکمال شاعر عشرت صغیر اور گونڈہ سے آئے عزم گونڈوی نے بھی منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔ صدر مشاعرہ ڈاکٹر سنجے مصرا شوق نے دبستانِ اہل قلم لکھنؤ کی اس کوشش کو سراہتے ہوئے کہا کہ رباعی کا یہ مشاعرہ اپنی نوعیت کا واحد مشاعرہ ہے جس میں اتنے رباعی گو شعرا ایک ساتھ جمع ہیں۔ اس تقریب رسم اجرا نے محفل کو دوآتشہ بنا دیا۔ اس موقعے پر دبستانِ اہل قلم لکھنؤ کی جانب سے ڈاکٹر سنجے مصرا شوق کی ادبی وشعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے نور محمد یاس ایوارڈ اور شاعر آفتاب درویش سندیلوی کو وجاہت علی سندیلوی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ جن شعرا نے رباعیاں پیش کیں ان میں ڈاکٹر سنجے مصرا شوق، پروفیسر عباس رضا نیر، ڈاکٹر مخمور کاکوروی، واصف فاروقی، فیاض لکھنوی، عشرت صغیر شاہجہاں پوری، مجیب صدیقی کرنیل گنجوی، یعقوب عزم گونڈوی، نفیس سیتاپوری، تنویر نگروری، یاور اناوی، سید ضیاء کاظم تقوی، ڈاکٹر رضوان الرضا، مظہر حسین تاج لکھنوی، سروش لکھنوی، مسلم حسین لکھنوی، عاصم ملیح آبادی، ڈاکٹر ہارون رشید، محشر گونڈوی، معید رہبر لکھنوی، اور فیض خان وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 اکتوبر 2024

## شعبۂ اردو، اے ایم یو میں سرسید تقریب کا اہتمام

**علی گڑھ:** شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رشید احمد صدیقی آڈیٹوریم میں بزم شہریار کے تحت سرسید تقریب کا اہتمام کیا گیا، جس میں طلبہ اور اساتذہ نے سرسید کو تحریری، تقریری اور منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر محمد خالد سیف اللہ نے بزم شہریار کے تحت منعقدہ اس تقریب کے سلسلے میں کہا کہ اس کے ذریعے ہم نہ صرف بانی درس گاہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں بلکہ ان کے افکار و خیالات اور عقائد و مسلمات سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ شعبہ اردو کے صدر پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے اپنے خطاب میں کہا کہ جب بڑے لوگ اپنے افکار کی محفل سجاتے ہیں اور اپنے اعمال و کردار سے کسی منصوبہ کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں تو وقت گزرنے کے ساتھ ان کی محفل کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ سرسید ہمارے ان محسنوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے افکار و اعمال سے قوم کی تقدیر بدل دی۔ تقریب کے صدر پروفیسر طارق چھتاری نے اپنے خطاب میں کہا کہ سرسید کے وژن پر اگر ہم غور کریں تو دو باتیں راست طور پر سمجھ میں آتی ہیں، ایک تو یہ کہ ہم جو بھی کام کریں وہ اعلیٰ درجہ کا ہو، دوم یہ کہ اس کا اعلیٰ مقصد ہو۔ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر امتیاز احمد نے 'مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی سرسید شناسی' موضوع پر مقالہ پڑھا۔ اس پروگرام میں شعبے کے طالب علم عبدالرحیم، گل فراز عالم، عرشیل احمد، محمد بلال اسریٰ انجلی، علم اریب عثمانی، نائلہ معین، عمران حسین، وقاص اختر، سمیع اللہ، محمد عامر، شارق قمر وغیرہ نے مقالے اور سرسید سے متعلق تحریریں پیش کیں۔ شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی نے پروگرام کی نظامت کی، جب کہ ڈاکٹر معید رشیدی کے شکریہ پر اس محفل کا اختتام ہوا۔ پروگرام میں شعبہ اسٹریٹیجک اسٹڈیز کے استاد پروفیسر آفتاب عالم کے علاوہ شعبہ کے اساتذہ، ریسرچ اسکالر اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 اکتوبر 2024

## سہ روزہ جشن سرسید تقریبات اختتام پذیر

**میرٹھ:** شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ اور سرسید ایجوکیشنل سوسائٹی اور مشن شکتی فیز 5، مہیلا ادھین کیندر کے اشتراک سے مفکر قوم، معروف دانشور اور ماہر تعلیم سرسید احمد خاں کے یوم پیدائش کے موقعے پر جشن سرسید کے تیسرے دن شعبے کے پریم چند سیمینار ہال میں اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر خواجہ شاہد نے کہا کہ سرسید مشن کے تحت ایک ایک بچے کو تعلیم کی جانب لانا چاہیے۔ آج اردو میں تحقیق کا معیار گر رہا ہے۔ سرسید کی تحقیق سے ہمیں سبق لینا چاہیے، جس کی مثال 'آثار الصنادید' ہے۔ استقبال ڈاکٹر شاداب علیم، شکریہ آفاق احمد خاں نے اور نظامت ڈاکٹر آصف علی نے کی۔ صبح دس بجے سے شعبۂ اردو کے پریم چند سیمینار ہال میں تقریری مقابلہ بعنوان 'سرسید اور علی گڑھ تحریک' کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں میرٹھ گرلز انٹر کالج، اسماعیل پبلک اسکول اور عقیل فاطمہ میموریل پبلک اسکول کے طلبا و طالبات نے حصہ لیا۔ اس موقعے پر تین ایوارڈ تقسیم کیے گئے جن میں سرسید انٹرنیشنل ایوارڈ برائے مجموعی خدمات انقلاب گروپ، سرسید نیشنل ایوارڈ برائے سماجی خدمات وی کمٹ سوسائٹی میرٹھ اور سرسید نیشنل ایوارڈ برائے ادبی خدمات پروفیسر خواجہ اکرام لدین کو دیے گئے۔ ایوارڈ یافتگان کا تعارف ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے پیش کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ جب سے شعبہ اردو قائم ہوا ہے ہم نے مغربی اتر پردیش کے تقریباً آٹھ اضلاع کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیز کے مختلف شعبوں میں سرسید کے تعلق سے مختلف پروگرام مثلاً قومی و بین الاقوامی سیمینار، سرسید کوئز، تحریری و تقریری مقابلے، بیت بازی اور سرسید لیکچر سیریز کے ذریعے نئی نسل تک سرسید کے کارناموں کو پہنچانے کا کام کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 اکتوبر 2024

## کتابوں کا تاج محل رضا لائبریری

**رامپور:** رضا لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر پشکر مشرا نے پریس کانفرنس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ آج رامپور رضا لائبریری کی عمارت کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ پر باریکی سے بات چیت کی گئی۔ ہر ایک نے سوچا کہ رامپور رضا لائبریری کے عالمی وژن کو عالمی سطح پر کیسے لے جایا جائے۔ اجلاس میں سب کی بنیادی رائے یہ تھی کہ ہندوستان کے پاس رامپور رضا لائبریری کی صورت میں ایک بہت بڑا ورثہ ہے۔ اس لیے

میٹنگ میں موجود سبھی نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور ایک منصوبہ بنایا کہ کتابوں کا تاج محل رامپور رضا لائبریری کس طرح اپنی کثیر لسانی، کثیر الثقافتی شناخت کو پوری دنیا میں لے جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گورنر رضا لائبریری کو عالمی سطح پر اس کا مناسب مقام دلانے کے لیے پوری طرح پرعزم ہیں۔ گورنر اترپردیش نے اس موقعے پر نمائش میں رکھے گئے مخطوطات میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ فارسی زبان کے مخطوطہ کے انداز میں کلیلہ دمنہ (ابوالمعالی نصراللہ کی لکھی گئی ہندوستانی پنچ تنتر کہانیوں پر مبنی تصویری مخطوطہ جو کہ 1510 میں لکھی گئی تھی) کو رکھا جائے گا۔ بچوں کے لیے ایک سیکشن بنایا جائے۔ اترپردیش کے گورنر نے کہا کہ لائبریری میں رکھی گئی کتابوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا جانا چاہیے تاکہ علم کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جاسکے۔ نایاب پینٹنگ اور دیگر مخطوطات کے البم کا بھی معائنہ کیا۔ اس کے بعد رنگ محل کے میٹنگ ہال میں رضا لائبریری کی ترقی و توسیع کے حوالے سے جائزہ بھی لیا۔ اتر پریش کے گورنر اور رام پور رضا لائبریری اور میوزیم بورڈ کی چیئر پرسن محترمہ آنندی بین پٹیل نے تمام تجاویز کو منظوری دیتے ہوئے کہا کہ رام پور رضا لائبریری کو عالمی سطح پر لے جانا وزیراعظم نریندر مودی کا خواب ہے۔ واضح رہے کہ وزیراعظم نریندر مودی نے ڈائرکٹر ڈاکٹر پشکر مشرا کو خصوصی طور پر رضا لائبریری میں اس کی افادیت اور ترقی و ترویج کے لیے بھیجا ہے۔ ان کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے وہ کوشاں ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 اکتوبر 2024

**بہار**

## جدید اردو نظم: سمت و رفتار

**پٹنہ:** ہم عصر نظموں میں ملکی اور عالمی مسائل پر ایسی

نظمیں کہی جارہی ہیں، جن میں زندگی اور اس کی بقا کی فکر زیادہ ہے۔ کووڈ وبا، تانیثیت وغیرہ کو بنیاد بناکر انسانی زندگی اور انسانی وسائل پر نظمیں کہی جارہی ہیں۔ نئی نظم کے شاعروں کی ذمے داریاں پہلے کے شاعروں کے مقابلے زیادہ ہیں۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے استاد پروفیسر ندیم احمد نے شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے زیراہتمام منعقدہ یک روزہ قومی سمینار سے کیا۔ 'جدید اردو نظم: سمت و رفتار' کے عنوان سے منعقدہ اس سمینار کی صدارت امتیاز احمد کریمی کررہے تھے۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات میں نو منتخب اردو اساتذہ کو ان کی ذمے داری کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ آپ اپنے بچوں کو اردو نظم، غزل، شعر، نثر سب کچھ پڑھائیں۔ اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر محسن رضا رضوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ میری نگاہ میں جدید نظم کی ابتدا نظیر اکبرآبادی سے ہوتی ہے، مگر انجمن پنجاب نے اسے ایک قطعی شکل عطا کی ہے۔ اقبال نے جدید نظم کو ایک واضح اور نمایاں شکل دی ہے۔ معروف فکشن نگار، ڈرامہ نگار اور شاعر ڈاکٹر قاسم خورشید نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ جدید نظم کی ابتدا کہیں سے کریں، میری نگاہ میں جدید نظم وہ ہے جس میں ہم عصریت ہو، جس میں انسان اپنے حالات اور جذبات کا ادراک کرسکے۔ ان خطابات سے قبل ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے مہمانوں کا تعارف کرایا اور موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے گزشتہ پچاس برسوں میں جدید نظم کے ارتقا پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے متعدد نظم گو شعرا کا ذکر کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا کہ جدید نظم موضوعات و اسالیب کے تنوع اور جدت کے باوجود ہم عصر تنقیدی مباحث میں مرکزی مقام کیوں نہیں حاصل کرپارہی ہے؟ اخیر میں صدر شعبہ ڈاکٹر سورج دیو سنگھ نے تمام مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر محمد عطاءاللہ شمسی نے کی۔

پریس ریلیز: شعبۂ اردو، پٹنہ، 6 اکتوبر 2024

**پنجاب**

## اردو ادب کے فروغ کے تعلق سے ادبی نشست

**مالیرکوٹلہ:** مالیرکوٹلہ کے ستار منزل میں ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ستار احمد نے کی۔ مہمان ذی وقار کے طور پر صوبہ پنجاب کے سابق وزیر اسپورٹ نصرت علی خان نے شرکت کی۔ پروگرام میں محمد قاسم مالیرکوٹلہ، ارشاد خان کیرانوی، دلشاد خاں، سادو پٹھان کیرانوی، آصف مالیرکوٹلہ اور عرفان مالیرکوٹلہ نے قومی یکجہتی و اردو ادب کے فروغ سے متعلق منظوم کلام پیش کیے۔ اس موقعے پر نصرت علی خاں نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو ملک میں رابطے کی زبان رہی ہے۔ اردو کا مستقبل روشن ہے، اردو ملک میں کشمیر سے کنیا کماری تک بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ یہ کسی ایک طبقے یا فرقے کی زبان نہیں ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 اکتوبر 2024

**تلنگانہ**

## آصف جاہی دور حکومت ایک جائزہ

شعبہ عربی ویمنس یونیورسٹی کوٹھی کے زیراہتمام سہ روزہ بین الاقوامی سمینار بعنوان آصف جاہی دور حکومت ایک جائزہ، (منظور شدہ تلنگانہ کونسل آف ہائر ایجوکیشن) کا 8 تا 10 اکتوبر 2024 کامیاب انعقاد عمل میں آیا۔ پروفیسر خالد اطرش، نامور اسلامک اسکالر سیریا مہمان خصوصی تھے۔ پروفیسر سید جہانگیر صدر شعبہ عربی وسابق ڈین عرب اینڈ ایشین اسٹڈیز انگلش اینڈ فارن لینگویجز یونیورسٹی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ آصف جاہی خاندان کے بادشاہوں کے کارنامے وقیع و سیع اور ارفع ہیں۔ محبوب علی پاشاہ، عثمان علی پاشاہ نے اردو تعلیم کے کئی ادارے قائم کیے۔ اس کے علاوہ ان بادشاہوں نے فارسی زبان کے فروغ میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کے قائم کردہ اسکول آج بھی کامیابی سے چل رہے ہیں۔ اس اجلاس میں 2022 میں منعقدہ بین الاقوامی سمینار، بعنوان مولانا ابوالکلام آزاد: جدید ہندوستان کے معمار، میں پیش کردہ مقالہ جات کی رسم اجرا عمل میں آئی جس کو ڈاکٹر سید شجاع الدین قادری صدر شعبہ عربی نے ترتیب دیا۔ ڈاکٹر شجاع الدین قادری صدر شعبہ عربی ویمنس یونیورسٹی کوٹھی و کوآرڈینیٹر سمینار

نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ شعبہ عربی کی جانب سے یہ آٹھواں سمینار ہے۔اس سے قبل 5 بین الاقوامی اور 2 قومی سمینارز مختلف عناوین پر منعقد کیے گئے ہیں اور تمام ہی سمینارز کے مقالہ جات کتب کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر سید انعام الرحمٰن نیوز فری لانس جرنلسٹ الکٹرانک و پرنٹ میڈیا مہمان اعزازی نے خطاب میں کہا کہ آصف جاہی خاندان کی حکومت کا قیام 1724 میں عمل میں آیا۔اور 1948 میں اختتام پذیر ہوا۔ ان 224 سالہ دور حکمرانی میں آصف جاہی بادشاہوں نے فراخ دلی سے عوامی فلاح و بہبود کے بے مثال کارنامے انجام دیے۔ پروفیسر سید علیم اشرف جائسی صدر شعبہ عربی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جب میں لیبیا میں تھا تو دائرۃ المعارف ادارہ کی شہرت سے متاثر ہو کر لوگ مجھ سے پوچھتے تھے۔ اس علمی ادارہ کی شہرت ومقبولیت دنیا میں مشہور تھی۔ کیپٹن ایل پانڈورنگا ریڈی نے کہا کہ میں حیدرآباد دکن میں 75 سال سے ہوں اور یہاں کی تہذیب وتمدن اور آصف جاہی بادشاہوں کے کارنامے دنیا میں شہرت رکھتے تھے۔

ڈاکٹر اے کے گوئل آئی اے ایس ریٹائرڈ پراجیکٹ کوآرڈی نیٹر تلنگانہ نے کہا کہ احمد نگر کی چاند بی بی کی بھانجی ماہ لقا چندا بائی ماہر موسیقی، خطاطی اور علمی و کتب کی دلدادہ تھی۔ کتب خانے قائم کیے، تعلیمی اداروں کے لیے اپنی ذاتی زمین جامعہ عثمانیہ نامپلی گرلز کالج کو دے دی۔ پروفیسر خالد اطرش کویت یونیورسٹی نے کہا کہ سمینار طلبہ واسکالر کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ اس سمینار کے ذریعے ان کو بہت کچھ سیکھنے اور آصف جاہی حکمرانوں کے عظیم الشان کارناموں کو سمجھنے کا موقع ملا۔

اختتامی سیشن کے علاوہ جملہ پانچ سیشنوں میں 35 مقالے مختلف متنوع موضوعات پر آصف جاہی خاندان کے حکمرانوں بادشاہوں کے تعلق سے پیش کیے گئے۔

رپورٹ: ڈاکٹر محمد ناظم علی سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ واکیڈمک سینٹ ممبر تلنگانہ، یونیورسٹی، 20 اکتوبر 2024

**راجستھان**

## 'اردو رامائن' پر مباحثہ

**بیکانیر:** محفل ادب کے زیر اہتمام ہوٹل مرودھر ہیریٹیج میں بیکانیر میں 1935 میں تخلیق شدہ 'اردو رامائن' پر

29 اکتوبر ادبی مباحثہ ہوا۔اس موقعے پر ڈاکٹر ضیاء الحسن قادری نے بتایا کہ 1935 میں بنارس ہندو یونیورسٹی نے تلسی داس جینتی کے موقع پر اردو میں رامائن نظم لکھنے کا کل ہند سطح پر مقابلے کا انعقاد کیا جس میں بادشاہ حسین خاں رعنا لکھنوی جو اس وقت بیکانیر میں اردو کے پروفیسر تھے، نے اردو میں 'رامائن' نظم لکھ کر بنارس بھیجی جس نے پورے ملک میں اول مقام حاصل کیا جس کے صلے میں بنارس ہندو یونیورسٹی نے انھیں گولڈ میڈل سے نوازا۔ مہاراجہ آف بیکانیر گنگا سنگھ نے ناگری بھنڈار، بیکانیر میں ایک عظیم الشان پروگرام منعقد کر کے رعنا صاحب سے اردو رامائن سنی۔ یہیں پر اردو کے معروف ادیب سر تیج بہادر سپرو نے یونیورسٹی کی طرف سے رعنا صاحب کو گولڈ میڈل پیش کیا۔ ذاکر حسین کالج، دہلی کے پروفیسر ڈاکٹر مکل چترویدی نے اردو رامائن کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الحسن قادری، ذاکر ادیب واسد علی اسد نے اس رامائن پر مدلل وموثر اظہار خیال کیا جسے سامعین نے بے حد پسند کیا اور نظم کے متعدد اشعار کو بار بار سننے کی فرمائش کی۔

پروگرام کی صدارت فرماتے ہوئے حاجی مقصود احمد، سابق میئر، بیکانیر نے کہا کہ رعنا صاحب کی تحریر کردہ یہ اردو رامائن فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور لسانی ایکتا کی علامت ہے۔اس کے توسط سے بیکانیر سے یہ مثبت پیغام پورے ملک میں پہنچا ہے۔ مہمان خصوصی انجینئر نرمل کمار شرما نے کہا کہ تنظیم 2012 سے مسلسل پروگرام منعقد کر رہی ہے جو کہ قابل تعریف عمل ہے۔انھوں نے کہا کہ ایسے پروگرام ہماری مشترکہ تہذیب کے فروغ کی علامت ہیں۔اس موقع پر جگل کشور پروہت، عبدالشکور سسودیا، عبدالجبار جذبی، امر جنونی، منجل مکل ورما وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ضیاء الحسن قادری نے بحسن و خوبی انجام دیے۔

پریس ریلیز: ضیاء الحسن، بیکانیر، 29 اکتوبر 2024

**کرناٹک**

## محمود یوسف بیدری کا توسیعی لکچر

**بیدر:** اردو عالمی سطح کی مقبول زبان ہے، اسے حصول علم کے لیے استعمال کرتے ہوئے اردو میں دیگر زبانوں کے ادبی وسائنسی سرمایے کو ترجمے کے ذریعے منتقل کیا جائے۔ طلبا اپنی مادری زبان اردو سے محبت کریں اور اس کے ادب اور علوم کو سماج میں عام کریں۔ ان خیالات کا اظہار بیدر سے آئے ادیب صحافی شاعر و مترجم جناب محمد یوسف رحیم بیدری نے اپنے ایک توسیعی لیکچر کے دوران کیا۔ قبل ازیں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے یوسف رحیم بیدری کا خیر مقدم کیا اور ان کی علمی وادبی صحافتی وشعری خدمات سے کالج کے طلبا کو واقف کرایا۔ محمد یوسف رحیم بیدری نے طلبا کو مشورہ دیا کہ وہ اردو کے معیاری ادب کا مطالعہ کریں۔ اساتذہ سے اچھی اردو سنیں اور اپنی اردو زبان دانی کو بہتر بناتے ہوئے اپنے خیالات کو اردو میں میڈیا کے ذریعے پیش کریں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 اکتوبر 2024

**مہاراشٹر**

## اکولہ میں جشنِ ڈاکٹر یحییٰ نشیط

**اکولہ:** اردو زبان کے معروف محقق اور درجنوں کتابوں کے مصنف ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کی پچاس سالہ ادبی وعلمی خدمات کے اعتراف میں کوہ نور فنکشن ہال اکولہ میں عظیم الشان یک روزہ جشن ڈاکٹر یحییٰ نشیط کا انعقاد کیا گیا۔ وابستگان بال بھارتی پونہ کے زیر اہتمام اور اردو لرنرز گروپ مہاراشٹر نیز مجلسِ استقبالیہ کے اشتراک سے منعقد اس جشن کی صدارت ماہر اسلامیات پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے فرمائی۔ معروف ادیب ڈاکٹر ناصر الدین انصار نے خطبہ استقبالیہ میں شرکا کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں یہ چلن بڑھتا جا رہا ہے کہ اہل علم کی ان کی زندگی ہی میں قدر افزائی نہیں کی جاتی بلکہ ان کے مرنے کے بعد تعزیتی نشست منعقد کی جاتی ہے۔ ہم نے مہاراشٹر میں اس روش کو بدلنے کی کوشش کی ہے اور آج کا یہ جشن اس سلسلے کی تیسری تقریب ہے۔ بعد ازاں بال بھارتی پونہ کے اردو افسر خان نوید الحق نے صاحبِ جشن کا تفصیلی تعارف

پیش کیا۔ اس موقعے پر مجلسِ استقبالیہ کی جانب سے پروفیسر اختر الواسع کو نشانِ سپاس اور ڈاکٹر یحییٰ نشیط کو کمالِ فن ایوارڈ تفویض کیے گئے، نیز صاحبِ جشن کی خدمت میں کیسہ زر بھی پیش کیا گیا۔ اس تقریب میں روزنامہ انقلاب ممبئی کے مدیرِ اعلیٰ شاہد لطیف کے ہاتھوں صاحبِ جشن کی شخصیت اور فن پر ڈاکٹر ناصر الدین انصار کی مرتب کردہ کتاب مردِ خوب آگاہ کی رسمِ رونمائی انجام پذیر ہوئی۔ اس موقعے پر پدم شری اختر الواسع، شاہد لطیف، سلیم شہزاد مالیگاؤں، ڈاکٹر شرف الدین ساحل ناگپور، پروفیسر نعمان خان بھوپال، مفتی اشفاق قاسمی اکولہ، ڈاکٹر محمد اسد اللہ ناگپور، ڈاکٹر غلام نبی مومن کلیان، ریان فردوس کل گاؤں اور اعظمی محمد یاسین نے صاحبِ جشن کی کی شخصیت اور خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ مجلسِ استقبالیہ نے اس جشن کو مزید یادگار نیز جشنِ اردو میں تبدیل کرنے کے لیے چند ثقافتی تقاریب بھی منعقد کی تھیں جن میں ڈاکٹر وسیم خان کی پیش کردہ قدیم مخطوطات اور کتابوں کی نمائش قاضی رضوان کے ذریعے عہد تغلق، عہد مغلیہ، عہد قطب شاہی، عہد آصف جاہی اور نوابینِ برار کے دور کے سکّوں کی نمائش، صابر شیخ اور مغفور احمد کے ذریعے پیش کردہ خطاطی کی نمائش نیز کل ہند محفل مشاعرہ جیسی ثقافتی تقاریب شامل تھیں۔ اس جشن میں ملک بھر سے دو سو سے زیادہ ادیب، قلم کار، شاعر اور اردو اسکالرز نے شرکت کی۔ مختلف تقریبات کی نظامت کے فرائض فاروق مدیر سید گل بوٹے ممبئی، ابرار کاشف اور ضمیر احمد ضمیر نے انجام دیے۔ اظہارِ تشکر ڈاکٹر محسن امین نے کیا۔

پریس ریلیز: نصیر الدین انصار، اکولہ، 10 اکتوبر 2024

## گوونڈی میں شعری وافسانوی نشست

**گوونڈی:** افسانوی ادب میں منی کہانیوں کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ منی کہانیاں یا افسانچے طویل افسانوں

کے مقابلے زیادہ محنت اور وقت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اس طرح کے خیالات کا اظہار اردو کے معروف تنقید نگار محمد اسلم پرویز نے گوونڈی میں منعقد ایک شعری وافسانوی نشست میں کیا۔ واضح رہے کہ اردو چینل کی جانب سے گوونڈی، ممبئی میں نوجوان افسانہ نگار محمد علیم اسماعیل اور اسماعیل گوہر کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام 8 اکتوبر 2024 کیا گیا۔ اس نشست کی صدارت مشہور شاعر اور مترجم قاسم ندیم نے کی۔ اس موقعے پر صاحب اعزاز محمد علیم اسماعیل کے افسانچوں کی کتاب 'تماشا' کی رسم رونمائی انور مرزا اور ڈاکٹر ذاکر خان ذاکر کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ڈاکٹر قمر صدیقی نے ابتدائی کلمات پیش کیے۔ اپنے خطاب میں انھوں نے معاصر تخلیقی ادب کا اجمالی جائزہ لیا اور ترویج ادب میں ادبی نشستوں کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی۔ بہ حیثیت تخلیق کار علیم اسماعیل اور اسماعیل گوہر کے علاوہ انور مرزا، قاسم ندیم، ڈاکٹر قمر صدیقی، ڈاکٹر ذاکر خان ذاکر، شاداب رشید، مقصود آفاق، محتشم اکبر، توصیف کاتب، کیف بنارسی، مدثر علی، اخلاق ساحر، معشوق احمد اور وسیم عقیل شاہ نے اپنی شعری وافسانوی تخلیقات سامعین کے روبرو پیش کی۔ قاسم ندیم نے اپنے صدارتی خطاب میں پیش کیے گئے شعری کلام اور افسانوں پر جامع انداز میں اظہار خیال کیا نیز کامیاب تخلیقی ادب کے تقاضوں کو مختلف مثالوں سے واشگاف کیا۔ نظامت کے فرائض مقصود آفاق نے بہ حسن وخوبی انجام دیے۔ اس نشست میں ادب دوست احباب نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

پریس ریلیز: محمد علیم اسماعیل، گوونڈی، 19 اکتوبر 2024

### اعزاز و اکرام

## قلم ویر چکر 2024 اور قلم ویر رتن سمان 2024

**لکھنؤ:** لکھنؤ کے ممتاز سینئر ادیب اور صحافی ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی کے یوم پیدائش کے موقعے پر 44واں قومی کلام ویر دیوس میڈیا فاؤنڈیشن اودھ ساہتیہ اکادمی، اکھل بھارتیہ اگیت پریشد اور نوسرجن وغیرہ تنظیموں کے زیر اہتمام بڑے جوش وخروش کے ساتھ اتر پردیش ہندی سنستھان میں منایا گیا جس میں ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی جس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر وی جی گوسوامی سابق ڈین فیکلٹی آف لکھنؤ یونیورسٹی نے کی، انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی کی شخصیت میں مجھے ادب کا وقار، صحافت کی چمک اور ایک عالمی سطح پر پیار کرنے والے معاشرے کی تعمیر کی فکر نظر آتی ہے۔ تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے راجیہ سبھا کے رکن پارلیمنٹ ڈاکٹر دنیش شرما سابق نائب وزیر اعلیٰ اتر پردیش نے کہا کہ جہاں ادب نے ہمیشہ سماج کو نئی جہتیں فراہم کی ہیں وہیں صحافت ہمیشہ سے ہی معاشرے کا آئینہ دار رہی ہے۔ ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی صحافت اور ادب کے ساتھ ساتھ سماج کے لیے جانا پہچانا ممتاز نام ہے۔ پروفیسر یشپال سنگھ ہاپوڑ نے کہا کہ ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی کا کئی زبانوں پر عبور ہے۔ ادیب، صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محقق، دیانت دار اور بے مثال سماجی کارکن ہیں۔ اس سال جن شخصیات کو 'قلم ویر چکر 2024' سے نوازا گیا ان میں پدم شری ڈاکٹر ودیا بندو سنگھ، شری آتما پرکاش مشرا (ڈائریکٹر دوردرشن، لکھنؤ)، اردو کے سینئر صحافی شری ابراہیم علوی (سینئر صحافی)، شری شرت پردھان، پروفیسر ڈاکٹر یشپال سنگھ (ہاپوڑ)، سینئر صحافی مسٹر ہیمنت تیواری (صدر اتر پردیش مانتا پراپت سنواد داتا سمیتی)، سینئر ادیب مسٹر اکھلیش مشرا (آئی اے ایس) اور 'قلم ویر رتن سمان 2024' کے لیے صحافی اور ادیب جناب نول کانت سنہا، مسٹر انل مشرا (ایڈیٹر اتر پردیش ہندی سنستھان)، ڈاکٹر ستیہ دیو پرساد دویدی پاٹھک، ڈاکٹر شیو منگل سنگھ منگل، پروفیسر ڈاکٹر امیت گوئل، صحافی مسٹر زبیر احمد، مسٹر نریندر بھوشن، ڈاکٹر آدرش ترپاٹھی، ڈاکٹر صفت الزہرہ، منو باجپئی کے ساتھ 'ستیا' قلم ویر سمان 2024 کے ڈاکٹر رنگناتھ مشرا کی یاد میں 'صحافی شری جمیل ملک اور ہندی اور اردو کے سینئر ادیب' شری رمن لال اگوال اسمرتی سمان 2024 میجر جنرل شری اے کے چترویدی کے ساتھ ہی مشہور غزل گائیک مسٹر متھلیش لکھنوی اور یونانی اور آیورویدک کے سینئر ڈاکٹر ڈاکٹر محمد فرید خان کو بھی اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر اتر پردیش کے تسلیم شدہ نامہ نگار کمیٹی کے تمام نومنتخب عہدیداروں کو بھی اعزاز سے نوازا گیا۔ اس تقریب میں تمام ادبا اور صحافیوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ جلسہ کے کنوینر ڈاکٹر یوگیش گپت اور نظامت ڈاکٹر سدھا مشرا نے کی۔ مہمانوں کا شکریہ شاہ ذیب ہاشمی نے کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 اکتوبر 2024

## جنوبی کورین مصنفہ ہن کانگ ادب کے نوبیل انعام سے سرفراز

**سیول:** ادب کے شعبے میں جنوبی کورین ناول نگار 'ہن کانگ' کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس بار انھیں نوبیل انعام سے نوازنے کا اعلان کیا گیا ہے۔

اس سال نوبیل انعام برائے ادب 2024 کا فیصلہ کرنے والی رائل سویڈش اکیڈمی کے مطابق جنوبی کوریا سے تعلق رکھنے والی ہن کانگ کو یہ انعام ان کی شاعرانہ نثر کے لیے دیا جارہا ہے جو احساسات سے بھری ہوئی ہے، جس میں تاریخی صدمات اور انسانی زندگی کی ناپائیداری کی منظرکشی کی گئی ہے۔ رائل سویڈش اکیڈمی کی ویب سائٹ کے مطابق جنوبی کورین مصنفہ ہن کانگ ادبی پس منظر رکھتی ہیں جب کہ ان کے والد بھی ایک ناول نگار تھے۔ ہن کانگ 1970 میں جنوبی کوریا کے شہر گوانگجو میں پیدا ہوئیں اور نو برس کی عمر میں دارالحکومت سیول منتقل ہوگئی تھیں، وہ تحریر و تصنیف کے ساتھ ساتھ موسیقی سے بھی گہرا شغف رکھتی ہیں جس کا اثر ان کے ادبی شہ پاروں میں واضح ہے۔ 1993 میں انھوں نے بطور شاعرہ اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ دو برس بعد ہی ان کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ شائع ہوا۔ 2007 میں ان کے ناول 'دی ویجیٹیرین' سے انھیں عالمی سطح پر شہرت حاصل ہوئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اکتوبر 2024

## افضل منگلوری

**دیوبند:** اتراکھنڈ اردو اکیڈمی کے سابق نائب صدر

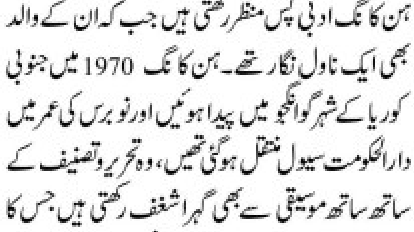

اور بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر افضل منگلوری کو ان کی شاعری اور اردو ادب کی ترقی میں ان کے قابل ذکر تعاون اور صوفیانہ روایات کو برقرار رکھنے جیسی خدمات کے صلہ میں اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ نئی دہلی کے میوروہار میں واقع ریور سائڈ اسپورٹس کلب میں اردو ہندی ادبی سنگم سنستھا کی جانب سے منعقد 'جشن افضل منگلوری' میں دانشوروں، تعلیمی شخصیات اور سماجی کارکنان نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ایک شعری نشست بھی منعقد کی گئی۔

پدم شری پروفیسر اخترالواسع نے پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ افضل منگلوری کی ہمہ گیر شخصیت ایک خصوصی پہچان رکھتی ہے۔ افضل منگلوری نے شاعری کو نئی نسل تک پہنچانے میں خاص کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ صوفیانہ روایات کو آگے بڑھانے میں انھوں نے ایماندارانہ جدوجہد کی اور اس میں کامیابی حاصل کی۔ دہلی کے اے سی پی آدیش تیاگی نے افضل منگلوری کی ادبی، سماجی اور صحافتی خدمات کا تذکرہ کیا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی آئی اے ایس اکیڈمی دہرادون کے ڈائرکٹر آر اے خان نے کہا کہ افضل منگلوری نے اپنی زندگی ادبی خدمات کے لیے وقف کردی ہے۔ اردو ہندی ادبی سنگم سنستھا کے صدر طالب رامپوری نے کہا کہ افضل منگلوری کم عمری سے ہی امیر خسرو کی شاعری سے متاثر ہوکر شاعری کررہے ہیں اور انھوں نے نصف صدی کی مدت عبور کرتے کرتے عالمی سطح پر شہرت پائی ہے۔ مشہور شاعر معین شاداب نے کہا کہ افضل منگلوری کو شاعری اور صوفیانہ روایات ورثے میں ملی ہیں۔ پروگرام میں موجود ادبی، تعلیمی، سماجی شخصیات نے بھی ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 اکتوبر 2024

## ڈاکٹر ظہیر آفاق

مدراس یونیورسٹی میں 'انجمن ابنائے قدیم برائے

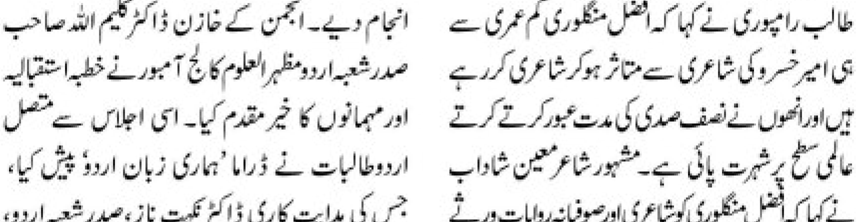

اردو' کو منفرد مقام حاصل ہے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ہر سال 2 اکتوبر کو سالانہ اجلاس نہایت ہی تزک واحتشام کے ساتھ منعقد کیا جاتا ہے، جس میں ابنائے قدیم کے علاوہ مشہور ادبا و شعرا حضرات بھی مدعو تھے۔ انجمن کے زیر اہتمام ہر سال 'خادم اردو' ایوارڈ پیش کیا جاتا ہے۔ اس سال تمل ناڈو کے معروف ادیب وشاعر اور ڈراما نگار ڈاکٹر ظہیر آفاق کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 'خادم اردو ایوارڈ برائے 2024' پیش کیا گیا۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی جناب اے محمد اشرف، چیرمین میاسی اردو اکادمی چنئی نے اردو زبان کی اہمیت وافادیت پر زور دیتے ہوئے شعبہ اردو مدراس یونیورسٹی کی کارگزاریوں کو سراہا۔ مہمان اعزازی پروفیسر قاضی حبیب احمد، سابق صدر شعبہ عربی فارسی واردو نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہر ایک ادارے کی کامیابی اور کارگزاری اس ادارے کے انجمن ابنائے قدیم سے ظاہر ہوتی ہے، شعبہ اردو، مدراس یونیورسٹی کی ترقی اور بقا کے لیے چند مفید تجاوز پیش فرمائی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے خطاب میں اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر پروین فاطمہ نے انجام دیے۔ انجمن کے خازن ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب صدر شعبہ اردو مظہر العلوم کالج آمبور نے خطبہ استقبالیہ اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اسی اجلاس سے متصل اردو طالبات نے ڈراما 'ہماری زبان اردو' پیش کیا، جس کی ہدایت کاری ڈاکٹر نکہت ناز، صدر شعبہ اردو، کوئن میریس کالج نے انجام دیں۔ ڈرامے کی پیشکش کے بعد ایک شعری نشست کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت ڈاکٹر امان اللہ نے فرمائی جب کہ نظامت کے فرائض شاہد مدراسی نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر رفیق باشاہ حسینی، سابق ڈائرکٹر، دور درشن کیندرا، چنئی نے شرکت فرمائی۔

پریس ریلیز: نسرین بانو، 11 اکتوبر 2024

## دسویں شمیم نکہت فکشن ایوارڈ کے لیے نورالحسنین کے نام کا اعلان

**لکھنؤ:** کیشونگر واقع شعاع فاطمہ گرلس انٹر کالج میں دسویں شمیم نکہت فکشن ایوارڈ کی جیوری کی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں جیوری ممبران پروفیسر عباس رضا نیر لکھنؤ یونیورسٹی، پروفیسر ریشماں پروین، کھن کھن جی پی جی کالج، ڈاکٹر صبیحہ انور، ڈاکٹر عشرت ناہید مانو لکھنؤ کیمپس کے علاوہ عاصم رضا (سابق ایڈیٹر نیا دور)، ڈاکٹر موسیٰ رضا اور یاسمین انجمن شریک رہے۔ شعاع فاطمہ ایجوکیشنل فلاحی ٹرسٹ ہر سال شمیم نکہت فکشن ایوارڈ کا اہتمام کرتا ہے۔ گزشتہ برس یہ ایوارڈ علی گڑھ کے پروفیسر غضنفر کو دیا گیا تھا۔ رواں سال ایوارڈ کے لیے ایکسپرٹ کمیٹی سے مشورے اور رائے طلب کی گئی تھی۔ ان پر غور کرنے کے لیے جیوری کی میٹنگ ہوئی۔ میٹنگ میں تمام آرا پر غور کرنے کے بعد مشہور فکشن نگار نورالحسنین (مہاراشٹر) کو دسواں شمیم نکہت فکشن ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ساتھ ہی چوتھا وقار رضوی صحافت ایوارڈ کے لیے جیوری نے سینئر صحافی پردیپ کپور کے نام کا انتخاب کیا۔ یہ دونوں ایوارڈ 17 نومبر 2 بجے دن کیفی اعظمی اکیڈمی میں منعقد ہونے والے شمیم نکہت فکشن ایوارڈ کے جلسے میں پیش کیے جائیں گے۔ اس جلسے میں شمیم نکہت میموریل خطبہ بھی دیا جائے گا، ساتھ ہی جلسہ میں انٹر/یونیورسٹی سطح پر شمیم نکہت افسانہ کمپٹیشن میں انعامات حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کو انعامات تقسیم کیے جائیں گے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 اکتوبر 2024

**رسم اجرا**

## ادھوری تخلیق

**مالیگاؤں:** 12 اکتوبر 2024 کو اسکس ہال میں عظمت اقبال کے اولین افسانوی مجموعے 'ادھوری تخلیق' کی رسم اجرا کی تقریب کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ تقریب کی مسند صدارت ممبئی شہر سے تشریف لائے اسلم پرویز کو سونپی گئی۔ عامری قیصر پرویز اور عامری ضیغم کمال کے ہاتھوں کتاب کے سرورق کی رونمائی ہوئی۔ ڈاکٹر سعید احمد فارانی کے ہاتھوں اجرا کی رسم ادا ہوئی۔ عمران جمیل نے 'فن اور فنکار' کے موضوع پر

اپنے منفرد انداز میں صاحب کتاب عظمت اقبال کے حالات زندگی، تعلیمی، تدریسی، شخصی اور ادبی سفر کا احاطہ کیا۔ شہر مالیگاؤں کے ادبی حلقے میں نمایاں مقام رکھنے والی شخصیات نے افسانوی مجموعے پر اپنے تاثرات پیش کیے۔ مبصرین کی فہرست میں جناب ڈاکٹر مختار انصاری، طاہر انجم صدیقی، شہروز خاور اور احمد نعیم کا نام شامل تھا۔ تمام ہی تبصرہ نگاران نے مجموعے پر اپنے تاثرات انتہائی جامع، دلچسپ و عام فہم انداز میں پیش کیے۔ ممبئی سے تشریف لائے شاداب رشید، انور مرزا اور وسیم عقیل شاہ نے مجموعے کا تقابلی جائزہ پیش کیا۔ عظمت اقبال نے اس مجموعے کو ادبی سفر کا پہلا پڑاؤ قرار دیا۔ آپ نے کالم نویسی اور افسانہ نویسی کے میدان میں وقفہ سکوت کے بعد مزید تخلیقات کے ساتھ آگے بڑھنے کا عزم کیا۔ رضوان ربانی نے عظمت اقبال کو اپنا تحریر کردہ سپاس نامہ پیش کیا۔ اس سپاس نامے کی اپنے منفرد انداز میں آپ نے بلند خوانی بھی کی۔ رفیق سرور نے عظمت اقبال کی خدمت میں تحریر کردہ اپنا کلام پیش کرکے سامعین سے داد وصول کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں اسلم پرویز صاحب نے فکشن پر سیر حاصل گفتگو فرمائی۔ آپ نے دوران گفتگو اردو ادب میں افسانوں کے ماضی، حال اور مستقبل پر روشنی ڈالی۔ عظمت اقبال کے کلمات تشکر کے بعد اس تقریب کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: عظمت اقبال، 22 اکتوبر 2024

## ادبی سلطنت کا وارث سلطان اختر

**سولاپور:** اردو کے ادیب ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی امریکہ کی سولاپور آمد کے پرمسرت موقع پر 28 اکتوبر سولاپور

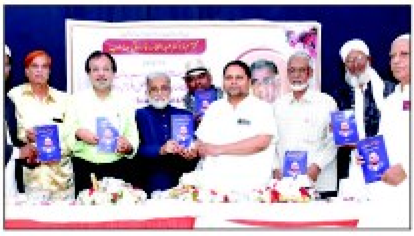

میں بھارتیہ اردو وکاس فاونڈیشن سولاپور کے زیر اہتمام منعقدہ جلسہ استقبالیہ میں ادبی سلطنت کا وارث سلطان اختر مصنف غلام ثاقب بیڑ کی رسم رونمائی بدست ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی عمل میں آئی۔ ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی نے مصنف غلام ثاقب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ غلام ثاقب نے سلطان اختر کی شخصیت پر عرق ریزی سے یہ کتاب لکھی ہے۔ سلطان اختر کو میں ان جواں سال ادیبوں میں شمار کرتا ہوں جن کے یہاں ادب اور زبان کی حرمت کا احساس موجود ہے۔ میں غلام ثاقب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے سلطان اختر کی شخصیت اور ادبی خدمات کے اعتراف میں یہ کتاب تصنیف کی۔ ارشد صدیقی نے تہنیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ سلطان اختر اردو کے بے لوث خادم ہیں۔ سلطان اختر اور ان کی خدمات کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب کارگر ثابت ہوگی۔

پریس ریلیز: سلطان اختر، سولاپور، 31 اکتوبر 2024

## ترجمان اطفال

**بیاول:** ریاست مہاراشٹر کے ضلع جلگاؤں سے رسالہ ترجمان اطفال، ادب اطفال کے معروف قلمکار رحیم رضا

کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ مورخہ 10 اکتوبر جمعرات کی صبح مولانا آزاد لائبریری ہال بیاول میں جلگاؤں کی مایہ ناز تعلیمی شخصیت اور اقرا ایجوکیشن سوسائٹی جلگاؤں کے صدر ڈاکٹر عبدالکریم سالار ساحل کی صدارت میں ترجمان اطفال کے خصوصی شمارے کی تقریب رونمائی عمل میں آئی۔ ترجمان اطفال کے خصوصی شمارے کی رونمائی سید جاوید جناب اور عبدالرؤف کے ہاتھوں کی گئی۔ وہیں شکیل احمد بیاول کی تقریباً 50 سال قبل ہاتھوں سے نقل کی گئی 'فیروز اللغات' کی بھی رونمائی آج کے طلبا کو بتانے اور تحریک دینے کی غرض سے رحیم رضا کے ہاتھوں کی گئی۔ اس تقریب میں عبداللہ، سید بشارت سر، مشتاق کریمی اور رحیم رضا نے طلبا کو مطالعے کی اہمیت اور مسلسل محنت اور لگن سے پڑھنے کی ترغیب دی۔ صدر جلسہ نے خصوصی شمارے کی

اشاعت پر مدیر رحیم رضا اور ادارے کے اراکین کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے بہت اہم کام انجام دیا ہے جس میں ضلع کے تقریباً 17 قلمکاروں کی تخلیقات، مختصر تعارف، تصنیفات کے سرورق کو نہایت عرق ریزی سے یکجا کیا گیا جو مستقبل میں ادب اطفال پر تحقیق کرنے والوں کے لیے اہم ایک دستاویزی شمارہ ہے۔ نظامت کے فرائض نائب مدیر ایس ایم انور نے بحسن وخوبی انجام دیے جناب بشارت نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: رحیم رضا، بیاول، 13 اکتوبر 2024

## تذکرہ اسلاف بارہ بنکی

**بارہ بنکی:** غیاث الدین قدوائی میموریل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد ہنر میلہ کے موقعے پر،

بارہ بنکی کی شخصیات پر مرتب کردہ کتاب 'تذکرۂ اسلافِ بارہ بنکی' کا اجرا 22 اکتوبر کو ٹاؤن ہال، بارہ بنکی میں سابق کابینی وزیر اروند سنگھ گوپ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر گفتگو کرتے ہوئے ہمایوں نعیم خان نے کتاب کی اہمیت اور اس کتاب کو سراہتے ہوئے فرحان بارہ بنکوی کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ بارہ بنکی ہمیشہ سے بزرگوں، صوفیوں، شاعروں اور سماجی وسیاسی شخصیات کا گڑھ رہا ہے۔ یہ کتاب ان کی خدمات اور ان کو جاننے کے لیے ایک ذخیرہ ہے۔ سابق کابینی وزیر اروند سنگھ گوپ نے کتاب کی پسندیدگی اور تحقیقی کام پر خوشی کا اظہار کیا اور ہنر میلہ کے انعقاد کے لیے غیاث الدین قدوائی میموریل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن اور اس کے اراکین کی خدمات کو سراہا۔ کتاب کے اجرا پر ایم ایل اے سریش یادو نے فرحان بارہ بنکوی کو ان کی تصنیف اور تحقیقی کام کے لیے مبارکباد پیش کی۔ اخیر میں پروگرام کی کنوینر ارم غیاث قدوائی نے ہنر میلہ کے انعقاد کے مقاصد و عزائم کا ذکر اور تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' 23 اکتوبر 2024

## 'خندۂ زیرِ لب' اور 'یادوں کے دریچے'

**نئی دہلی:** تسمیہ آڈیٹوریم، اوکھلا نئی دہلی میں سولیٹیر لیٹریچر فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام دو ممتاز ادبی شخصیات کی تصانیف کی رونمائی کی پروقار تقریب منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق نے کی، جبکہ پروفیسر اختر الواسع مہمان خصوصی اور پروفیسر خالد محمود مہمان اعزازی تھے۔ انھوں نے ممتاز مزاح نگار اور نقاد فیاض احمد فیضی کی تازہ تصنیف 'خندۂ زیرِ لب' اور عالمی شہرت یافتہ شاعر پاپولر میرٹھی کی پہلی نثری کاوش 'یادوں کے دریچے' پر اپنے گراں قدر خیالات پیش کیے، دونوں مصنفین کو مبارکباد پیش کی، اور ان کی ادبی شخصیت پر روشنی ڈالی۔ معروف نقاد حقانی القاسمی، صحافی ومزاح نگار اسد رضا اور صحافی معصوم مرادآبادی نے بھی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مصنفین کی تصانیف اور شخصیت کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ سولیٹیر لیٹریچر فاؤنڈیشن کی بانی اور صدر پروین شغف نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے دونوں مصنفین کو سپاس نامہ بھی پیش کیا۔ اس کے بعد تقریب کی نظامت فیاض احمد فیضی نے سنبھالی اور اپنی تصنیف 'خندۂ زیرِ لب' پر شرکا سے اہم نکات پر گفتگو کی۔ پاپولر میرٹھی نے بھی اپنی پہلی نثری کاوش 'یادوں کے دریچے' پر گفتگو کرتے ہوئے شرکا سے اپنے تخلیقی تجربات شیئر کیے۔ انھوں نے اس کتاب کے پس منظر اور اپنے تخلیقی سفر کی داستان کو خوبصورتی سے بیان کیا۔ مزید برآں، انھوں نے اپنے بہترین اشعار بھی پیش کیے، جس سے شرکا محظوظ ہوئے۔ پروگرام کے اختتام پر محترم ڈاکٹر سید فاروق نے صدارتی کلمات پیش کیے۔

قندیل آنلائن ڈاٹ کام، 31 اکتوبر 2024

## سرسید کا قیام میرٹھ

**علی گڑھ:** علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں 'یوم سرسید' کی تقریبات کے دوران سینئر صحافی معصوم مرادآبادی کی تازہ تحقیقی کتاب 'سرسید کا قیام میرٹھ' کا اجرا فلم ساز مظفر علی اور وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ یہ کتاب یونیورسٹی کے ادارے سرسید اکیڈمی نے شائع کی ہے۔ اس موقعے پر سرسید اکیڈمی کے ڈائرکٹر پروفیسر شافع قدوائی بھی موجود تھے جنھوں نے اس کتاب کا مقدمہ لکھا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر راحت ابرار، ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی کی کتابوں کا اجرا بھی ہوا جو بالترتیب سرسید کے مرادآباد اور بنارس کے قیام سے متعلق ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اکتوبر 2024

## کتاب عشق

**لکھیم پور کھیری:** دشہرا کے رام لیلا میلہ کے موقعے پر کل ہند مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں نوجوان شاعر الیاس چشتی کے شعری مجموعہ 'کتاب عشق' کا اجرا ہوا۔ مشاعرے کی صدارت کررہے ظفر علی نقوی نے اپنے صدارتی خطبے میں الیاس چشتی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے بتایا کہ الیاس دور دراز تک ضلع کھیری کا نام شاعری اور صحافت کے ذریعے روشن کررہے ہیں۔ اتنی کم عمر میں دو کتاب منظر عام پر آنا بڑی بات ہے۔ جب کوئی شخص کتاب لکھتا ہے تو ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہوتا ہے۔ مصنف تو اس دنیا سے کوچ کر جاتا ہے لیکن اس کی لکھی ہوئی تحریریں اسے زندہ رکھتی ہیں۔ امید ہے کہ اسی طرح الیاس ادب کی خدمت کرتے رہیں گے۔ آل انڈیا کوی سمیلن کے مشہور ومعروف کوی اشیش انل نے اپنے خطاب میں کہا کہ جب کوئی نوخیز بچہ اس طرح کے قدم سے آگے بڑھتا ہے تو ہمیں اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ ایک دن الیاس چشتی پر ہم سب کو ناز ہوگا۔ سینئر شاعر واصف فاروقی نے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ جب چمنستان ادب پر نظر پڑتی ہے تو کوئی نیا غنچہ پھول بن کر مسکراتا ہوا نظر آتا ہے تو دل کو ایک مخصوص سرشاری کا احساس ہوتا ہے اور نئے رنگ کے تاثرات اپنی خوشبوؤں کے ساتھ ذہن پر مرتب ہوتے ہیں۔ اجرا کے بعد مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی نظامت معروف رائے بریلوی نے کی اور مختلف شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 اکتوبر 2024

## صحرائے جنوں

**نئی دہلی:** جس زبان کی نئی نسل میں زیادہ تخلیق کار سامنے آتے ہیں، اسے ثروت مند مانا جاتا ہے۔ لیکن جب بڑی تعداد میں لوگ لکھتے ہیں تو معیاری اور غیر

معیاری دونوں طرح کی چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ہمارے لیے اطمینان کی بات یہ ہے کہ ہماری نئی نسل کے شاعروں میں ایسے نوجوانوں کی اچھی تعداد ہے جو معیار کو ملحوظ رکھ کر تخلیقی تجربے کر رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف شاعر اور ناقد پروفیسر شہپر رسول نے ہوٹل ریور ویو کے آڈیٹوریم میں ڈاکٹر احمد معراج کے اولین شعری مجموعہ 'صحرائے جنوں' کی رسم اجرا کی تقریب کے دوران اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ کولکاتا سے تعلق رکھنے والے نئی نسل کے معروف شاعر ڈاکٹر احمد معراج کا مجموعہ کلام 'صحرائے جنوں' عرشیہ پبلی کیشنز (نئی دہلی) کے زیرِ اہتمام منظر عام پر آیا اور ڈاکٹر خان رضوان کی کوششوں سے اس تقریب کا انعقاد ہوا۔ انھوں نے مہمانوں اور سامعین کا استقبال کرتے ہوئے ڈاکٹر احمد معراج کی شاعری کے حوالے سے تعارفی کلمات پیش کیے۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر کوثر مظہری (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کہا کہ نئے شعرا کو چاہیے کہ وہ کلاسیکی لفظیات و علامات کی جڑوں کو سمجھیں اور اسے بروئے کار لانے کی کوشش کریں۔ دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابوبکر عباد نے کہا کہ ہم اپنے عہد میں گوناگوں مسائل سے جوجھ رہے ہیں، اس لیے یہ کہنا کہ موضوعات کی کمی ہے، درست نہیں معلوم ہوتا۔ نئے شعرا کو چاہیے کہ ان موضوعات کو نئے ڈکشن اور نئے اسلوب و پیرائے میں پیش کرنے کی اسی طرح کوشش کریں جیسے کہ فیض احمد فیض نے کیا۔ احمد معراج کے یہاں ایسے موضوعات ملتے ہیں لیکن کم ہیں، انھیں چاہیے کہ ہر موضوع کو تخلیقی جامہ پہنائے۔ معروف تخلیقی نقاد حقانی القاسمی نے کہا کہ ڈاکٹر احمد معراج کے ساتھ میرا ایک اہم رشتہ ہے۔ ان کے مجموعے کا نام 'صحرائے جنوں' ہے اور میری باضابطہ پہلی کتاب کا نام 'طواف دشت جنوں' تھا۔ جنوں کے رشتے نے ہم دونوں کو باندھ کر رکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اچھی تخلیق بغیر جنوں کے وجود میں نہیں آسکتی۔ شاعری برگساں، ڈیکارٹ، سارتر اور فرائڈ کے فلسفہ کا نام نہیں ہے بلکہ محسوسات و مشاہدات اور تجربات کا نام ہے۔ شاعری کے جسم پر فلسفہ کی قبا فٹ نہیں بیٹھتی۔ ہمارے یہاں ان پڑھ اور امی شعرا کا لمبا سلسلہ اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر احمد معراج کی شاعری میں تصنع آمیزی نہیں بلکہ فطری جذبات و احساسات کی عکاسی ہمیں نظر آتی ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ذکی طارق، عشرت ظہیر، خورشید حیات، احمد جاوید، ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر زاہد ندیم احسن نے بھی ڈاکٹر احمد معراج کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب حامد علی اختر نے تقریب اجرا کی نظامت کی اور ڈاکٹر مصطفیٰ علی، ڈاکٹر شاہد حبیب، خوشبو پروین، ڈاکٹر نوشاد منظر، ڈاکٹر ریحان، ڈاکٹر سمیع احمد اور شہر کے دیگر معروف صاحبانِ قلم نے اپنی شرکت سے محفل کی رونق بڑھائی۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 17 دسمبر 2024

## منیب الرحمٰن کی ایک صدی

**علی گڑھ:** علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شیدائی، ڈراما نویس، شاعر و مصنف اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ علوم

اسلامیہ کے سابق استاد منیب الرحمٰن کی خدمات، فن اور افکار و خیالات سے متعارف کرانے والی تصنیف 'منیب الرحمٰن کی ایک صدی' حال ہی میں انجمن ترقی اردو، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ منیب الرحمٰن کی پرورش و پرداخت علی گڑھ میں ہوئی اور تقریباً سو سال کی عمر میں انھوں نے نومبر 2022 میں امریکہ میں وفات پائی۔ ان کی زندگی کی تقریباً ایک صدی کا جشن منانے کے لیے بیدار بخت اور انوار احمد نے 340 صفحات پر محیط مذکورہ کتاب مرتب کی ہے، جس میں ڈاکٹر پریم کمار، سابق پروفیسر، ڈی ایس کالج، علی گڑھ کو دیے گئے انٹرویوز اور شمس الرحمٰن فاروقی، وحید اختر، خالد سہیل وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔ انٹرویوز کا اردو ترجمہ پروفیسر سیما صغیر نے کیا ہے۔ ڈاکٹر پریم کمار نے کتاب کی ایک کاپی اے ایم یو وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون کو پیش کی۔ اس موقعے پر شعبہ اردو کے سابق چیئرمین پروفیسر صغیر افراہیم بھی موجود تھے۔ پروفیسر افراہیم نے بتایا کہ منیب الرحمٰن 60 کی دہائی میں امریکہ منتقل ہوگئے مگر علی گڑھ کی محبت میں یہاں بار بار آتے رہے۔ وہ شہریار سے ملنے اکثر و بیشتر مسلم یونیورسٹی آتے رہتے تھے۔ منیب الرحمٰن نے تخلیق و تدوین کے میدان میں بہت فعال زندگی گزاری۔ انھوں نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے لیے 64 مضامین لکھے۔ 'فارسی میں رسائل' اور 'مشاعرے' کے عنوان سے ان کے دو معرکۃ الآرا مضامین مذکورہ کتاب میں شامل ہیں۔ ان کی شاعری اور نظم پر بھی چند مضامین کتاب کی زینت ہیں۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے مذکورہ کتاب کی اشاعت کے لیے انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری اطہر فاروقی کی بھی ستائش کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 اکتوبر 2024

## سندیلہ کے مشاہیر شعرا

**سندیلہ:** انجمن ترقی اردو ہند (شاخ سندیلہ) ضلع ہردوئی کے زیر اہتمام شہر کے شعرا، ادبا اور دانشوران کی موجودگی میں مہمان خصوصی حاجی محمد رئیس احمد انصاری کے ہاتھوں لکھنؤ میں مقیم ادیب، شاعر، مترجم اور ماہر تعلیم الحاج ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی کی کتاب 'سندیلہ کے مشاہیر شعرا' کا 12 اکتوبر کو اجرا خانقاہ ساغریہ، محلّہ منگل بازار میں ہوا۔ اس موقعے پر رئیس انصاری نے کہا کہ ڈاکٹر سعید اردو کے سچے عاشق ہیں اور انھوں نے اپنی کتاب میں سندیلہ کے نامور شعرا پر روشنی ڈال کر کے بہت بڑا کام کیا ہے۔ سعید صاحب سندیلہ کے ایک نمائندہ ادیب ہیں، ان سے اہل سندیلہ کو بڑی امیدیں ہیں۔ سعید صاحب لکھنؤ میں رہتے ہوئے سندیلہ کو نہیں بھولے ہیں یہ بہت بڑی بات ہے۔

متذکرہ تقریب کی صدارت شیخ فریدالدین نے فرمائی۔ تقریب میں ڈاکٹر زبیر صدیقی سندیلوی، سہیل سندیلوی، شمیم سندیلوی، داور رضا نے اپنے کلام سے نوازا۔

پریس ریلیز: خالد سیف اللہ صدیقی، 11 اکتوبر 2024

## بعد از مطالعہ

معروف ادیب ڈاکٹر بدر محمدی کی تازہ تصنیف 'بعد از مطالعہ' (تبصرے) کی تقریب رونمائی گذشتہ 20 اکتوبر 2024 بروز اتوار 'ارباب قلم' پٹنہ کے دفتر میں تنظیم ہذا کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ بزم رونمائی کی صدارت نامور اسکالر پروفیسر عبدالواحد انصاری نے فرمائی۔ جناب صدر نے اپنے خطاب میں کہا کہ متن

اورلفظ میں معنی پوشیدہ ہوتے ہیں اوراس معنی کوکھولنے کا کام ناقد بھی کرتا ہے اورمبصر بھی۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ ڈاکٹر بدر محمدی کی کتاب 'بعد از مطالعہ' وسیع مطالعہ پر مبنی ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹرنعمان قیصر نے کہا کہ 'بعد از مطالعہ' کا مبصر کسی بڑی شخصیت سے مرعوب نظرنہیں آتا۔ بلکہ اس نے یکساں طور پرادنیٰ اور اعلیٰ ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر نگاہ ڈالی ہے۔ مہمان اعزازی انوارالحسن وسطوی نے اس جانب توجہ دلائی کہ مبصر نے معروف ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ کم معروف اور غیر معروف ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنے تبصرے میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹرمحسن رضارضوی نے تبصرہ نگاری کے مثبت اور منفی رویے کا ذکر کرتے ہوئے بدر محمدی کے تبصروں کومتوازن قرار دیا۔ نامدار ادیب اورصدر'ارباب قلم' ڈاکٹرعطا عابدی نے کہا کہ بدر محمدی کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے نہ صرف کتابیں پڑھیں بلکہ ان پر تفصیل سے لکھا بھی ہے۔ ڈاکٹر اے کے علوی نے اپنے خطاب میں ڈاکٹر بدر محمدی کی کتاب کی پذیرائی کی اور مبارکباد دی۔ خوش فکر شاعراشفاق عادل نے اپنے مقالے میں جہاں کتاب کے محاسن کا ذکر کیا وہیں کتاب میں کمیوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ ڈاکٹر اویناش امن کے مختصر مقالے میں اعتراف کیا گیا کہ کتاب 'بعد از مطالعہ' ظاہر کرتی ہے کہ بدر محمدی نہ صرف ایک حساس قلم کار ہیں بلکہ خوش اخلاق کے ساتھ اپنے علمی اور ادبی فریضے کو زیر نظر رکھتے ہیں اور اس کی تکمیل کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ صحافی اور شاعرشاء اللہ ثنا دوگھروی نے اپنی تحریر میں اس خیال کا اظہار کیا کہ بدرمحمدی نے اپنے تبصروں میں کسی کی دل آزاری نہیں کی ہے بلکہ حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ عارف حسن وسطوی کے مضمون میں بدرمحمدی کی کتاب کوایک جامع تصنیف قرار دیا گیا کہ موصوف نے کتابوں اور مصنفین کا صرف تعارف پیش نہیں کیا ہے بلکہ تبصرہ جسے تنقید کانقش اوّل کہا جاتا ہے اس کے لوازمات بھی ان کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جواں سال شاعرمظہر وسطوی نے اپنے چند تازہ قطعات بدرمحمدی کی نذر کیے۔ صاحب کتاب ڈاکٹر بدر محمدی نے شرکائے مذاکرہ کی آرا کوخوش دلی سے قبول کیا اورکہا کہ تحسین اورتنقید کی جو باتیں بھی اس کتاب کے حوالے سے سامنے آئی ہیں۔ میں ان کا استقبال کرتا ہوں۔ اجرا کی نظامت کے فرائض 'ارباب قلم' کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر توقیر عالم توقیر نے بہ حسن وخوبی انجام دیے۔

پریس ریلیز: جنرل سکریٹری، ارباب قلم، پٹنہ 27 اکتوبر 2024

## میری زمین کا چاند

**نئی دہلی:** انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیراہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی میں ونود کمار ترپاٹھی بشر کے شعری مجموعہ 'میری زمین کا چاند' کی رسم اجرا علمی وادبی شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ واضح رہے کہ معروف شاعر اور سابق آئی آر ایس ونود کمار ترپاٹھی بشر کے شعری مجموعے کا یہ چوتھا ایڈیشن منظرعام پر آیا ہے۔ اس پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر احمد محفوظ، معروف شاعر چندر بھان خیال اور انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے صاحب کتاب ونود کمار ترپاٹھی بشر کو ان کے شعری مجموعے کے چوتھے ایڈیشن کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ونود کمار ترپاٹھی بشر ہمیشہ ادبی خدمات کوانجام دینے میں پیش پیش رہتے ہیں اور یہ ان کی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے کہ انجمن نے ان کے کلام کا یہ چوتھا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ چندر بھان خیال نے کہا کہ ونود کمار ترپاٹھی بشر کا یہ شعری مجموعہ ان کے پہلے کے تین مجموعوں کی طرح ہی نہ صرف ادبی ذوق میں اضافہ کرے گا بلکہ اسے خوب شہرت ملے گی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر احمد محفوظ نے شعری مجموعے پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ونود کمار ترپاٹھی بشر نے مجھے اپنی کتاب کو پہلے پڑھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ونود کمار ترپاٹھی بشر کا ہر مجموعہ ان کی انتھک محنت اورادب سے شغف کا ایک بہترین ثمرہ ہے۔ اس موقعے پر ونود کمار ترپاٹھی بشر نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انجمن ترقی اردو ہند جس طریقے سے ہمارے مجموعوں کوشائع کرکے ادبی حلقوں تک پہنچانے کا کام کرتی ہے یقیناً ہمارے لیے بہت خوشگوار بات ہے۔ تقریب کی نظامت شاعر انس فیضی نے انجام دی۔ اس کے علاوہ معروف گلوکار پرن کمار بھاٹیا نے ونود کمار ترپاٹھی بشر کا کلام پیش کرکے اپنی دلکش آواز سے لوگوں کو مسحور کیا۔ اس تقریب میں بڑی تعداد میں ادبی حلقوں سے وابستہ اہم شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 نومبر 2024

وفیات

## سید مختار علی مختار ٹونکی

**ٹونک:** انجمن محبانِ اردو ٹونک کے سرپرست اور اردو کے معروف شاعر، مزاح نگار، محقق، نقاد جناب مختار ٹونکی

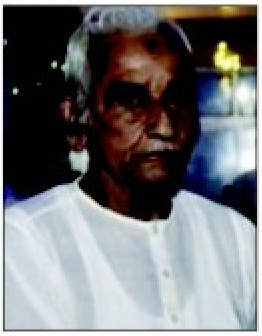

کا انتقال پرملال 86 سال کی عمر میں 20 اکتوبر 2024 کوٹونک میں ہوا۔ موصوف کی تیس سے زائد کتب اور شعری مجموعے شائع ہوکر منظرعام پر آچکے ہیں۔ جن موضوعات پر آپ نے کتب تصنیف کی ہیں ان میں طنز ومزاح پر آپ کے تحریرکردہ مضامین کے چھ مجموعے اور تقریباً اتنے ہی شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ بقیہ کتب مختلف ادبی موضوعات، شخصی مضامین، تنقید وتحقیق اور افسانوی ادب پر مشتمل ہیں۔

مختار صاحب کی شخصیت اور علمی وادبی خدمات پر حسب ترتیب کوٹہ یونیورسٹی اور راجستھان یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی اور ایم فل کی ڈگریاں بھی تفویض کی جاچکی ہیں۔ موصوف کو راجستھان، یوپی، بہار اور مغربی بنگال کی اردو اکادمیوں کے ایوارڈز سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ رواں سال میں آپ کی دو کتب 'نقوشِ ٹونک' اور 'منتخب غزلیات کا مجموعہ' (مرتبہ سید ساجد علی ٹونکی) شائع ہوکر منظرعام پر آچکی ہیں۔

مختار ٹونکی کے اردو اور ہندی میں تحریر کردہ سیکڑوں کی تعداد میں مضامین او رتبصرے ملک کے معروف اخبار ورسائل میں شائع ہوکر منظرعام پر آچکے ہیں۔ دیوناگری رسم الخط میں آپ کی ایک کتاب زیراشاعت ہے، جس میں آپ کے مطبوعہ ہندی مضامین اور کویتائیں شامل کی گئی ہیں۔ مختار صاحب کی اور بھی کئی کتب ابھی غیر مطبوعہ ہیں ان میں سے ایک آپ کی نظموں کا مجموعہ بھی شامل ہے۔

پریس ریلیز: سید ساجد علی ٹونکی، ٹونک، 2 نومبر 2024

## احسن رضوی

**لکھنؤ:** زرعی سائنسداں اور ممتاز شاعر پروفیسر احسن رضوی کا انتقال گروگرام میں ہوا۔ ان کی عمر تقریباً 85 برس تھی۔ وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ گروگرام میں مقیم تھے۔ وہیں انھوں نے آخری سانس لی۔ ان کی تدفین بعد نماز عصر نشاط گنج قبرستان میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں دو بیٹے ہیں۔ ان کی اہلیہ کرامت کالج کی پرنسپل رہی ہیں، ان کا کچھ برس قبل انتقال ہو چکا ہے۔ پروفیسر احسن رضوی خیرآبادی کا اصل نام ڈاکٹر سید محمد احسن رضوی ہے۔ ادبی دنیا میں انھیں احسن رضوی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کی ولادت 5 جولائی 1940 کو ہوئی، والد کا نام محسن خیرآبادی تھا جو خود بھی ایک شاعر تھے۔ احسن رضوی نے انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم خیرآباد میں حاصل کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اکتوبر 2024

## فہمی بدایونی

**بدایوں:** عہد حاضر کے منفرد اور کہنہ مشق بزرگ شاعر فہمی بدایونی کا 20 اکتوبر کو انتقال ہوگیا۔ فہمی بدایونی گزشتہ تقریباً دو تین ماہ سے صاحب فراش تھے۔ 20 اکتوبر بروز اتوار کی شام پانچ بجے انھوں نے 72 سال کی عمر میں بسولی میں اپنے گھر پر ہی آخری سانس لی۔ پسماندگان میں اہلیہ، دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ وہ مردم خیز خطہ بدایوں کے ان چنندہ شاعروں میں سے تھے، جنھوں نے عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کی۔ اپنی شاعری اور اپنے خاص انداز کے ذریعے مداحوں کے دلوں پر راج کرنے والے شاعر فہمی بدایونی کا انتقال نہ صرف بدایوں بلکہ اردو دنیا کے لیے بڑا خسارہ ہے۔

فہمی بدایونی کا اصل نام زماں شیر خان عرف پتن خان ہے۔ ان کی پیدائش 4 جنوری 1952 کو بدایوں ضلع کے قصبہ بسولی میں ہوئی تھی۔ شعر و ادب کی دنیا میں وہ 'فہمی بدایونی' کے نام سے مشہور تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد زندگی کی ضرورتوں کے سبب کم عمری میں ہی لیکھ پال کی ملازمت شروع کردی۔ کچھ عرصے بعد جب یہ ملازمت نہ رہی تو ریاضی اور سائنس کی کوچنگ کرنے لگے۔ فہمی بدایونی کی شاعری میں جدیدیت، سنجیدہ فکر و خیال اور نئے نئے زاویے نظر آتے ہیں۔

فہمی بدایونی نے جو بھی خیال شاعری کے حوالے سے پیش کیے وہ سچے نظر آتے ہیں۔ عمر کے آخری پڑاؤ تک سوشل میڈیا پر بھی سرگرم رہے اور سب سے زیادہ پسند کیے جانے والے شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کے تین مجموعے پانچویں سمت، دستکیں نگاہوں کی اور ہجر کی دوسری دوا منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ دیوناگری رسم الخط میں 'ہجر کی دوسری دوا' ریختہ کی جانب سے شائع کیا گیا تھا۔ صاحب فراش ہونے سے پہلے تک فہمی بدایونی کثرت کے ساتھ نشستوں اور مشاعروں میں اپنا کلام پڑھتے رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 اکتوبر 2024

## جمیل مرصع پوری

**ممبئی:** ممبئی کے مضافاتی مسلم اکثریتی علاقہ ممبرا میں مقیم ملک کے نامور اور بزرگ شاعر اور صحافی ندیم صدیقی کے والد جمیل مرصع پوری خالق حقیقی سے جاملے۔ ان کی تدفین امرت نگر قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کا انتقال طویل علالت کے بعد 94 سال کی عمر میں ہوا۔ اطلاع کے مطابق جمیل مرصع پوری 15 جولائی 1931 کو پرتاپ گڑھ کے ایک گاؤں مرصع پور میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ مرصع پور سے حاصل کی۔ جمیل مرصع پوری نے شاعری کی دنیا میں منفرد مقام حاصل کیا اور ممبئی کی ادبی محفلوں میں ایک معتبر شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ 'بے نام سی خوشبو' شائع ہو چکا ہے۔ جمیل مرصع پوری اپنی خوش مزاجی اور دلکش شخصیت کے لیے جانے جاتے تھے۔ ممبئی کے ادبی حلقوں میں ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا اور وہ مختلف مشاعروں اور ادبی محفلوں کے انعقاد میں سرگرم رہتے۔ جمیل مرصع پوری کا ماننا تھا کہ اردو کی ترقی کے لیے کام کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے اور انھوں نے اپنی آخری عمر تک اس مشن کو جاری رکھا۔ ان کے شاگردوں اور عزیزوں میں ندیم صدیقی، ان کے بیٹے شامل ہیں جو خود ایک معروف شاعر اور روزنامہ انقلاب و روزنامہ ممبئی اردو نیوز سے وابستہ رہے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 نومبر 2024

## ضیا فاروقی

**ممبئی:** یہاں پہنچنے والی اطلاع کے مطابق مشہور شاعر ضیا فاروقی 12 نومبر 2024 کو منگل کی صبح 10:30 بجے اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ فاروقی کم و بیش ایک درجن کتابوں کے مصنف تھے۔ انھیں کئی پروقار ایوارڈ اور اعزازات حاصل ہو چکے تھے۔ انھیں شاعری کے علاوہ نثر پر بھی مہارت حاصل تھی۔ بھوپال کے مشہور شاعر و صحافی اور ای ٹی وی سے وابستہ رہے مہتاب عالم نے انقلاب کو بتایا کہ ضیا صاحب کے والد کا نام چودھری عالم رضا ہے جن کا سلسلۂ نسب قاضی مبارک سے جاملتا ہے جن کا مزار درگاہ نظام الدین میں مرجع خلائق ہے۔

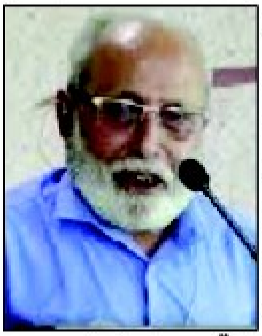

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 نومبر 2024

## مولانا ندیم الواجدی

**دیوبند:** معروف عالم دین مولانا ندیم الواجدی (مالک دارالکتاب دیوبند) کا طویل علالت کے بعد تقریباً 70 سال کی عمر میں امریکہ میں انتقال ہوگیا۔ امریکہ کے شکاگو میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم مولانا واجدی پچھلے کچھ ایام سے امریکہ میں مقیم تھے، جہاں شکاگو میں ان کی اوپن ہارٹ سرجری ہوئی تھی، جس کے بعد سے مولانا کی طبیعت میں بہتری نہیں آئی اور

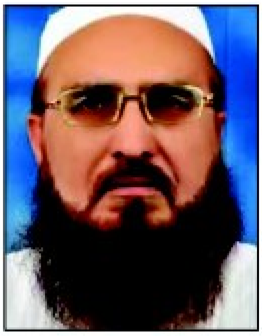

اسی دوران 14 اکتوبر کی شب تقریباً نو بجے کے قریب مولانا واجدی دنیا کو الوداع کہہ کر رب حقیقی سے جا ملے۔ مولانا ندیم والواجدی درجنوں کتابوں کے مصنف تھے۔ دارالکتاب دیوبند بھی مولانا کے علمی ذوق کا ایک نمونہ ہے۔ مولانا ندیم الواجدی 23 جولائی 1954 کو دیوبند، ضلع سہارنپور، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام واصف حسین تھا۔ مولانا ندیم الواجدی نے ابتدائی تعلیم دیوبند میں حاصل کی اور قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، جہاں سے 1974 میں فراغت حاصل کی۔ مولانا ندیم الواجدی نے علمی میدان میں بہت سی خدمات انجام دیں۔ وہ ایک محقق، مصنف اور مدرس تھے اور دارالعلوم دیوبند کے شعبہ تصنیف و تالیف کے نگراں بھی رہے۔ انھوں نے عربی اور اردو کی متعدد کتب تحریر و ترجمہ اور شائع کیں، جن میں امام غزالی کی 'احیاء العلوم' کا اردو ترجمہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ 1980 میں انھوں نے دیوبند میں 'دارالکتاب' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا، جس کے تحت بہت سی کتابیں شائع ہوئیں اور علمی دنیا میں مقبولیت حاصل کی۔ 2001 میں مولانا ندیم الواجدی نے دیوبند میں معہد عائشہ الصدیقہ للبنات کے نام سے پہلا رہائشی مدرسہ برائے خواتین قائم کیا، جو آج بھی کامیابی سے چل رہا ہے۔ مولانا ندیم الواجدی ماہنامہ 'ترجمان دیوبند' کے مدیر تھے اور ان کے علمی و دینی موضوعات پر مضامین مختلف اخبارات و رسائل، خصوصاً روزنامہ انقلاب اور ممبئی اردو نیوز وغیرہ میں تواتر سے شائع ہوتے رہے۔ مولانا کے انتقال پر معزز شخصیات نے خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اکتوبر 2024

## Subscription Form "Urdu Duniya"

## سالانہ خریداری فارم

### میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....................................................

....................................................

پتہ : ....................................................

....................................................

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

## کشاف اصطلاحات ادبیات (جلد اول)

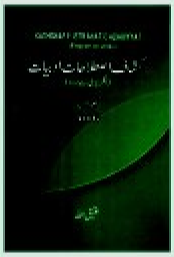

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 627+26

قیمت: 340 روپے

## کشاف اصطلاحات ادبیات (دوم)

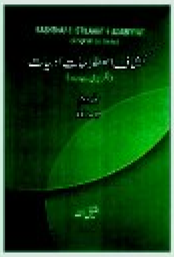

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 644+23

قیمت: 340 روپے

## کشاف اصطلاحات ادبیات (سوم)

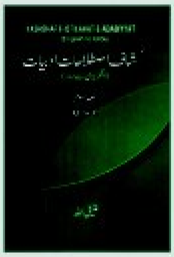

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 355+21

قیمت: 235 روپے

## باقیات شکیل الرحمٰن (جلد اوّل تا پنجم)

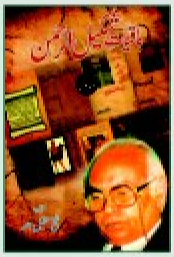

مرتب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: تقریباً 3400

قیمت: 2190 روپے (مکمل سیٹ)

## نوم چامسکی

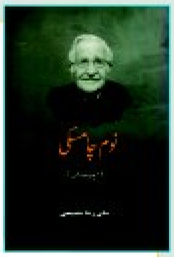

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

## حالی کی غزلیں اور قطعات

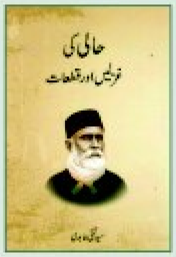

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 185+66

قیمت: 150 روپے

## حالی کا سیاسی شعور

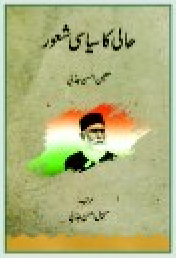

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

## قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

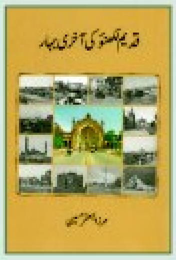

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, दिसम्बर-२०२४,वर्ष:२६, अंक:१२
**URDU DUNIYA Monthly, December-2024, Vol.26, Issue:12**
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/11/2024
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

## اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

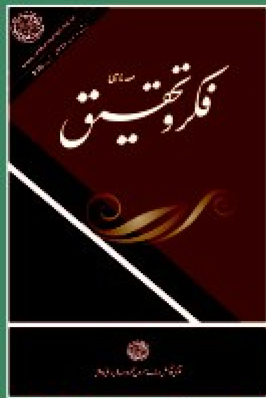

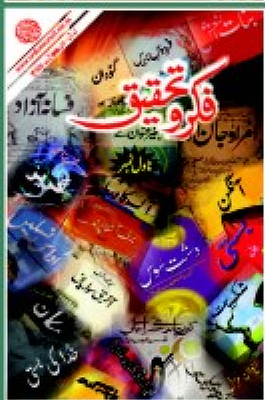

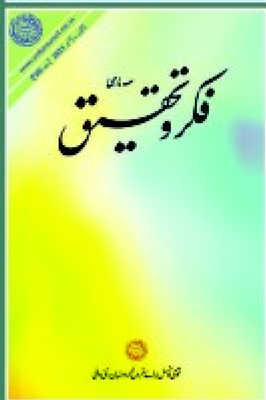

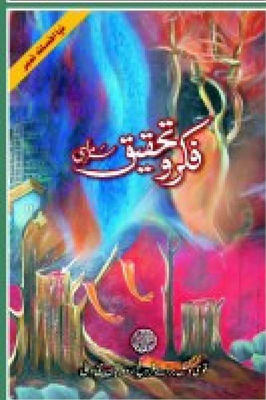


### قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6